میکسم گورکی

Maxim Gorki

میرا بچپن

Childhood

1

چھوٹے سے نیم تاریک کمرے کی کھڑکی کے نیچے فرش پر میرے ابا سیدھے سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ان کا جسم سفید لباس میں ڈھکا ہوا تھا اور بہت لمبا لگ رہا تھا۔ ننگے پاؤں کی انگلیاں عجیب طرح سے پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے شفیق ہاتھوں کی انگلیاں بھی، جو سینے پر آڑی رکھی ہوئی تھیں، ٹیڑھی میڑھی نظر آ رہی تھیں۔ان کی آنکھیں جن میں ہمیشہ ہنسی ناچتی رہتی تھی تانبے کے گہرے رنگ کے سکوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔شفیق چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور بیٹھی ہوئی بتیسی کی چمک سے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

میری ماں صرف سرخ رنگ کا لہنگا پہنے ان کے پاس سر نہوڑائے دوزانو بیٹھی تھیں۔ان کے ہاتھ میں وہ سیاہ کنگھی تھی جس سے میں کبھی کبھی آری کی طرح تربوز کاٹا کرتا تھا۔کنگھی سے وہ بار بار میرے ابا کے نرم بالوں کے پیچھے کی طرف سنوارتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں، مدھم لہجے سے کچھ بین کرتی جاتی تھیں۔ان کی سرمئی نیلی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں اور لگتا تھا جیسے آنسوؤں میں گھل گھل کر بہہ جائیں گی۔

میری نانی میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھیں۔ میری نانی گدبدے جسم کی عورت تھیں، بڑا سا سر، کٹورا سی آنکھیں اور کچھ عجیب پکوڑا سی ناک۔ ان کا رنگ سنولایا ہوا تھا مگر نرم و نازک اور بے حد دلکش۔ وہ بھی رو رہی تھیں اور کچھ انداز سے بین کرنے میں میری ماں کا ساتھ دے رہی تھیں جیسے ان سے سر ملا رہی ہوں۔ ان کا سارا جسم ہچکیوں سے ہل رہا تھا۔ وہ بار بار مجھے ابا کی طرف دھکیلتی تھیں لیکن میں جھجک کر پیچھے کو ہٹ جاتا تھا اور ان کے لہنگے کے گھیر میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے بہت گھبراہٹ اور خوف محسوس ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے میں نے کبھی بڑوں کو روتے نہیں دیکھا تھا اور اپنی نانی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

''جاؤ بیٹا، جاؤ'' وہ آہستہ آہستہ کہتی جا رہی تھیں۔ ''اپنے ابا سے رخصت ہو لو۔ اب وہ تمہیں کبھی نہیں ملیں گے۔ کبھی نہیں۔ وہ چل بسے میرے بچے۔ چل بسے! ہائے ابھی کیا ان کے مرنے کے دن تھے! اس کا وقت تھوڑا ہی آیا تھا!!''

میں حال ہی میں ایک سخت بیماری سے اٹھا تھا جس کے دوران میں میرے والد اکثر میرے پاس بیٹھے رہتے تھے اور ہم دونوں مزے میں کھیلا کرتے تھے۔ یہ بات میرے ذہن پر اچھی طرح نقش ہے۔ لیکن یکا یک ابا غائب ہو گئے اور ان کی جگہ میری نانی نے لے لی، جو میرے لئے بالکل اجنبی تھیں۔

''نانی کہاں سے آئیں؟ بہت دور سے نا؟ آپ تو چلتے چلتے تھک گئی ہوں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے نہیں، بدھو۔ پانی پر بھی کوئی چلتا ہے؟ اسٹیمر سے آئی ہوں! نیژنی ☆ سے اوپر آنا تھا نا!''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اوپر؟ اوپر تو ہمارے گھر میں کچھ اور لوگ رہتے تھے۔ کچھ ایرانی لوگ جن کی داڑھیاں رنگی ہوئی تھیں اور نیچے تہہ خانے میں ایک زرد رنگ کا بڈھا کالمیک رہتا تھا جو بھیڑ کی کھالیں بیچتا تھا۔ ویسے جو زینہ تھا اس کے کٹہرے ریلنگ پر سے پھسل کر بھی نیچے اتر سکتے تھے۔

☆نیژنی نوگورود۔ ایک شہر جس کا نام اب گورکی ہے۔ روسی زبان میں ''نیژنی'' کے معنی نیچے ہیں۔ (ایڈیٹر)

قلابازی کھاتے ہوئے بھی اترا جا سکتا تھا۔ لیکن اس میں پانی کا کیا سوال تھا؟ ضرور وہ کچھ گڑبڑا رہی تھیں!

''مجھے بدھو کیوں کہتی ہو نانی؟''

''کیونکہ تم اتنے برے دھانگڑ ہو گئے ہو اور کھوپڑی میں عقل ذرا نہیں'' وہ ہنس پڑیں۔

میرنی نانی کے بات کرنے کے انداز میں شفقت تھی، ذہانت تھی اور جب وہ الفاظ کو کھینچ کر بولتی تھیں تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ پہلے ہی دن سے میری ان کی گاڑھی چھننے لگی۔ اور اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ہم دونوں اس کمرے سے باہر نکل جائیں۔

اپنی ماں کو دیکھ دیکھ کر میرا جی گھبرا رہا تھا۔ ان کے آنسوؤں اور بین نے میرے دل میں ایک نئی آگ لگا دی، ایک نئی کسک پیدا کر دی۔ اس سے پہلے میں نے ان کی یہ کیفیت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ویسے ہمیشہ رکھ رکھاؤ کی عورت تھیں، ادھر ادھر کی گپا سٹک کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ ہمیشہ صاف ستھری رہتیں، ان کا بھاری گٹھا ہوا جسم گھوڑی کی طرح سڈول اور پھرتیلا تھا، ان کے ہاتھ بہت بڑے برے اور غضب کے مضبوط تھے۔ لیکن اس وقت ان کا پورا وجود جگہ جگہ سے چٹخا ہوا معلوم ہوتا تھا، آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، کپڑے تار تار تھے اور گھنے بال جو ہمیشہ کھنچے ہوئے، سنہرے گول جورے کی شکل میں گردن کے پیچھے اکٹھے رہتے تھے، اس وقت ان کے ننگے کندھوں اور آنکھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک لمبی لٹ میرے باپ کے مردہ چہرے پر پڑی ہوئی تھی۔ میں دیر سے کمرے میں کھڑا تھا لیکن وہ میرے باپ کے بالوں کے سنوارنے اور رونے پیٹنے میں اتنی کھوئی ہوئی تھیں۔ کہ انہوں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔

پہرے کے سپاہی اور چند کسانوں نے جھانک کر دیکھا جن کے چہرے دھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

''ارے جلدی کرو نا۔ جلدی باہر نکالو'' سپاہی نے کچھ بگڑ کے کہا۔

کھڑکی پر ایک سیاہ شال ڈال دی گئی تھی جو اندر آتی ہوئی ہوا سے بادبان کی طرح پھول کر اڑ رہی تھی۔ ایک بار میں نے اپنے ابا کے ساتھ ایک بادبانی کشتی میں سفر کیا تھا۔ ایک دم سے بجلی بڑے زور سے کڑکی تھی۔ میرے باپ نے ہنس کر مجھے اپنے زانوؤں میں دبا لیا تھا اور چلائے:

''ڈرو نہیں بیٹا! ڈر کی کیا بات ہے!''

یکا یک میری ماں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں، پھر ایک دم اسی جگہ سلسلا کے بیٹھ گئیں۔ ان کے لمبے لمبے بال زمین پر جھاڑو دے رہے تھے، چہرے پر مردنی چھا گئی تھی، آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور ابا کی

طرح ان کی بھی بتیسی بیٹھنے لگی۔

''دروازہ بند کرو...'' انہوں نے ڈراؤنی آواز میں کہا۔ ''الیکسئی کو باہر لے جاؤ۔''

میری نانی نے مجھے باہر دھکیلا اور دروازہ بند کرنے دوڑیں۔

''ارے بھلے لوگو، ڈرو نہیں!'' وہ چیخنے لگیں۔ ''اس کو ہاتھ مت لگاؤ! باہر جاؤ، تمہیں یسوع مسیح کا واسطہ! یہ ہیضہ نہیں ہے، یہ تو درد ہے، درد! ترس کھاؤ لوگ۔ ہٹ جاؤ!''

میں ایک اندھیرے کونے میں صندوق کے پیچھے چھپ گیا اور وہیں سے ماں کو زمین پر لوٹتے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے دانت کچکچا کر فرش پر تڑپ رہی تھیں اور آہیں بھر بھر کر کراہ رہی تھیں۔ میری نانی ادھر ادھر کھسکتی خوشی اور نرمی سے بڑبڑاتی ہوئی ان کو بار بار کہتی جا رہی تھیں:

''یسوع مسیح کے لئے، وریوشا☆ ذرا تو درد کماؤ! ذرا صبر سے کام لو، تمہیں خدا اور اس کے بیٹے کا واسطہ! ذرا پاک مریم کو یاد کرو نا جو بڑی رحیم ہے، بڑی...''

میرا خوف کے مارے برا حال تھا۔ اور وہ دونوں اسی طرح میرے ابا کے پاس فرش پر ادھر ادھر ڈھلکتی پھر رہی تھیں، کراہتی آہیں

☆ روسی میں قاعدہ یہ ہے کہ محبت اور قربت کے اظہار کے لئے نام کا آخری ٹکڑا بدل دیا جاتا ہے، مثلاً میخائل میشا بن جاتا ہے، وروارا۔ واریا، وریوشا، الیکسئی۔ الیوشا۔ (ایڈیٹر)

بھرتی وہ کبھی کبھی بالکل ان سے لپٹ جاتیں۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش لیٹے تھے، بے حس و حرکت، جیسے ان دونوں کی ان حرکتوں پر چپکے چپکے ہنس رہے ہوں! وہ فرش پر دیر تک تڑپتی رہیں۔ میری ماں نے کئی بار کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن پھر گر پڑیں! میری نانی سیاہ گیند کی طرح اپنے کالے لباس میں لپٹی سٹاسٹ کبھی اندر آتیں کبھی باہر جاتیں۔ پھر یکا یک اندھیرے میں سے ایک ننھے بچے کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔

''یا خدا، تیرا شکر ہے'' میری نانی نے اطمینان کی سانس لی۔ ''بیٹا ہوا!''

پھر انہوں نے شمع روشن کی۔

میں غالباً سو گیا ہوں گا کیونکہ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔

اس واقعہ کے بعد میری دوسری گہری یاد یہ ہے کہ پانی برس رہا تھا اور ہم لوگ قبرستان کے ایک اجاڑ

کونے میں تھا۔ لوگ میرے ابا کے تابوت کو ایک گہرے گڑھے میں اتار رہے تھے جو غار کی طرح منہ پھاڑے ہوئے تھا اور اس گڑھے کے کنارے مٹی اکٹھی ہونے سے جو ٹیلہ بن گیا تھا میں اس پر کھڑا تھا اور غار کے اندر جھانک رہا تھا۔ گڑھے میں پانی تھا اور پانی میں مینڈک تیر رہے تھے۔ دو مینڈک اچھل کر اس تابوت کے بادامی ڈھکنے پر بیٹھ گئے جس میں میرے ابا کی لاش تھی۔

اس وقت قبر کے آس پاس گنتی کے لوگ تھے۔ ایک قبرستان کا چوکیدار جس کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا، دو گورکن، جو منہ بنائے اور ہاتھوں میں بیلچے اٹھائے کھڑے تھے، نانی اور میں۔ ہم سب ہی گرم بارش کی پھواروں سے بھیگ رہے تھے۔

قبرستان کا چوکیدار بولا:

''چلو، مٹی ڈالو۔''

میری نانی اپنی شال کا سرا آنکھوں پر رکھ کر زار و قطار رونے لگیں۔ گورکن جھکے اور بیلچے بھر بھر کر جلدی جلدی مٹی قبر میں ڈالنے لگے۔ پانی میں مٹی سے چھپا چھپ ہونے لگی اور دونوں مینڈک گھبرا گھبرا کر قبر کی دیواروں پر اچھلنے لگے لیکن گرتی ہوئی مٹی کے جھونکے میں وہ بھی نیچے دب گئے اور ان کے اوپر اور مٹی پڑتی چلی گئی۔

'الیوشا، ادھر آجاؤ بیٹا'' نانی نے میرے کندھے پکڑ کر مجھ کو کھینچا۔ لیکن میں نکل گیا، میرا وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

''اے پروردگار!'' انہوں نے ایک آہ بھری۔ اس آہ سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ مجھ سے شکوہ تھا یا پروردگار سے۔ پھر وہ بڑی دیر تک سر جھکائے ساکت کھڑی رہیں، یہاں تک کہ جب قبر مونہا منہ بھر گئی تب بھی وہ وہیں کھڑی رہیں۔

گورکنوں نے الٹے بیلچوں سے قبر کو پیٹ پاٹ کے برابر کر دیا۔ پھر یکا یک ہوا بڑی تیزی سے چلنے لگی اور بارش کی پھوار اپنے ساتھ اڑا لے گئی۔ نانی نے میرا ہاتھ پکڑا اور دور ایک گرجے کی طرف لے چلیں جو سیاہ صلیبوں کے جنگل میں گھرا کھڑا تھا۔ جب ہم قبرستان سے باہر نکل آئے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا:

''تو روتے کیوں نہیں؟ تمہیں رونا چاہئے۔''

''جی نہیں چاہتا۔''

''اچھا، اگر جی نہیں چاہتا تو جانے دو، نہ روؤ'' وہ دھیمے سے بولیں۔

مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا تھا کہ انہوں نے مجھ سے رونے کو کہا کیونکہ میں شائد ہی کبھی روتا تھا۔ جب میرے دل پر کوئی چوٹ لگتی تھی تب ہی میں روتا تھا ورنہ جسمانی تکلیف پر کبھی نہیں۔ میرے ابا تو میرے رونے پر اکثر ہنس پڑتے تھے لیکن اماں بڑے زور سے خفا ہوتی تھیں:

''خبردار جو رویا!''

پھر ہم دونوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھے اور ایک چوڑی سی کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک سے گذرے جس کے دونوں طرف سرخ سرخ عمارتیں تھیں۔

''نانی اماں! وہ مینڈک اب کیسے نکلیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب وہ بیچارے کیا نکلیں گے۔ اب خدا ہی حافظ ہے ان کا'' نانی نے جواب دیا۔

میرے ابا اور میری اماں کبھی خدا کا نام اس قدر دھڑ ہے سے نہیں لیا کرتے تھے اور نہ اتنے اپنے پن سے۔

چند دن بعد میری ماں، نانی اور میں اسٹیمر کے ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھے تھے۔ میرا ننھا بھائی میکسم مر چکا تھا اور ایک سفید کپڑے میں بنڈل کی طرح لپٹا لپٹایا اور سرخ فیتے سے بندھا جھنڈا، کونے میں رکھی ہوئی میز پر پڑا تھا۔

میں صندوقوں اور گٹھریوں پر چڑھا بیٹھا تھا اور باہر نکلی ہوئی چھوٹی سی گول کھڑکی میں سے سیر کر رہا تھا۔ یہ کھڑکی مجھے بالکل گھوڑے کی پھولی ہوئی آنکھ کی طرح لگتی تھی۔ جھاگ سے بھرے ہوئے گدلے پانی کا ریلا بار بار آ کر شیشے میں لگتا۔ کبھی کبھی تو اس زور سے لگتا کہ شیشہ بالکل ڈھک جاتا اور میں بوکھلا کر نیچے کود جاتا۔

''اے ڈرمت'' میری نانی کہتیں اور مجھے اپنے نرم بازوؤں میں اٹھا کر پھر گٹھریوں پر بٹھا دیتی تھیں۔

پانی کی سطح پر دور تک نمناک سرمئی دھند چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار، دور، زمین کی ایک تاریک سی لکیر کہر میں سے ابھرتی اور پھر کہر میں جاتی۔ ہمارے چاروں طرف ہر چیز ہل رہی تھی۔ صرف میری ماں

ساکت اور خاموش تھیں۔ وہ ضبط اور تحمل کے ساتھ دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی تھیں، دونوں ہاتھوں کو ملا کر سر کے پیچھے رکھے، آنکھیں بھینچ کے بند کئے۔ ان کا چہرہ سنولا گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ان میں نہ جان باقی ہے نہ احساس۔ ایک لفظ ان کے منہ سے نہیں نکلتا تھا جیسا یکا یک ان کی کایا پٹ ہوگئی ہو۔ وہ کچھ سے کچھ ہوگئی ہوں، یہاں تک کہ جو لباس وہ پہنے تھیں وہ بھی جانا پہچانا نہیں لگتا تھا۔

میری نانی ہر پھر کے ان سے آہستہ سے کہتی تھیں:

''اگر تم کچھ کھالیتی تو...وریوشا...کچھ تھوڑا سا تو کھالو بیٹی۔''

لیکن میری ماں اسی طرح خاموش اور ساکت رہیں۔

نانی مجھ سے جب بات کرتی تھیں تو بہت ہی مدہم لہجے میں کہ کسی کو سنائی نہ دے۔ میری ماں سے بات کرتیں تو آواز کسی قدر اونچا کر کے، مگر بہت ہی احتیاط سے، رک رک کر، سنبھل سنبھل کر۔ مجھے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ وہ میری سے کچھ ڈرتی ہیں۔ میں بھی اپنی ماں سے ڈرتا تھا۔ اس لئے میں اور میری نانی بہت جلد ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے۔

یکا یک میری ماں بولی ''سارا توف۔ کہاں ہے وہ ملاح؟'' تک بدل گئے ہوں، ان کا لہجہ تک اجنبی ہوگیا ہو کیا کہہ رہی تھیں وہ؟ کیا سارا توف، کون ملاح؟

پھر ہمارے کیبن میں ایک بوڑھا آدمی داخل ہوا، چوڑا چکلا، نیلے کپڑے پہنے ہاتھ میں ایک بکس لئے۔ نانی نے اس سے وہ بکس لے لیا اور میرے ننھے بھائی کی لاش اس میں رکھنے لگیں۔ رکھنے کے بعد وہ اس دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر باہر چلیں۔ لیکن وہ اتنی موٹی تھیں کہ آڑی ہوئے بغیر دروازے سے نکلنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ وہ وہیں کھڑی ہوگئیں اور بوکھلا کے چاروں طرف دیکھنے لگیں۔

''افوہ اماں'' میری ماں نے عاجز ہو کے کہا اور ان کے ہاتھوں تابوت گھسیٹ لیا۔ پھر وہ دونوں کی دونوں چلی گئیں اور میں اس نیلے کپڑے والے ملاح کے ساتھ کیبن میں اکیلا رہ گیا۔ وہ پھر جھکا اور آہستہ سے بولا:

''تو تمہارا بھائی مر گیا، ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلا گیا؟''

''آپ کون ہیں؟''

''ملاح۔''

''اور سارا توف کون ہے؟''

''ایک شہر ہے۔ دیکھو، کھڑکی سے باہر دیکھو، وہ رہا۔''

اب کنارہ کھڑکی کے پاس سے گذرتا چلا جا رہا تھا۔ تاریک، جا بجا سے اکھڑا ہوا اور دھند میں لپٹا جیسے کسی نے تازی ڈبل روٹی سے ایک موٹ سا توس تراش کر رکھ دیا ہو۔

''نانی اماں کہاں گئیں؟''

''اپنے نواسے کو دفنانے۔''

''تو کیا اس کو مٹی میں دبایا جائے گا؟''

''ہاں اور کیا۔ مٹی میں تو دبایا ہی جائے گا۔''

پھر میں نے اس ملاح کو بتایا کہ کسی طرح جب میرے باپ کی لاش دفنائی گئی تو لوگوں نے اس کے ساتھ دو زندہ مینڈکوں کو بھی دفنا دیا تھا۔ ملاح نے مجھے گود میں اٹھا لیا، بھینچ کر مجھے گلے لگایا اور پیار کرتے ہوئے بولا:

''ارے بیٹا، تم ابھی کیا جانو ان باتوں کو! ان مینڈکوں پر کیا ترس کھاتے ہو۔ ترس کے لائق تو تمہاری ماں ہے بیچاری ان کم بختوں پر لعنت بھیجو۔ اپنی ماں کو تو دیکھو کہ صدمے کے مارے اس کی کیا درگت ہوگئی ہے۔''

یکا یک اوپر سے بڑے زوروں سے چیخم دھاڑ کی آوازیں آنے لگیں لیکن میں سمجھ گیا کہ یہ اسٹیمر کی آواز ہے، اس لئے ڈرا نہیں۔ ملاح نے مجھے گود سے اتار دیا اور تیزی سے یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا:

''لو بھئی۔ اب ہم تو چل دئے۔''

چل تو میں بھی دینا چاہتا تھا اس لئے میں بھی کیبن سے باہر نکل آیا۔ تنگ و تاریک گیلری میں کوئی نہیں تھا۔ اور دروازے کے قریب سے مجھے زینے کا پیتل چمکتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی تو دیکھا کہ لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے، گٹھریاں سنبھالے، اترتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ تھے کہ سب لوگ اسٹیمر سے اتر رہے تھے۔ تو پھر مجھے بھی اترنا چاہئے تھا۔

جب میں اسٹیمر سے اترنے والے پٹروں کے نزدیک پہونچا جہاں دیہاتیوں کی بھیڑ تھی، تو سب مجھ پر چلانے لگے:

''کون ہے بھئی؟ کس کا لڑکا ہے؟ کہاں سے آیا؟''

''پتہ نہیں''، میں نے جواب دیا۔

بہت دیر تک میں اس دھکم پیل میں پھنسا رہا۔ کسی نے مجھے دھکا دیا، کسی نے ٹٹولا، کسی نے کھینچا۔ آخر کار وہ نیلے کپڑوں والا بوڑھا ملاح وہاں آپہونچا اور بولا:

''ارے یہ وہاں سے آیا ہے۔ استرا خان سے، اپنے کیبن سے نکل بھاگا۔''

اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور کیبن کی طرف دوڑا۔ وہاں اس نے مجھے پھر وہیں گٹھریوں پر بٹھا دیا اور جاتے جاتے انگلی ہلا کر دھمکاتے ہوئے بولا:

''اب جو یہاں سے ہلا تو ایسا دوں گا کہ یاد ہی کرے گا۔''

رفتہ رفتہ اوپر کا شور دب گیا، اسٹیمر کی تھرتھراہٹ رک گئی، پانی کی چھپا چھاپ بند ہوگئی۔ ایک بھیگی ہوئی دیوار کیبن کی کھڑکی کے آگے آ گئی، اندھیرا ہو گیا ار گھٹن پیدا ہوگئی۔ لگتا تھا کہ گٹھریاں اور سامان سامنے سے گذرنے لگے اور میں ان میں گھر سا گیا۔ میں بہت گھبرا رہا تھا۔ اگر سب چلے گئے اور میں یہیں رہ گیا تو کیا ہوگا۔ اٹھ کر دروازہ دیکھا تو جکڑ بند تھا۔ اور اس میں لگی ہوئی پیتل کی موٹھ مجھ سے گھومتی تک نہیں تھی۔ میں نے دودھ سے بھری ہوئی ایک بوتل جو وہیں رکھی ہوئی تھی اٹھائی اور پوری طاقت سے موٹھ پر دے ماری۔ بوتل کے ریزے ریزے ہوگئے اور دودھ میرے پیروں پر سے بہتا ہوا میرے جوتوں میں گھسنے لگا۔ اپنی ناکامیابی سے مایوس ہوکر میں گٹھریوں پر لیٹ گیا اور روتے روتے سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو اسٹیمر پھر تھرتھرا رہا تھا، پانی پھر چھپ چھپا رہا تھا اور کیبن کی کھڑکی سورج کی طرف چمکدار اور روشن تھی۔ میری نانی میرے پاس بیٹھی ہوئی کنگھی کر رہی تھیں اور منہ سکوڑ سکوڑ کے نہ جانے کیا بڑبڑاتی جا رہی تھیں۔ ان کے بال بہت لمبے، سیاہ اور بے حد گھنے تھے اور ان کے کندھوں اور سینے اور گھٹنوں پر سے ہوتے ہوئے فرش پر لوٹ رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے وہ ان کو فرش پر سے اٹھاتیں، کس کے مٹھی میں پکڑتیں اور دوسرے ہاتھ سے لکڑی کی ایک بھدی سی کنگھی سے زور زور سے جھاڑتیں۔ ان کے لب سکڑے ہوئے تھے، آنکھوں سے جھلاہٹ اور بیزاری ظاہر ہو رہی تھی، ان کا چھوٹا سا چہرہ بالوں کی ان گھنی گھٹاؤں سے گھرا ہوا کچھ عجیب مضحکہ خیز سا لگتا تھا۔

آج ان کا موڈ کچھ بگڑا ہوا تھا لیکن جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان کے بال اتنے لمبے کیوں

ہیں تو ان کی آواز میں وہی نرمی آ گئی، وہی دوستانہ گھلاوٹ جو ایک دن پہلے تھی۔

''بس خدا کی پھٹکار اور کیا۔ اب دیکھو نا ان بالوں کو سلجھاتے ہی سلجھاتے زمانہ گذر جاتا ہے۔ جب جوان تھی تو ان بالوں کیلئے دعائیں مانگا کرتی تھی اور اب ہاتھ پیر تھک گئے تو ان ہی کو کوستی ہوں۔ تو سوؤ میرے بچے۔ تم کیوں اٹھ بیٹھے؟ ابھی تو بہت سویرا ہے۔ سورج بھی پوری طرح نہیں نکلا۔''

''نانی اماں، اب سونے کو میرا جی نہیں چاہتا۔''

''اچھا، اگر جی نہیں چاہتا تو نہ سوؤ، جانے دو،، انہوں نے میری ہاں میں ملائی اور اپنے بالوں کی چوٹیاں گوندھنے لگیں۔ پھر کنکھیوں سے ادھر دیکھا جدھر میری ماں صوفے پر لمبی لمبی تیر کی مانند لیٹی تھیں اور مجھ سے مدھم لہجے میں کہنے لگیں:

''کل تم نے وہ بوتل کیسے توڑی؟ آہستہ سے بتاؤ۔''

جب وہ بولتی تھیں تو ان کے الفاظ میں ایک ایسا عجیب وغریب ترنم ہوتا تھا کہ وہ الفاظ میرے دماغ میں بڑی آسانی سے بیٹھ جاتے تھے۔ ایسے صاف ستھرے اور مزیدار ہوتے تھے وہ جیسے پھول ہوں۔ جب وہ مسکراتی تھیں تو ان کی آنکھوں کی سیاہ جھیلیں جیسے اور بھی وسیع ہو جاتی تھیں اور ان میں ایک ناقابل بیان نور جھلکنے لگتا تھا۔ مضبوط اور چمکتے ہوئے سفید دانت مسکراہٹ میں جیسے کھل پڑتے تھے اور جھلسے ہوئے رخساروں پر بہت سی جھریوں کے باوجود ان کا پورا چہرہ چمک ہوئے رخساروں پر بہت سی جھریوں کے باوجود ان کا پورا چہرہ چمک کا پورا چہر چمک اٹھتا تھا اور اس پر دوشیزگی کی شاداب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہاں البتہ ان کی پھولی پھولی ناک، جس کی نوک ہمیشہ سرخ رہتی تھی، ذرا معاملے کو بگاڑ دیتی تھی۔ ان کے نتھنے پھیلے ہوئے تھے اور وہ ہر گھڑی ایک کالی سی چاندی کے کام والی ڈبیہ میں سے نسوار نکل کر سڑکا لگایا کرتی تھیں۔ ان کی ہر چیز سے تاریکی اور اداسی جھلکتی تھی لیکن ان کی روح میں جو روشنی تھی اس کی مسرت، تابندگی اور گرمی ان کی آنکھوں سے ہمیشہ چھنتی رہتی تھی۔ ان کا جسم بھاری تھا، کمر کچھ اس طرح جھک گئی تھی کہ کبڑی لگتی تھیں لیکن وہ اس تیزی اور پھرتی سے چلتی پھرتی تھیں جیسے کوئی بڑی بھاری بلی ہوں۔ اور وہ بلی ہی کی طرح نرم اور محبت شعار بھی تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ میری زندگی میں نہیں آئی تھیں میں سو رہا تھا، تاریکی میں کہیں گم تھا۔ لیکن جب وہ آئیں تو مجھے جگا کر روشنی میں لے گئیں۔ انہوں نے میرے ماحول کے تمام بکھرے

ہوئے تاروں کو جمع کر کے ایک لمبے دھاگے کی طرح بنا دیا جو کہیں سے ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔ پھر اس دھاگے سے انہوں نے طرح طرح کے خوبصورت پھول اور بیلیں کاڑھیں، ایک رنگا رنگ جھالر بنائی۔ وہ آتے کے ساتھ ہی میری زندگی کی ہمدم و رفیق بن گئیں۔ ایک ایسی رفیق جو مجھے سب سے زیادہ محبوب تھیں، جو مجھ سے سب سے زیادہ نزدیک تھیں اور جنہیں میں سب سے زیادہ سمجھتا، پہچانتا اور جانتا تھا۔ انہیں زندگی سے جو بے لوث محبت تھی اس نے میری زندگی کو مالا مال کر دیا اور مجھے وہ طاقت بخشی جس کے سہارے میں نے اپنے سخت مستقبل کا مقابلہ کیا۔

آج سے چالیس برس پہلے اسٹیمر بہت مدہم رفتار سے چلا کرتے تھے۔ ہم کو نیژنی نووگورود پہنچتے پہنچتے کافی دیر لگ گئی اور مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں۔ کس قدر حسن سے بھرپور تھے وہ دن، خوبصورتی میں ڈوبے ہوئے۔

موسم بڑا اچھا تھا اور صبح سے رات تک میں اپنی نانی کے ساتھ عرشے پر ٹہلا کرتا تھا۔ صاف شفاف چمک دار آسمان کے نیچے بہتا ہوا، والگا کے دو کناروں کے بیچ میں، جن پر خزاں کی زرد چمک دار ریشمی جھالر لگی ہوئی تھی۔ زنگ کے رنگ کا اسٹیمر جس کے آخری سرے پر ایک بڑی سی کشتی بندھی تھی، آہستہ بندھی تھی، آہستہ آہستہ مزے سے پانی کے رخ کے خلاف چلا جا رہا تھا، آگے کو سر اٹھائے، اس کے چپو دونوں طرف کے خلاف چلا جا رہا تھا، آگے کو سر اٹھائے، اس کے چپو دونوں طرف سرمئی اور نیلے پانی کو کاٹتے ہوئے۔ نیچے بندھی ہوئی کشتی بھورے رنگ کی تھی اور پانی کے کھٹمل کی طرح لگتی تھی۔ ہر گھڑی ہمارے سامنے نئے نئے مناظر آتے اور نکلتے جاتے، چاروں طرف ماحول بدلتا جاتا۔ سبز سبز پہاڑ ایسے لگتے تھے جیسے زمین کے حسین و رنگین لباس میں شکنیں پڑ گئی ہوں، آبادیاں اور بستیاں دور سے خوب ادرک بھری ہوئی ڈبل روٹیوں کی مانند لگتی تھیں، پانی پر خزاں کی سوکھی ہوئی زرد زرد پتیاں تیر رہی تھیں۔

''واہ واہ وا۔ دیکھو تو ذرا کیا بہار ہے'' میری نانی بار بار کہتیں اور عرشے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتی جاتیں۔ ان کی آنکھیں خوشی کے مارے اور بھی بڑی بڑی لگنے لگتیں اور چہرے پر کیف کا نور سا چھا جاتا۔

اکثر وہ عرشے کے کنارے پر کھڑی ہوتیں تو ان کو یہ احساس بھی نہ رہتا کہ میں موجود ہوں، ان کے ہاتھ سینے پر بندھے ہوتے، لب ایک مسکراتے ہوئے انداز کے ساتھ مڑے جاتے اور آنکھیں میں

آنسو بھر بھر آتے۔ پھر میں ان کے گہرے رنگ کے پھول دار سایے کو پکڑ کر کھینچتا اور وہ ایک دم چونک پڑتیں:

''اوہ! ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے مجھے نیند آ گئی تھی اور کوئی خواب دکھائی دے رہا تھا مجھے!''

''لیکن آپ رو کیوں رہی ہیں نانی؟''

''وہ تو خوشی کے مارے۔ خوشی کے مارے میرے بچے، کمزوری کے مارے'' وہ مسکرا کے کہتیں۔ ''میں اب بہت سٹھیا گئی ہوں نا۔ میں اب تین بیسی سے اوپر تو ہو گئی ہوں۔''

پھر وہ نسوار کی ایک چٹکی لے کر سونگھتیں اور مجھے اولیا اور جانوروں، نیک دل ڈاکوؤں اور بھوتوں پریتوں کی بڑی عجیب عجیب سی کہانیاں سنانے لگتیں۔ یہ کہانیاں وہ ایک خاص ٹھیراؤ کے ساتھ بڑی پراسرار آواز میں بیان کرتیں۔ ان کا چہرہ مجھ سے نزدیک آ جاتا اور جب وہ میری آنکھوں میں جھانکتیں تو ان کی پتلیاں مجھے پھیلتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ جیسے وہ مجھے سہارا دینے کے لئے آنکھوں کے رستے میرے دل میں قوت کا ایک ابلتا ہوا چشمہ انڈیل رہی ہوں۔ ان کی آواز میں بات کرتے وقت بڑا ترنم ہوتا تھا جیسے وہ الفاظ بولتی نہ ہوں راگوں میں ڈھالتی ہوں۔ اور جوں جوں وہ بات کرتی جاتیں، ان کے طرز بیان میں زیادہ موسیقی پیدا ہوتی جاتی۔ ان کی باتیں سن مسرت کا وہ احساس ہوتا جو بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ جب وہ کوئی کہانی ختم کرتیں تو میں ہمیشہ کہتا:

''اور اور کہو نانی اماں۔''

''ہاں تو پھر یہ ہوا کہ وہ جو بونا تھا نا، تو وہ بیچارہ تندور کے نیچے بیٹھا تھا اور اس کے پاؤں میں لکڑی کی ایک پھانس چبھ گئی تھی۔ تو وہ بس لوٹ رہا تھا اور رو رہا تھا اور ادھر ہل رہا تھا کہ ارے بھائی چوہو! ارے میرے ننھے چوہو! ارے میں مرا! ارے مر گیا! ننھے چوہو! کوئی مدد کو دوڑو۔ ارے رے رے....''

وہ اپنا پنجہ پکڑ لیتیں اور اسے ادھر سے ادھر ہلانے لگتیں اور طرح طرح سے منہ بناتیں جیسے وہی تو بونا ہوں، جیسے ان کو ہی تکلیف ہو رہی ہو۔

ملاح چاروں طرف اکٹھے ہو جاتے، سیدھے سادے، داڑھیاں رکھے ہوئے ملاح، وہ سن سن کر خوب ہنستے اور ان کی تعریفیں کرتے اور اور کہانیوں کی فرمائشیں ہوتیں اور اس کے بعد کہتے:

''آؤ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔''

رات کے کھانے پر وہ ان کو واد کا پینے کی دعوت دیتے اور میری تواضع خربوزوں اور تربوزوں سے کی جاتی۔لیکن یہ سب باتیں چھپا کر ہوتیں کیونکہ اسٹیمر پر ایک افسر ایسا تھا جو لوگوں کو پھل کھانے سے روکا کرتا تھا۔اگر کسی کو کھاتے دیکھ لیتا تو اس کے ہاتھ سے چھین کر دریا میں پھینک دیتا۔وہ سپاہیوں کے سے کپڑے پہنے رہتا تھا،اس کی وردی میں نیچے سے اوپر تک پیتل کے بٹن لگے تھے اور وہ ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔لوگ اس سے پناہ مانگتے اور چھپتے پھرتے تھے۔

میری ماں کبھی کبھار ہی عرشے پر آتی تھیں،عموماً ہم سے الگ تھلگ رہتیں اور حسب دستور چپ چپ رہتیں۔ان کا لمبا قد،خوبصورت سڈول جسم اور سنہرے بالوں کی گھنی چوٹیاں۔ان کی شخصیت کی تمام قوت اور طاقت آج بھی مجھے دکھائی دیتی ہے۔ہاں البتہ اب لگتا ہے کہ میں کہر کے پردے یا کوئی چمکدار شفاف بادل کے پیچھے انہیں دیکھ رہا ہوں۔بہتے ہوئے سالوں کی آڑ سے اب تک مجھے ان کی وہ سرمئی نیلی آنکھیں نظر آتی ہیں جو میری نانی کی آنکھوں کی طرح کٹوارسی تھیں لیکن جن میں ایک عجیب طرح کی بیگانگی تھی۔

ایک دن انہوں نے بڑی سختی سے کہا تھا:

''اماں تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہنسواتی رہتی ہو۔''

میری نانی نے بڑے مزے میں جواب دیا:

''اچھا بھائی،اگر لوگوں کو ہنسی آتی ہے تو ضرور ہنسیں!ہنستے ہی گھر بستے ہیں!ان کا کچھ بھلا ہی ہو جائے گا۔''

اور مجھے یاد ہے کہ جب نیژنی دکھائی دینے لگا تو میری نانی بچوں کی طرح خوشی کے مارے بیقرار ہو گئیں۔

''دیکھو،دیکھو،کیا اچھا لگ رہا ہے'' وہ زور زور سے چلانے لگیں،میرا ہاتھ کس کے دبا لیا اور مجھ کو دھکیلتی ہوئی عرشے کی منڈیر تک لے گئیں۔

''دیکھو وہ رہا رتمہارا نیژنی!کیا ہی حسن ہے!گرجوں کی برجیوں کو دیکھو جیسے اڑ رہے ہوں۔''

پھر وہ آنکھوں میں آنسو بھرے میری ماں کی طرف مڑیں:

''دیکھو!وریوشا!ارے ایک نظر تو دیکھو!ارے تم تو بھول بھی گئی ہوں گی!دیکھو،آنکھیں تو ٹھنڈی

کرلو! مسرت کے دو چار گھونٹ تو پیو!''

میری ماں کے لبوں پر ایک اداس مسکراہٹ آئی۔

اسٹیمر اس حسین شہر کے بالکل سامنے جا کر کھڑا ہوا۔ دریا کے بیچوں بیچ جہاں چاروں طرف جہاز ہی جہاز پھیلے ہوئے تھے اور سینکڑوں مستول ساھی کے کانٹوں کی طرح ابھرے نظر آرہے تھے۔ ایک بڑی سی کشتی آئی جس میں بہت سے آدمی بھرے تھے اور ہمارے اسٹیمر کے نزدیک آ کر اس کے نچلے حصے میں اٹک گئی۔ پھر اس میں سب بہت سے لوگ اسٹیمر پر چڑھنے لگے۔ ان میں آگے آگے ایک ناٹا، دبلا پتلا، بوڑھا آدمی تھا، لمبا سا سیاہ کوٹ پہنے سبزی مائل آنکھیں، طوطے کی سی ناک اور کندن کئے ہوئے سونے کی سی سرخی مائل سنہری ڈاڑھی۔

''ابا!'' میری ماں زور سے چیخیں اور دوڑ کر اس کی گود میں گر پڑیں۔ بڈھے نے ان کا سر اپنے دبلے پتلے سرخ ہاتھوں میں پکڑ لیا اور ان کے گال تھپتھپاتے ہوئے منمناتی ہوئی تیز آواز میں کہنے لگا

''اوھو ہو ہو، ارے واہ بیوقوف! اچھا اچھا تو تو آ گئی۔ ہیں؟ تھو...و....و، کیا لوگ ہیں!!..''

نانی نے جلدی جلدی سب کو باری باری سے گلے لگایا اور پیار کیا، وہ پھرکی کی طرح گھوم رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے سب رشتہ داروں کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا:

''لو یہ لو۔ جلدی کرو نا۔ یہ تمہارے میخائل ماموں ہیں، یہ یاکوف ہیں اور یہ ممانی نتالیا۔ اور یہ جو لڑکے ہیں نا... یہ ہیں تمہارے ممیرے بھائی۔ دونوں کا نام ساشا ہے اور یہ کاتیرینا آپا ہیں۔ سب اپنا ہی کنبہ ہے۔ کتنے بہت سے! ہیں نا؟''

''اور تم کیسی ہو بڑی بی'' میرے نانا نے نانی سے پوچھا اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو تین بار پیار کیا۔

پھر میرے نانا نے بھیڑ میں سے مجھے کھینچا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:

''اچھا! یہ تو بتاؤ تم کون ہو؟''

''میں استراخان سے آیا ہوں، کیبن سے نکل بھاگا۔''

میرے نانا ماں کی طرف مڑے:

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' اور جواب کا انتظار کئے بغیر مجھے ہٹایا اور بولے:

''کلے تو بالکل باپ جیسے ہیں، چوڑے چکلے۔ چلو کشتی میں سوار ہو جاؤ!''

ہم کشتی میں بیٹھ کر کنارے پہنچے۔ پھر ہم اجڑی بجڑی سڑک پر نکل آئے جس کے دونوں طرف بند بنے ہوئے تھے۔ بندوں پر چھدری چھدری سی گھاس اگی ہوئی تھی۔

میرے نانا اور میری ماں سب سے آگے آگے چل رہے تھے۔ نانا میری ماں کے کندھوں تک پہونچتے تھے اور چھوٹے چھوٹے تیز قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میری ماں ان کو بلندی سے دیکھتی ہوئی ہوا میں تیرتی جا رہی ہوں۔ ان کے پیچھے میرے دونوں ماموں خاموشی سے چل رہے تھے۔ میخائل ماموں کے بال سیاہ اور چمک دار تھے، جسم نانا کی طرف دبلا پتلا تھا، یاکوف ماموں کے بال سنہرے اور گھنگھریالے تھے۔ پھر کچھ عورتیں تھیں، موٹی موٹی، بھڑکیلے رنگوں کے کپڑے پہنے۔ اور کوئی چھ بچے رہے ہوں گے، مجھ سے بڑے لیکن بہت خاموش۔ میں اپنی نانی اور بوٹا سی ممانی نتالیا کے ساتھ چل رہا تھا۔ ان کی آنکھیں نیلی تھیں، رنگت پیلی اور پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ ذرا ذرا دیر بعد وہ رک جاتیں اور سانس کھینچ کر کہتیں:

''افوہ! اب تو میں ایک قدم نہیں چل سکتی۔''

''لیکن ان لوگوں کو تمہیں ساتھ لانے کی کیا پڑ گئی تھی!'' میری نانی نے بیزاری سے بڑبڑا کیکہا

''آوے کا آوا ہی کچا ہے۔''

مجھے نہ تو وہ بچے اچھے لگ رہے تھے نہ بڑے۔ ان لوگوں کے درمیان مجھے سخت اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں تک معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے میری نانی بھی غائب ہو کر مجھ سے دور ہٹ گئی ہیں۔

مجھے نہ تو وہ بچے اچھے لگ رہے تھے نہ بڑے۔ ان لوگوں کے درمیان مجھے سخت اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں تک معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے میری نانی غائب ہو کر مجھ سے دور ہٹ گئی ہیں۔

خاص طور پر مجھ کو نانا ابا بہت برے لگ رہے تھے اور ایک دم سے جیسے کسی دشمن کی موجودگی کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ میں خاص طور پر انکا جائزہ لے رہا تھا اور دل میں عجیب سی کرید ہو رہی تھی جس میں سراسیمگی بھی شامل تھی۔

ہم لوگ چڑھائی کے آخر میں پہنچ گئے۔ اس کے اوپر داہنے ہاتھ کی منڈیر سے ملا ہوا ایک نیچا سا ایک منزل مکان تھا جہاں سے گلی شروع ہوتی تھی۔ مکان کا رنگ میلا گلابی تھا اور باہر کوئی کھڑکیاں نکلی ہوئی

تھیں جن پر نیچے نیچے چھجے تھے۔ باہر سے دیکھنے میں تو وہ مکان کافی بڑا لگتا تھا، لیکن اندر کمرے بہت دیکھنے میں تو وہ مکان کافی بڑا لگتا تھا، لیکن اندر کمرے بہت تنگ و تاریک تھے اور بڑی ٹھونسم ٹھانس تھی۔ بہت سے لوگ ان کمروں میں گھسے ہوئے، ناک بھوؤں چڑھائے ادھر ادھر کام کرتے پھر رہے تھے اور ویسا ماحول تھا جیسا اسٹیمر میں کنارے پر لگنے سے پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ بچے اس طرح ادھر ادھر چپکے چپکے پھر رہے تھے جیسے گوریاں دانہ چرانے کی فکر میں پھدکتی پھر رہی ہوں پورے مکان پر ایک عجیب چڑ چڑی سے جھلائی ہوئی اجنبی فضا طاری تھی۔

میں باہر احاطے میں نکلے آیا لیکن یہاں بھی ماحول کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ الگنیوں پر بڑے بڑے کپڑے سوکھنے کو پھیلے ہوئے تھے، رنگین پانی سے بھرے ہوئے کنڈال اور ٹنکیاں جگہ جگہ رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں بھی کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف کو ایک ٹوٹا پھوٹا سا چھپر تھا جس کے نیچے چولھے میں لکڑیوں کی آگ جل رہی تھی اور اس آگ پر کوئی چیز کھد بدکھد بد پک رہی تھی اور اس سے ابلتے ہوئے بلبلے چھوٹ رہے تھے۔ بھاپ اور دھوئیں کی آڑ میں سے کوئی شخص جو دکھائی نہیں دے رہا تھا عجیب عجیب طرح کے الفاظ زور زور سے بولتا جا رہا تھا:

''صندل۔ عنابی۔ تیزاب...''

2

یہ ایک ناقابل بیان حد تک عجیب و غریب نئی زندگی کی ابتدا تھی، بھانت بھانت کے واقعات سے بھرپور اور بڑی برق رفتار۔ اب تو مجھے اس کی یادیں اس طرح آتی ہیں جیسے کوئی عقلمند گھاگ انسان ایک ایسی کہانی کہہ رہا ہو جو دردناک بھی ہو اور جس میں حقیقت بیانی بھی ہو۔ اب جو میں ان بیتے دنوں کو یاد کرتا ہوں تو یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ سچ ایسا ہی تھا۔ اس ''احمق آوے کے آوے'' کی زندگی میں اتنی تاریکی اور اتنے مصائب تھے کہ دل چاہتا ہے بہت سی حقیقتوں کو ماننے ہی سے انکار کر دوں۔

لیکن حقیقت اور سچائی ہر قسم لے لحاظ سے بلند تر ہے۔ اور یہ داستان صرف میری داستان نہیں بلکہ یہ تو اس اندوھناک ماحول کی گھٹن کو اجاگر کرتی ہے جس میں اس زمانہ کا معمولی روسی انسان اپنی زندگی بسر کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے۔☆

میرے نانا کے گھر میں سب ایک دوسرے کے خلاف رہتے تھے اور مخالفت اور ناچاقی کے جیسے دھویں سے سارے گھر میں اٹھتے رہتے تھے۔ بڑوں کے تو خیر رگ و پے میں وہ زہر سرایت ہی کر گیا تھا لیکن بچے بھی اس سے محفوظ نہ تھے۔ بعد کو اپنی نانی کے قصوں سے مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں ایسے وقت میں اپنے میکے پہونچی تھیں جب کہ ان کے بھائی اپنے باپ سے یہ مطالبہ کر کر رہے تھے کہ جائداد تقسیم کر دی جائے۔ اور اسی بیچ میں میری ماں جو آ گئیں

☆ گورکی نے ''اب بھی'' انقلاب سے پہلے ہی کے زمانے کے لئے لکھا ہے اس لئے کہ ''بچپن'' 1913 میں مکمل ہو چکا تھا۔ (ایڈیٹر۔)

تو یہ مطالبہ اور بھی شدت اختیار کر گیا۔ میری ماں نے اپنی ماضی سے شادی کی تھی اور اس بنا پر نانا نے ان کا جہیز روک لیا تھا۔ اب میرے ماموں ڈرے کہ کہیں وہ سوال پھر نہ اٹھ کھڑا ہو۔ میرے ماموؤں کا کہنا تھا کہ وہ جہیز ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کئی دن سے آپ میں بڑی تلخ بحث چل رہی تھی کہ میرے ماموؤں میں سے کون شہر میں دوکان کھولے گا اور کون دریاوکا کے پار والی بستی کوناوینو میں کھولے گا۔

آنے کے فوراً ہی بعد ہم لوگ باورچی خانے میں کھانا کھا رہے تھے کہ یکا یک تو تو میں میں ہونے لگی۔ میرے دونوں ماموں ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میز پر سے جھک جھک کر میرے نانا کے منہ پر زور زور سے چیخنے لگے۔ دانت نکال نکال کر وہ ایسا گرجتے اور ایسا کانپتے جیسے جھبرے کتے جمع ہو گئے ہوں۔ میرے نانا زور زور سے میز پر چمچے سے مارنے لگے، ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ بھی زور زور سے چیخنے لگے:

''میں تو لوگوں کو نکال باہر کروں گا! گلی گلی بھیک مانگو گے تم لوگ!''

میری نانی دکھ بھرے انداز اور آواز میں بولیں:

''دے دو کمبختوں کو جو کچھ مانگتے ہیں۔ سب دے دو۔ جان تو چھوٹے کسی طرح۔ چین تو پائیں ہم۔''

''دھت تیری کی! تو بھی ان لوگوں سے مل گئی ہے!'' نانا زور سے چیخے۔ ان کو دیکھ کر حیرت یہ ہوتی تھی کہ اتنا مختصر سا آدمی اس قدر زور سے کیسے چیخ سکتا ہے۔

میری ماں اٹھیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سب کی طرف پیٹھ کر کے کھڑکی کے نزدیک کھڑی ہو

گئیں۔ ایک دم سے میخائل ماموں نے اپنے بھائی کے منہ پر ایک زور کا مکا رسید کیا۔ وہ زور سے ڈکارے اور لپک کے بھائی کی گردن پکڑ لی اور پھر دونوں گتھم گتھا، لوٹتے، ہانپتے، بنکارتے، گالیاں بکتے، زمین پر لوٹنے لگے۔

بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ میری ممانی نتالیا نے جو پیٹ سے تھیں الگ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ میری ماں نے ان کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا اور کمرے سے باہر لے گئیں۔ ایوگینیا بوانے، جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور جن کے چہرے پر ماتا کے داغ تھے اور جو ہمیشہ ہنستی رہتی تھیں جلدی سے بچوں کو نکال دیا۔ کرسیاں ایک دوسرے پر گر رہی تھیں، سامان سب الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ چوڑے شانوں والا نوجوان تسیگانوک جو نانا کا شاگرد تھا، دوڑا اور میخائل ماموں کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور داڑھی والے گنجے مستری گریگوری ایوانووچ سیاہ عینک لگائے آگے بڑھے اور بڑے اطمینان سے تولیہ سے میخائل ماموں کے ہاتھ باندھنے لگے۔

میخائل ماموں کی چھدری سیاہ ڈاڑھی فرش پر رگڑ رہی تھی اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کے زور زور سے چیخ رہے تھے۔

''ہائے ہائے! یہ بھائی ہیں! یہ سگے بھائی ہیں۔ تھو...و..و، کیا لوگ ہیں!'' میرے نانا غصے میں بھرے میز کے چکر لگائے جا رہے تھے۔

لڑائی شروع ہوتے ہی میں ڈر کے مارے تندور پر چڑھ گیا تھا اور وہیں سے میں نے دیکھا کہ نانی اماں یاکوف ماموں کے جگہ جگہ سے کچلے ہوئے منہ کو پانی سے دھو رہی ہیں۔ وہ بھوں بھوں روتے اور پیر ٹپکتے جاتے اور وہ افسوس کرتی جاتیں:

''توبہ ہے کمبخت! کچھ تو عقل کے ناخن لے۔ توبہ ہے! جنگلی جانور! کیا وحشی خاندان ہے!''

میرے نانا غصے کے مارے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کو کندھوں پر کھینچتے اور چلاتے جاتے:

''دیکھ لے! ایسے بچے جنے ہیں تو نے! جنگلی جانور! چڑیل کہیں کی!''

جب یاکوف ماموں باہر چلے گئے تو نانی اماں ایک کونے میں چھپ کے زور زور سے رونے لگیں:

''اے یسوع مسیح کی پاک دامن ماں! رحم کر اور میرے بچوں کو کچھ عقل دے!''

میرے نانا میز پر نظریں جمائے کھڑے تھے جس پر تمام چیزیں بکھری ہوئی الٹی سیدھی پڑی تھیں۔

''اب ان لونڈوں پر نظر رکھنا بڑی بی!'' وہ مدھم لہجے میں بولے۔ ''نہیں تو یہ سب وروارا کا خاتمہ کر دیں گے۔ ہاں۔''

نانی بولیں ''خدا جانے کیا کہہ رہے ہو! اب قمیص تو اتار دو جو اسے سی دوں۔''

پھر انہوں نے نانا کا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ان کے ماتھے پر پیار کیا اور نانا نے جو قد میں ان سے کافی چھوٹے تھے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''ایسا لگتا ہے بہتری اسی میں ہے کہ بٹوارہ کر دیا جائے۔''

''ہاں، وروارا کے ابا!''

وہ دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پہلے ان کی باتیں گھل مل کے ہوتی رہیں لیکن جلد ہی میرے نانا اس طرح ادھر ادھر پھنپھناتے ہوئے ٹہلنے لگے جیسے لڑائی سے پہلے مرغا۔ وہ بار بار نانی کی طرف انگلی اٹھاتے۔

''میں تمہیں خوب جانتا ہوں! تمہیں بس انہیں کی فکر ہے، ان ہی کو چاہتی ہو!'' وہ شکایت بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''لیکن وہ جو تمہارا میخائل ہے وہ اتنا بڑا ریاکار ہے کہ کیا کہوں اور وہ جو یاکوف ہے بے ایمان۔ جو کچھ میں نے کمایا سب خاک سیاہ کر دیں گے یہ لوگ، ایک سرے سے برباد کر دیں گے۔''

یکا یک گڑبڑ میں میرا ایک کندھا ایک استری میں لگا اور وہ کھٹ پٹ کرتی، کھڑبڑاتی تندور پر سے گری اور لڑھکتی ہوئی پانی کی بالٹی میں جا پہونچی۔ نانا اچھل پڑے، مجھے کھینچا اور کچھ ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔

''کس نے تندور پر تمہیں چڑھایا؟ تمہاری ماں نے؟''

''نہیں، میں خود چڑھا!''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔''

''نہیں، میں جھوٹ نہیں کہتا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔''

انہوں نے مجھے ایک دھکا دیا اور سر پر ایک چپت رسید کی۔

''بالکل اپنے باپ پر پڑا ہے! چل نکل یہاں سے۔''

میں وہاں سے نکل بھاگنا تو چاہتا ہی تھا۔ فوراً چل دیا۔

البتہ میں خوب جانتا تھا کہ میرے نانا کی سبز آنکھیں برابر میرا پیچھا کر رہی ہیں اور مجھے ان سے بے حد ڈر لگ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان نگاہوں سے چھپنے کی مستقل کوشش کرتا رہتا تھا اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے نانا بڑے کمینے آدمی ہیں۔ وہ ہر ایک سے سختی اور طنز کے ساتھ بات کرتے تھے۔ لوگوں کو پریشان کر کے، دکھ پہونچا کے جیسے ان کو کوئی خوشی ہوتی تھی۔ ''تھو...و...و، کیا لوگ ہیں!..'' وہ کہتے رہتے۔ جب وہ زور سے کہتے ''تھو'' اور ''و'' کو کھینچتے تو میرا خون جمنے لگتا اور مجھے ایسا لگتا جیسے دنیا میں میرا کوئی نہیں، میں بالکل اکیلا ہوں، تن تنہا۔

شام کو چائے کا وقت خاص طور پر بڑا خطرناک ہوتا تھا۔ اس وقت میرے نانا، دونوں ماموں اور سب مزدور تھکے ماندے باورچی خانے میں آتے، ہاتھ رنگ اور تیزاب سے جلے ہوئے، پیشانی پر بالوں کو سمیٹنے کے لئے فیتے بندھے ہوئے۔ اس وقت وہ لوگ باورچی خانے کے کونے میں لگی ہوئی مقدس شبیہوں کی مانند لگتے۔ اس خطرناک موقع پر میرے نانا میرے سامنے ہی بیٹھتے اور مجھ سے اتنا مخاطب رہتے کہ پوتوں کو جلن ہونے لگتی۔ وہ ہمیشہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہتے، نوک پلک سے درست، چکنے، ستھرے اور تراش خراش کے ساتھ۔ ہاں البتہ ان کی سائن کی نیم آستین بالکل بوسیدہ اور پرانی ہوگئی تھی، سوتی قمیص جگہ جگہ سے سکڑ گئی تھی، پتلون میں گھٹنوں پر پیوند تھے لیکن پھر بھی ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں سب سے زیادہ خوش شکل اور خوش پوش وہی ہیں۔ وہ اپنے بیٹوں سے زیادہ اچھے لگتے تھے جو سوٹ پہنے رہتے تھے، کفوں پر کلف اور گلے میں ریشمی رومال۔

ہمارے پہونچنے کے چند دن بعد نانا نے مجھے دعا مانگنے کا طریقہ سکھانا شروع کیا۔ باقی سب بچے مجھ سے بڑے تھے اور جس گرجے کے سنہری گنبد ہماری کھڑکی سے دکھائی دیتے تھے، اس کے پادری صاحب سے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے۔ اس گرجے کا نام اوسپینسکی گرجا تھا۔

مجھے میری ممانی نتالیا نے پڑھانا شروع کیا جو خاموش مزاج اور دبو تھیں۔ نتالیا ممانی کا چہرہ بچوں کی طرح بھولا بھولا تھا اور ان کی آنکھیں اس قدر شفاف تھیں کہ معلوم ہوتا تھا ان میں نگاہیں ڈال کے ان کی کھوپڑی کا پچھلا حصہ تک دیکھا جا سکتا ہے۔

مجھے ان کے پاس بیٹھ کر، پلک جھپکائے بغیر ان کو گھورتے رہنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ لیکن ان کو اس بات سے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی، وہ اپنی آنکھیں میچتیں، سر جھٹکتیں اور بہت مدہم لہجے میں کہتیں ''کہو نا۔

''ہمارا باپ جو دائم ہے...''

''لیکن یہ اس ''دائم ہے'' کے کیا معنی؟...''

وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتیں اور جواب دیتیں ''مت سوال پوچھو! پوچھنے سے اور گڑ بڑ ہوتی ہے! میرے ساتھ ساتھ کہتے جاؤ ''ہمارا باپ جو...'' ہوں ہوں کہو۔ کیوں؟''

لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ پوچھنے سے اور گڑ بڑ کیا ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے۔ یہ الفاظ ''دائم ہے'' اب مجھ میں ایک کریدسی پیدا کرنے لگے، میرے لئے پراسرار بن گئے اور میں جان بوجھ کر ان کو بگاڑنے لگا ''جو دوئم ہے'' ''جس کا دوئم ہے...''

لیکن میری ممانی بیچاری پریشان حال، رنگ اڑا ہوا، بڑے صبر و استقلال سے مجھے صحیح کرتی رہتیں:

''نہیں، نہیں، ایسے نہیں، بس سیدھے سے کہو نا ''جو دائم ہے...''

لیکن نہ تو الفاظ آسان تھے نہ ممانی کا وجود کوئی معمولی بات تھی۔ میں جھنجلا جاتا اور پھر دعا کا یاد رکھنا مشکل ہو جاتا۔

ایک دن میرے نانام نے مجھ سے پوچھا: ''کیوں الیکسئی! آج کیا کرتے کرتے رہے؟ کھیلتے رہے؟ ہاں وہ تو تمہارے سر میں جو گومڑا پڑا ہوا ہے اسی سے ظاہر ہے۔ ماتھے رپ گومڑا ڈال لینا کوں سی شیخی کی بات ہے؟ اور وہ اس کا کیا ہوا وہ جو سیکھ رہے تھے ''ہمارا باپ جو...؟''

''اس کا حافظ بڑا خراب ہے'' میری ممانی آہستہ سے بولیں۔

میرے نانا ہنسنے لگے اور اپنی سرخ بھویں اٹھاتے ہوئے بولے:

''اگر یہ معاملہ ہے تو پھر اس کو چاٹ دینی پڑے گی! تمہارے باپ نے تمہیں کبھی چاٹ دی تھی؟''

وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ چپ رہا۔

''میکسم بچے کو کبھی نہیں مارتے تھے اور انہوں نے مجھے بھی منع کر رکھا تھا'' میری ماں نے جواب دیا۔

''اچھا وہ کیوں؟''

''وہ کہتے کہ مار سے نہ کبھی کسی نے سیکھا ہے نہ سیکھے گا۔''

''میکسم تو احمق تھا۔ خدا اسے غریق رحمت کرے۔''

نانا کی یہ بات مجھے بھی ناگوار گزری اور میری ناگواری کا احساس ان کو بھی ہوا۔

''کیوں منہ بنا رہا ہے؟ ذرا ہوش میں رہ! سنبھل کے چل سنبھل کے! سنیچر کو وہ انگشتانے والی بات پر ساشا کی ''دھلائی'' ہوگی'' وہ اپنے سنہری سرخ اور سفید بال پیچھے کو چپکاتے ہوئے بولے۔

''آپ کیسے کیجئے گا ''دھلائی''؟'' میں نے پوچھا۔

سب لوگ ہنسنے لگے اور میرے نانا نے جواب دیا:

''ٹھہر جاؤ، گھبراؤ مت، تم کو بھی پتہ لگ جائے گا۔''

میں ایک کونے میں دبک گیا اور سوچنے لگا کہ جو کپڑے رنگنے کے لئے آتے تھے ان کو الگ الگ کرنے کے لئے تو ''دھلائی'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا لیکن ''چاٹ'' اور مار تو غالباً ایک ہی معنی رکھتے تھے۔ لوگ گھوڑوں اور کتوں بلیوں کو مارتے ہیں، استراخان میں سپاہی لوگ ایرانیوں کو مارتے تھے۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن میں نے کسی کو چھوٹے بچوں کو مارتے نہیں دیکھا تھا۔ بے شک میرے ماموں کبھی کبھی اپنے بچوں کو سروں پر آگے یا پیچھے چپت رسید کر دیا کرتے تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ ان بچوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ بس چوٹ کی جگہ ذرا سا سہلائی اور بات آئی گئی ہوگئی۔ کبھی کبھی میں ان سے پوچھتا کہ کیا درد ہوتا ہے تو وہ بڑی ہمت سے جواب دیتے:

''یہ کس کی حرکت ہے، حرامزادو؟ آخر کہیں کے...''

میخائل ماموں نے میز پر جھکتے ہوئے انگشتانے کو انگلی سے ٹھوکے لگائے اور اس پر پھونک ماری۔ مستری نے بے نیازی سے اپنی سلائی جاری رکھی۔ اس کے بڑی سے گنجے سر پر پرچھائیاں لرزتی رہیں۔ یاکوف ماموں دوڑتے ہوئے اندر آئے اور تندور کے پیچھے چھپ کر چپکے چپکے ہنسنے لگے۔ نانی کدوکش پر کچے آلو رگڑ رہی تھیں۔

میخائل ماموں ایک دم سے بول پڑے:

''یہ اس یاکوف والے ساشا نے کیا ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے'' یاکوف ماموں چیخے اور اچھل کر تندور کی آر سے آگے نکل آئے۔

لیکن پھر کسی کونے سے ان کے بیٹے ساشا نے رونا شروع کیا:

''ابا، ان کی بات نہ مانئے گا۔ انہوں ہی نے مجھ سے یہ کرنے کو کہا تھا۔''

میرے ماموں آپس میں جھگڑنے لگے۔ فوراً میرے نانا کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ انہوں نے انگلی پر پولٹیس باندھی اور ایک لفظ کہے بغیر مجھ کو ساتھ لے کر باہر نکل گئے۔

سب نے یہی کہا کہ قصور میخائل ماموں کا تھا۔ تو پھر اگر میں نے چائے کے وقت پوچھا کہ کیا میخائل ماموں کو بھی مار پڑے گی اور ان کی بھی ''دھلائی'' تو یہ بات بالکل فطری تھی۔

''ہاں ہونا تو چاہئے'' میرے نانا دھیرے سے بولے اور غور سے مجھ کو دیکھنے لگے۔

میخائل ماموں نے زور سے میز پر ایک مکا مارا:

''وروارا، اگر تم اپنے اس پلے کو قابو میں نہیں رکھو گی تو یاد رکھنا اس کی گردن مروڑ دوں گا!''

''تم ذرا انگلی سے چھو کر تو دیکھو اسے'' میری ماں نے جواب دیا۔

سب لوگ چپ ہو گئے۔

میری ماں اپنے چند الفاظ سے بعض اوقات لوگوں کو بالکل پسپا کر کے رکھ دیتی تھیں۔

مجھے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ گھر میں ہر شخص میری ماں سے مرعوب تھا۔ یہاں تک کہ جب میرے نانا بھی ان سے بات کرتے تھے تو لہجہ بدل کر اور ان کی آواز میں بھی، دوسروں سے بات کرنے کے مقابلے میں، میری ماں سے بات کرنے میں نرمی اور دھیما پن آ جاتا تھا۔ مجھے اس سے خوشی ہوتی تھی اور پھر میں اپنے ممیرے بھائیوں میں خوب شیخی بگھارتا:

''میری ماں یہاں سب سے زیادہ زوردار ہیں جناب۔''

اور وہ لوگ بھی اس بات کو مانتے تھے اور کبھی انکار نہیں کرتے تھے۔ لیکن اگلے سنیچر کو جو کچھ ہوا اس سے اپنی ماں کے متعلق میری رائے کو یکا یک سخت پہونچا۔

سنیچر ہوتے ہوتے میں بھی ایک آفت میں پھنس گیا۔ بڑے لوگ جس طرح کپڑوں کے رنگ بدلا کرتے تھے وہ دیکھ کر مجھے بہت ہی شوق پیدا ہوتا تھا۔ وہ لوگ کبھی زرد رنگ کا کوئی کپڑا لیتے، اس کو کالے رنگ کے پانی میں ڈبوتے اور نکالتے تو وہ بالکل گہرا نیلا ہوتا۔ یا کوئی بھورا کپڑا لے کر سرخ پانی میں ڈبوتے تو وہ گہرا سرخ ہو کر نکلتا۔ ''عنابی''۔ دیکھنے میں تو یہ سب بہت آسان لگتا تھا لیکن ہوتا کیسے تھا۔

میرے دل میں اندر ہی اندر جوش اٹھتا کہ ذرا میں بھی رنگائی پر ہاتھ صاف کروں اور میں نے یہ

بات یا کوف ماموں والے ساشا سے کہی۔ ساشا سنجیدہ خاموش سا لڑکا تھا جو ہمیشہ بڑوں کی دم کے پیچھے لگا ہوا، ان کو اپنی خدمات پیش کرتا رہتا تھا۔ میرے نانا کے سوا سب ہی اس کی تعریف کیا کرتے تھے کہ بہت تیز ہے، سب کا کام کرتا ہے وغیرہ۔ لیکن میرے نانا کہتے ''تھو... چاپلوس کہیں کا'' اور وہ حقارت کی نظر سے اس کو دیکھا کرتے۔

ساشا دبلا پتلا، سانولے رنگ کا تھا، آنکھیں کیکڑے کی طرح باہر کو ابلی ہوئی۔ وہ مدہم لہجے میں جلدی جلدی بات کرتا اور آدھے الفاظ کھا جاتا تھا۔ بات کرنے میں وہ ادھر ادھر دیکھتا جیسے بس اب نوک دم بھاگے گا اور کہیں چھپ جائے گا۔ عام طور پر اس کی بھوری آنکھیں ساکت رہتی تھیں لیکن جب اس کو کسی بات پر جوش آتا تو اس کی آنکھوں کے ڈھیلے تک ہلنے لگتے۔

مجھے وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھ کو میخائل ماموں والا ساشا زیادہ اچھا لگتا تھا، چھوٹا موٹا سا لڑکا، اداس اداس سی آنکھیں، دل میں گھر کر لینے والی مسکراہٹ۔ کتنا ملتا جلتا تھا اپنی بوٹا سی ماں سے۔ اس کے دانت بہت بھدے تھے، باہر کو نکلے ہوئے اور اوپر کے جبڑوں میں دانتوں کی قطار دوہری تھی۔ وہ ہر وقت اپنے دانتوں سے الجھا رہتا تھا اور مستقل طور پر منہ میں انگلیاں ڈالتا اور پچھلے دانتوں کو جھٹکے دے دے کر ڈھیلا کرتا رہتا تھا۔ اگر کوئی اور دیکھنا چاہتا تو بڑی سعادت مندی سے اسے بھی دیکھنے دیتا۔ لیکن اس میں اور کوئی دلچسپی کی بات نہ تھی۔ گھر میں اتنے آدمی تھے لیکن وہ اکثر تنہا ہی دکھائی دیتا، کسی اندھیرے کونے میں اکیلا بیٹھا رہتا یا کھڑکی کے نزدیک بیٹھ کر اپنی شامیں گزارتا۔ اس کے پاس بیٹھ کر بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی اور یہ چیز مجھے اچھی لگتی تھی۔ بس کھڑکی کے پاس اس سے چپک کر بیٹھ جاؤ، چاہے گھنٹے بھر تک زبان نہ کھولو اور مزے سے ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی میں دیکھتے ہوئے اوسپینسکی گرجا کے میناروں پر منڈلاتے چکر کاٹتے کوؤں کا نظارہ کرتے رہو۔ یہ پرندے کبھی دور اوپر اٹھ جاتے، کبھی غوطہ لگا جاتے، پھر ایک سیاہ جال کی طرح مدہم پڑتے ہوئے آسمان پر پھیلتے پھیلتے غائب ہو جاتے۔ غائب ہو جانے کے بعد ایک عجیب طرح کا پھیلا ہوا خلا باقی رہ جاتا۔ اور جب انسان اس طرح کا منظر دیکھ رہا ہو تو پھر اس کا باتیں کرنے کو کیا جی چاہے گا کہ دل تو ایک عجیب غم آمیز انبساط کے احساس سے لبالب ہوتا ہے۔

اس کے بمقابلہ یا کوف ماموں کا ساشا جو تھا، وہ بڑوں کی طرح کسی چیز کے متعلق بھی بڑے موثر

انداز میں کافی طویل بات چیت کرسکتا تھا۔اس کو یہ پتہ چلا کہ میں رنگریزی کا کام سیکھنے کیلئے کافی بے چین ہوں،تو اس نے مجھ کو صلاح دی کہ جو میز پوش اتوار کے دن بچھایا جاتا جاتا تھا وہ الماری سے لے لوں اور اس کو گہرا نیلا رنگ دوں۔

''سفید چیزوں پر رنگ زیادہ اچھا چڑھتا ہے۔میں جانتا ہوں'اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا۔

میں بھاری میز پوش گھسیٹ گھساٹ کے نکالا اور اسے لے کر دوڑتا ہوا احاطے میں پہونچا۔لیکن ابھی میں نے اس کا ایک کونہ ہی ''نیل'' میں ڈبویا تھا کہ تسیگا نوک مجھ پر ٹوٹ پڑا،میز پوش میرے ہوتھوں سے چھین لیا اور اسے اپنے بڑے پنجوں سے نچوڑ کر میرے ممیرے بھائی سے، جو چھپر سے سب ماجرا دیکھ رہا تھا، بولا:

''جاؤ،دوڑ کر نانی کو بلالاؤ!''

پھر میری طرف مڑا اور اپنا الجھے بالوں والا سر ہلا کر بولا:

''اب دیکھنا۔اس حرکت کیلئے کیسی پڑتی ہے۔''

میری نانی جلدی سے باہر نکلیں۔یہ شرارت دیکھ کر ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا بلکہ جب وہ مجھے اپنے مخصوص عجیب وغریب طریقے سے ڈانٹنے لگیں تو ان کے دو چار آنسو بھی گر پڑے:

''ارے کمبخت۔تیرے دماغ میں کیا سمائی۔ارے تجھے پکڑ کر اتنا پیٹے، اتنا پیٹے تو اس پار جا پڑے!''

''ارے کمبخت۔تیرے دماغ میں کیا سمائی۔ارے تجھے پکڑ کر اتنا پیٹے، اتنا پیٹے تو اس پار جا پڑے!''

پھر وہ تسگا نوک کی خوشامد کرنے لگیں:

''دیکھ بیٹا وانیا۔نانا سے نہ کہنا۔میں اسے چھپا دونگی۔شاید کسی طرح بات بن ہی جائے۔''

وانیا نے رنگ برنگ کے دھبوں سے بھرے ہوئے گچھے سے بھیگے ہوئے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کہا:

''تم میری فکر نہ کرو۔لیکن اس کا خیال رکھنا کہ یہ ساشا کہیں لگائی بجھائی نہ کرے۔''

''میں اسے پیسے دے دوں گی، پھر وہ چپ رہے گا'' میری نانی مجھ کو لے کر اندر چلی گئیں۔

سنیچر کے دن شام کے وقت، رات کی عبادت سے پہلے، کوئی مجھے باورچی خانے میں لے گیا۔ وہاں اندھیرا تھا اور سناٹا۔ مجھے یاد ہے کہ جو دروازے دوسرے کمروں میں یا باہر کی طرف کھلتے تھے وہ سب بند تھے۔ کھڑکیوں سے دور تک خزاں کی شام کی بھوری اور سرمئی دھند چھائی ہوئی تھی اور پانی رم جھم رم جھم برس رہا تھا۔ تندور کے سیاہ دھانے کے سامنے ایک بنچ پر تسیگا نوک بیٹھا تھا اور غیر معمولی طور پر اداس اور خاموش نظر آ رہا تھا۔ میرے نانا کونے میں رکھے ہوئے ایک ٹب کے نزدیک کھڑے ہوئے، اس میں سے پانی میں بھیگی ہوئی بیدیں نکال کر ناپ جوکھ کے ایک جگہ اکٹھی کرتے جا رہے تھے اور اکثر بیدوں کو زور سے ہوا میں گھماتے جس سے شائیں شائیں آواز نکلتی۔ میری نانی کسی کونے میں اندھیرے میں کھڑی تھی، بار بار زور سے نسوار لیتیں اور بڑبڑاتی جاتیں:

''اس کو مزہ آتا ہے اس میں، ظالم کہیں کا۔''

یاکوف ماموں والا ساشا باورچی خانے کے بیچوں بیچ ایک کرسی پر بیٹھا تھا، مٹھیوں سے اپنی آنکھ ملتا جاتا اور اس طرح روتا جاتا جیسے کوئی بڈھا فقیر ہو:

''معاف کر دو، یسو مسیح کے واسطے مجھے معاف کر دو۔''

میخائل ماموں کا ساشا اور اس کی بہن، کھمبوں کی طرح ساکت، کرسی کی دوسری طرف کھڑے تھے۔

''ہاں ہاں معاف تو کر ہی دوں گا۔ مگر تم پہلے اپنا ناشتہ تو کر لو'' میرے نانا نے جواب دیا اور ایک لمبی بھیگی ہوئی بید کو اپنی ہتھیلی پر کھینچتے ہوئے بولے۔ ''اچھا، پتلون اتارو۔''

وہ بڑے سکون کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آواز آتی رہی۔ بے قرار قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔ لیکن ان آوازوں سے وہ سناٹا کم نہ ہوا، وہ ناقابل فراموش سناٹا اور وحشت جو اس وقت اس اندھیرے، نیچی چھت والے، دھویں سے تاریک باورچی خانے پر چھائی ہوئی تھی۔

ساشا اٹھا، پتلون کھول کر گھٹنوں پر لٹکا دئے اور جھک کے لڑکھڑاتا ہوا بنچ کی طرف بڑھا۔ اس کو دیکھ کر کس قدر وحشت ہوتی تھی۔ میرے اپنے گھٹنے کانپنے لگے اور اس سے بھی بدتر کیفیت اس وقت ہوئی جب وہ نہایت بودے پن کے ساتھ اوندھے منہ بنچ پر لیٹ گیا اور وانیا نے اس کو گردن اور بغلوں کے پاس ایک لمبی تولیہ سے باندھ دیا اور پھر جھک کر اسے ٹخنوں کے پاس سے پکڑ لیا۔

میرے نانا چلائے:

''الیکسئی! یہاں آؤ، قریب!.. میں کس سے کہہ رہا ہوں؟ دیکھو یہ مطلب ہوتا ہے ''دھلائی'' کا۔ اچھی طرح دیکھ لو، سمجھے!''

پھر انہوں نے اپنا ہاتھ گھمایا، شائیں کی آواز آئی اور بید ساشا کے ننگے جسم پر پڑی۔ اس نے زور کی چیخ ماری۔

''ابے بن مت۔ ابھی کہاں پڑی ہے!'' نانا نے کہا۔

انہوں نے پھر ایک سڑاکا دیا جس سے فوراً ہی پیٹھ سرخ ہوگئی اور ایک بڑی سی بدھی پڑ گئی۔ ساشا زور زور سے چیخنے لگا۔

''ہوں۔ نہیں آیا مزہ؟ یہ ہے انگشتانے کا مزہ!''

جب بھی وہ اپنا ہاتھ اونچا کرتے تو اس کے ساتھ ساتھ میرے سینے میں کچھ اوپر کو اٹھنے لگتا اور جب ہاتھ گرتا تو ایسا لگتا کہ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اوندھے منہ گر پڑا۔

ساشا باریک آواز میں زور زور سے چلا رہا تھا اور اس کی آواز سن سن کر دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''اب نہیں کروں گا... ارے اب نہیں... میں نے تو آپ کو وہ میز پوش کا قصہ بتایا تھا... ایک تو میں نے آپ کو بتایا...''

''کہنے سننے سے تمہاری جان نہیں بچ سکتی! لگائی بجھائی کرنے والے تو پہلے پٹتے ہیں۔ چل بے لے اب میز پوش کا مزا...''

''میری نانی نے جھپٹ کر مجھے گود میں سمیٹ لیا۔

''تم الیکسٹی کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔ میں تمہیں نہیں مارنے دوں گی، ظالم بے درد!''

اور وہ زور سے دروازہ پر لاتیں مار مار کے چلانے لگیں: ''روارا، روارا!''

میرے نانا لپکے، نانی کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا کے ان کو گرا دیا، مجھے دبوچا اور بنچ کی طرف دھکیلا۔ میں ان کے بازوؤں میں تڑپا، ان کی سرخ داڑھی نوچ لی اور ان کی انگلی میں کاٹ کھایا۔ وہ زور سے گرجے اور مجھے دبوچ کے بھینچتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے مجھ کو بنچ پر اس زور سے گرا دیا کہ میرا منہ بنچ سے ٹکرا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت وہ کتنی زور سے چلا رہے تھے:

''باندھو اسے! میں اسے مار ڈالوں گا!''

اور مجھے اپنی ماں کا ستا ہو چہرہ یاد ہے اور خوف سے پھیلی ہوئی اور ان کی کٹوراسی آنکھیں۔ وہ بیچ کے آس پاس بیقراری سے دوڑ رہی تھیں:

''ابا جانے دیجئے..! ابا چھوڑ دیجئے...''

میرے نانا نے مجھے اتنا مارا کہ میں بے حوش ہو گیا۔ اس کے بعد میں کئی دن تک بیمار رہا۔ میں اوندھے منہ ایک چوڑے، نرم گرم بستر پر لٹا دیا گیا تھا جس چھوٹے کمرے میں یہ پلنگ تھا اس میں صرف ایک کھڑکی تھی، کونے میں مقدس شبیہوں کے سامنے چھوٹا سا سرخ چراغ مستقل جلتا رہتا تھا۔

بیماری کے یہ دن میری زندگی کے اہم دن تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان چند دنوں میں میری عمر یکا یک بڑھ گئی اور مجھ میں ایک خاص صفت یہ پیدا ہو گئی کہ مجھے ان تمام انسانوں کے دکھ کا گہرا احساس پیدا ہو گیا، جیسے میرے دل کو کسی نے چھیل کر رکھ دیا ہو اور وہ ہر اپنے پرائے دکھ کو اپنانے کے لئے زیادہ حساس ہو گیا ہو۔

سب سے پہلے تو مجھے اس لڑائی سے بے حد صدمہ پہونچا جو میری ماں اور نانی کے درمیان ہوئی۔ جیسے ہی میں اس چھوٹے سے کمرے میں پہونچایا گیا، میری لمبی چوڑی سانولی نانی میری ماں پر پل پڑیں۔ میری ماں پیچھے ہٹتے ہٹتے اس کونے میں پہونچ گئیں جہاں مقدس شبیہیں رکھی تھیں۔

''ارے، تو نے اسے کیوں نہیں چھینا؟ ہیں؟ ہیں؟''

''مجھے ڈر لگ رہا تھا۔''

''اتنی لمبی چوڑی اور ڈر لگ رہا تھا۔ ڈوب مر۔ شرم کر و روارا! میں تو بڑھیا تھی پھر بھی نہیں ڈری! ڈوب مر!''

''اچھا اب میری جان چھوڑ دو اماں۔ میں خود ہی اپنی جان سے عاجز ہوں...''

''ارے تجھے اس کی محبت ہی نہیں ہے۔ اس غریب بیکس یتیم پر ترس نہ آیا تھے۔''

''میں خود ہی یتیم ہوں۔ جنم جنم کو یتیم ہوں'' میری ماں نے ایک دردناک آواز میں سے کہا۔ پھر دونوں ایک کونے میں پڑے ہوئے ٹرنک پر بیٹھ گئیں اور ایک ساتھ رونا شروع کر دیا۔

''اگر الیکسئی نہ ہوتا تو میں کہیں نکل جاتی، کہیں دور اپنا منہ کالا کرتی'' میری ماں کہہ رہی تھیں۔ ''میں

اس جہنم میں نہیں رہ سکتی، نہیں رہ سکتی! امی اب مجھ میں بالکل دم نہیں...''

''آہ میری بچی، میرے کلیجے کا ٹکڑا، میری دل وجان'' نانی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔

اب مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ میری ماں دراصل کچھ ایسی مضبوط نہ تھیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرح میرے نانا سے ڈرتی تھیں۔ اور میں اس بات کا ذمہ دار تھا کہ وہ یہاں اس گھر میں رہنے پر مجبور ہوں جہاں رہنا ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد میری ماں غائب ہو گئیں، یہ کہہ کر کہ کہیں کسی سے ملنے جا رہی ہیں۔

ایک دن میرے نانا یکا یک مجھے سے ملنے آ گئے۔ ایسا لگا جیسے وہ چھت میں سے کہیں سے ٹپک پڑے ہوں۔ وہ پٹی پر بیٹھ گئے اور اپنی برف سے ٹھنڈی انگلیاں میرے سر پر پھیرنے لگے۔

'' کیسے ہو جوان؟ کیا حال چال ہے؟ جواب دو نا...! میری طرف سے دل میں شکایت نہ رکھو۔ ہاں، تو پھر کیا بات ہے؟''

میرا دل چاہا ان کو ایک لات رسید کر دوں۔ لیکن ہلنے جلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ نانا کے بال پہلے سے زیادہ سرخ نظر آ رہے تھے، ان کی بے قرار نگاہیں دیواروں کا جائزہ لے رہی تھیں اور سر برابر ہلتا جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی جیب سے کھجور کے آٹے کی بنی ہوئی ایک بکری نکالی، مٹھائی کے دو بگلے نکالے، ایک سیب اور تھوڑی سی کشمش اوان چیزوں کو تکیئے کے پاس میری ناک کے بالکل قریب رکھ دیا۔

''لو بھئی۔ ہم تمہارے لئے کچھ تحفے لائے ہیں۔''

پھر وہ جھکے، میرے ماتھے پر پیار کیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ ان کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے اور بہت کھردرے اور سخت تھے، رنگ کے اثر سے بالکل پیلے اور یہ رنگ ان کے ٹیڑھے میڑھے پرندوں جیسے ناخنوں کے پاس خاص طور پر نمایاں تھا۔

''اب کی بار تمہیں اپنے حصے سے ذرا زیادہ ہی مل گئی بیٹے! مجھے پر جیسے کچھ پاگل پن سوار ہو گیا تھا۔ لیکن تم نے بھی تو مجھ کو کاٹا اور نوچا تو اس سے میرا غصہ اور بھی قابو کے باہر ہو گیا۔ لیکن اس مرتبہ اتنی پڑ گئی تو کوئی ایسی بری بات بھی نہیں ہوئی۔ آئندہ کبھی موقع ہوا تو یہ زیادہ حساب میں جوڑ لی جائے گی۔ بس ایک بات یاد رکھو کہ جب تمہارے اپنے تمہیں مارتے ہیں تو یہ کوئی بگڑنے کی بات نہیں۔ اس سے سبق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن کسی دوسرے کو یہ موقع نہ دینا کہ تمہیں ہاتھ لگائے۔ صرف اپنے عزیزوں کو۔ کیونکہ ان کا

حساب کتاب بھلا! تم کیا سمجھتے ہو، ہم نے اپنے زمانے میں اپنے حصے کی بہت بھگتی ہے۔ ہم جس طرح سے پیٹے جاتے تھے وہ تمہارے خواب وخیال میں بھی نہیں آ سکتا! الیوشا! مجھے کو تو اس بری طرح پیٹا جاتا تھا کہ اگر خود خدا بھی دیکھتا تو آنسو بہانے لگتا۔ لیکن اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔ اب مجھے دیکھو! میں یتیم تھا، میری ماں بھیک منگنی تھی لیکن اب میں ایک پوری دوکان کا مالک ہوں، میرے نوکر چاکر ہیں جن سے میں رغب کے ساتھ کام لیتا ہوں!''

وہ مجھ سے اور قریب آتے چلے گئے۔ ان کا دبلا سڈول جسم مجھ پر جھکتا چلا گیا اور وہ مجھے اپنے بچپن کے بارے میں بتانے لگے۔ آہستہ آہستہ، وہ اپنے سخت الفاظ کو ایک کے بعد ایک زبان سے نکالتے۔ ان کی سبز آنکھوں میں چمک آ گئی تھی اور سر کے جھٹکے کے ساتھ بالوں کی سرخی میں سنہرا پن جھلملاتا نظر آ رہا تھا۔ میرے منہ کے نزدیک اپنا منہ لا کر وہ اپنی باتیں اڑا رہے تھے:

''تم یہاں اسٹیمر پر بیٹھ کر آئے تھے نا، بھاپ کی قوت تمہیں یہاں تک اٹھا کر لائی۔ لیکن جب میں چھوٹا تھا تو والگا پر میں اپنی طاقت سے کشتیاں کھینچتا تھا۔ کشتی پانی میں ہوتی تھی، ہم کنارے پر ہوتے تھے، ننگے پاؤں، پتھروں اور چٹانوں پر قدم رکھتے، صبح سورج نکلنے سے لے کر رات کے تارے نکلنے تک ہم کشتیوں کو چالو رکھتے تھے۔ کبھی کبھی سورج کی تپش اتنی تیز ہوتی تھی کہ بھیجا ہنڈیا کی طرح کھد بد کھد بد پکنے لگتا تھا، کمر کمان کی طرح جھکائے، ہڈیاں چٹخنے لگتی تھیں۔ دل فریاد کرتا تھا، لب فریاد کرتے تھے۔ اہ الیوشا! تم کو بھلا کیا دکھ ہے! پھر اس وقت چلتے رہنا ہوتا تھا یہاں تک کہ تھک کر طاقت کر کی طنابیں ٹوٹ جاتی تھیں، رسیاں چھوٹ جاتیں اور ہم اوندھے منہ گر پڑتے۔ اس وقت اتنی خوشی ضرور ہوتی تھی کہ چلو اب ذرہ برابر بھی دم باقی نہیں ہے اور جہاں تک اٹھا سکتے تھے مشقت اٹھائی! اور پھر اسی حالت میں پڑے رہتے یہاں تک کہ یا تو مر جاتے یا پھر چل پڑتے۔ اور ان دونوں میں کوئی خاص فرق بھی نہیں تھا۔ ہمارا خدا اور ہمارا مہربان یسوع مسیح اس بات کا گواہ ہے کہ ہم اس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے! ہم نے پوری والگا کو تین دفعہ اس طرح ناپا ہے۔ سمبرسک سے لے کر ریبنسک تک، سارا توف سے لے کر یہاں تک اور استراخان سے لے کر مکاریف تک، جب میلہ لگا کرتا تھا۔ اور اس کے معنی ہیں کہ میں نے اس طرح کئی ہزار میل طے کئے ہیں۔ لیکن چوتھے سال مجھ کو ایک نیا کام دے دیا گیا۔ میرا کام جہاز سے پانی پھینکنے والوں کا تھا، کیونکہ مالک پر یہ ثابت ہو گیا تھا کہ میں ایک غیر معمولی آدمی ہوں۔''

جیسے جیسے وہ بات کرتے جاتے مجھے ایسا لگتا کہ وہ بادل کی طرح پھیلتے جا رہے ہیں۔ ایک دبلے پتلے سوکھے سہمے آدمی کے بجائے وہ ایک ایسے زبردست ہیرو لگنے لگے جس کی بہادری کی زبردست داستانیں ہوں اور جو ایک ہاتھ سے بڑی سے بڑی کشتی اٹھا کر دریائے والگا کے مخالف بہاؤ پر پھینک سکتا ہو۔

بات کرتے کرتے وہ پلنگ پر سے اچھل پڑتے اور یہ دکھاتے کہ کشتی کھینچنے والے مزدوروں پر جب ساز کس دیا جاتا تھا تو وہ کس طرح قدم اٹھاتے تھے اور کس طرح پانی نکالتے تھے۔ کبھی بھاری دردناک آواز میں کوئی ایسا گانا گاتے جو میں نے کبھی نہیں سنا تھا، دریائے والگا پر کشتیاں کھینچنے والوں کا گانا۔ پھر ایک دم سے جوانوں کی طرح اچھل کر میرے پلنگ پر آ بیٹھتے۔ اس وقت وہ ایک عجیب وغریب ہستی لگ رہے تھے اور ان کی آواز برابر گہری اور گہری ہوتی جا رہی تھی اور انداز ایسا ہو گیا تھا کہ ان کی سب باتوں پر یقین آتا جاتا تھا۔

''مگر الیکسئی! اتنی محنت اور مصیبت کے ساتھ بھی۔ وہ کیا ہی دن تھے! گرمیوں کی شام ہوتی، ژیگولی پہاڑوں کی سرزمین ہوتی اور ہم اپنا پڑاؤ ڈالتے، کسی سرسبز پہاڑ کے نیچے الاؤ جمتا۔ آہ وہ دن! وہ بیتے ہوئے دن، الیکسئی! الاؤ پر دلیہ پکتا رہتا اور کوئی کشتی کھینچنے والا بانکا اپنے دل کی گہرائیوں سے کوئی درد بھرا گیت شروع کرتا اور پھر ہم سب اس میں شریک ہو جاتے۔ لیکن تم یہ گیت سنو تو تمہارا رواں رواں کھڑا ہو جائے ہمارے گیت سن کر خود والگا کی رفتار بڑھ جاتی تھی جیسے کوئی منہ زور گھوڑا ہو جو اپنی تیزی کی دھن میں آسمان کی سرحدوں کو چھو لینے کے لئے تڑپتا ہوا سرپٹ اڑا جا رہا ہو! اس وقت ہماری ساری کلفت اس طرح دھل جاتی تھی جیسے باد تند کے آگے مٹھی بھر خاک۔ ہم اپنے گانے میں ایسے محو ہو جاتے کہ دلئے کا خیال بھی ہمارے ذہن سے اتر جاتا۔ یہاں تک کہ دیگچی چھنچھنانے لگتی اور پھر تو پکانے والے کو خوب چپتیں پڑتیں ''تجھے گانا گانے کو کوئی منع نہیں کرتا لیکن اپنے کام کا بھی تو دھیان رکھ!''

کئی بار لوگوں نے دروازے سے نانا کو بلایا لیکن میں ہر بار ان کو روک لیتا:

''ابھی نہیں! ابھی نہ جایئے نانا۔''

وہ ہنستے اور ہاتھ ہلا کر زور سے آواز دیتے:

''آرے ہیں، آرہے ہیں۔ کہو ذرا ٹھہریں۔''

اور وہ مجھ سے قصے کہتے رہے یہاں تک کہ شام ہوگئی، پھر انہوں نے مجھے بڑی محبت سے خدا حافظ کہا اور چلے گئے۔ تب مجھے یہ معلوم ہوا کہ نانا ابا نہ تو کمینے ہیں اور خطرناک۔ اگرچہ یہ یاد کر کے دل دکھتا تھا کہ انہوں نے ہی مجھ کو اتنی بے دردی سے پیٹا تھا۔

نانا کے آنے کے بعد پھر اوروں کے لئے راستہ کھل گیا اور صبح سے شام تک کوئی نہ کوئی میرے پلنگ کے پاس بیٹھا رہتا اور ہر ممکن کوشش کی جاتی کہ میں خوش رہوں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ کوششیں ہمیشہ کامیاب نہ ہوتیں۔ نانی اماں سب سے زیادہ میرے پاس آتی رہتی تھیں بلکہ میرے ہی پاس سوتی بھی تھیں۔ لیکن جس شخص نے میرے ذہن پر سب سے گہرا اثر چھوڑا وہ تھا تسیگا نوک۔ وہ شام کو آیا کرتا تھا۔ بھاری بھرکم، چوڑے کندھے، بڑا سا سر جس پر سیاہ گھنگھریالے بالوں کا ڈھیر تھا۔ وہ اپنا اتوار کو پہننے والا جوڑا پہنے رہتا تھا۔ شہد کے رنگ کی ریشمی قمیص، چوڑی مہری کا اطلسی پتلون اور جوتے جو چوں چوں بولتے ہوئے ایسے لگتے تھے جیسے اس کے گھٹنوں میں باجہ بندھا ہو۔ اس کے بال خوب چمکتے تھے، گھنی بھوؤں کے نیچے سے ترچھی آنکھیں ہمیشہ مسرت سے بھری نظر آتی تھیں، نئی نویلی مونچھوں کی سیاہ لکیر کے نیچے سے سفید سفید دانت جھلکا کرتے تھے۔ اس کی قمیص خوب جھلملایا کرتی اور اس میں شبیہوں کے پاس رکھی ہوئی روشنی کی نرم پرچھائیاں چمکتی نظر آتیں۔

''دیکھو، یہ دیکھو!'' اس نے اپنی آستین چڑھا کر اپنے بازو کو ننگا کر دیا اور اس پر سرخ سرخ بدھیوں کا جال سا بچھا ہوا نظر آیا۔ ''دیکھو کیسی سوجی ہوئی لگتی ہیں نا۔ لیکن اب تو یہ بہتر ہوگئی ہیں ورنہ اس سے بھی بدتر لگتی تھیں۔ بات یہ ہے کہ مجھ کو یہ نظر آ رہا تھا کہ تمہارے نانا غصے میں ہوش حواس تو بالکل کھو چکے ہیں، کہیں تمہارا دم نہ نکال دیں مارتے مارتے۔ تو میں نے اپنا بازو بید کے نیچے رکھ دیا تھا کہ شاید بید ٹوٹ جائے تو اچھا ہو اور پھر جب تک تمہارے نانا دوسری بید تلاش کریں تمہاری ماں یا نانی تم کو کھینچ نکالیں۔ مگر وہ کم بخت ٹوٹی ہی نہیں، بہت اچھی طرح بھگوئی ہوئی تھی نا۔ بہرحال تم کچھ سڑاکوں سے تو بچ ہی گئے! دیکھو اتنے بہت سوں سے! میں بڑا چلتا ہوا آدمی ہوں۔ ہیں نا؟''

وہ آہستہ سے بڑے ریشمی انداز میں ہنسنے لگا، پھر اپنی سوجی ہوئی بانہہ کی طرف دیکھ کر بولو:

''افوہ! مجھے تمہارے اوپر اتنا ترس آ رہا تھا کہ میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا انجام برا ہوگا لیکن وہ مارتے ہی چلے جا رہے تھے، مارتے ہی چلے جا رہے تھے...''

وہ گھوڑے کی طرح فوں فوں کرنے لگا اور سر ہلا کر کچھ اس معصوم اور طفلانہ انداز میں میرے نانا کا ذکر کرنے لگا کہ مجھے اس سے فوراً ہمدردی ہوگئی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں اور اس نے بھی ایسی سادگی سے اس بات کا جواب دیا جیسے میں کبھی نہ بھول سکوں گا:

''میں بھی تمہیں چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں نے یہ درد اپنے اوپر لے لیا۔ تمہاری محبت میں! کیا سمجھتے ہو، میں کسی اور کے لئے بھلا ایسا کر سکتا تھا؟ میں تھوکتا بھی نہیں کسی پر! سمجھ میں آیا؟''

پھر دروازے کی طرف ذرا محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے نصیحت کرنے لگا:

''دیکھو، اب کے پٹائی ہو تو اکڑنا بالکل مت۔ سن رہے ہو؟ اگر بید پڑتے وقت انسان اکڑ جائے تو چوٹ دگنی لگتی ہے۔ جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دینا چاہئے تاکہ بالکل نرم ہو جائے حلوے کی طرح۔ اور سانس کبھی نہ روکو، خوب سانس لو جتنا بن پڑے اور پھیپھڑوں کا سارا زور لگا کے چیخو! یاد رکھنا۔ سمجھے؟''

''تو اور کیا خیال ہے؟'' تسیگانوک نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ضرور ماریں گے۔ ابھی تو جانے کتنی بار مار پڑے گی۔''

مگر کیوں؟''

''فکر نہ کرو، تمہارے نانا خود ہی کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیں گے۔''

اور پھر وہ مجھے بڑی توجہ کے ساتھ مار کھانے کی ٹکنیک سکھانے لگا:

''اور اگر وہ برابر سیدھے سیدھے مارتے جائیں نا تو تم بس اسی طرح لیٹے رہو، جسم کو ڈھیلا چھوڑے، بے حس و حرکت! لیکن اگر وہ بید مار کر بید کو اپنی طرف گھسیٹیں کہ تمہارا چمڑا اس کے ساتھ ادھڑتا چلا آئے تو یہ کرنا چاہئے کہ ان ہی کی طرف لوٹ جاؤ۔ یعنی جدھر بید اٹھ رہی ہو، سنا؟ اس طرح ذرا ٹھیک رہتا ہے۔''

اس نے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری:

''جہاں تک پٹائی کا سوال ہے میری معلومات پولیس والوں سے بھی زیادہ ہیں کیونکہ میں تو پٹائی میں اپنا اتنا چمڑا ادھڑوا چکا ہوں کہ جوڑا جائے تو ایک عدد پتلون تیار ہو جائے۔''

جب میں اس کے مسرت سیکھلے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا مجھے وہ کہانیاں یاد آئیں جو نانی اماں نے مجھے سنائی تھیں۔ ایوان شہزادے اور ایوانوشکا مسخرے کی کہانیاں۔

3

جب میں اچھا ہو گیا تو مجھ پر یہ کھلا کہ تسیگا نوک کو ہمارے گھر میں کافی عزت حاصل تھی۔ میرے نانا اس پر کبھی اس طرح خفا نہیں ہوتے تھے اور اس سختی سے اس سے پیش نہیں آتے تھے، جس سختی سے وہ میرے ماموؤں سے پیش آیا کرتے تھے۔ جب کبھی اس کی پیٹھ پیچھے اس کے متعلق بات کرتے تو آنکھیں مار کے اور سر ہلا ہلا کر کہتے:

''ارے یہ ایوان شیطان کہیں کا۔ اس کی انگلیاں تو سونے کی ہیں، سونے کی۔ میری بات یاد رکھنا، یہ اس خاندان میں جو پل رہا ہے یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔''

میرے ماموؤں کی بھی تسیگا نوک سے دوستی تھی اور وہ اس کے ساتھ اس طرح کی شرارتیں کبھی نہیں کرتے تھے جیسی وہ بڑے مستری جی گریگوری کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ قریب قریب ہر شام وہ کوئی کمینی قسم کی شرارت سوچ کر مستری گریگوری کو پریشان کرتے تھے۔ کبھی ان کی قینچی کے دستے کو آگ میں تپا دیتے، کبھی ان کی کرسی میں پن لگا دیتے یا مختلف رنگوں کے ٹکڑے ان کے سلائی کے ٹکڑوں میں ملا دیتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بینائی کی کمزوری کی وجہ سے وہ ان سب کو ملا ملا کر سی دیتے اور پھر ان پر میرے نانا کی خوب ڈانٹ پڑتی۔

ایک بار کھانے کے بعد مستری جی باورچی خانے میں تندور کے اوپر والے تختے سے لگ کر سو گئے تو ان لوگوں نے ان کے چہرے پر عنابی رنگ پوت دیا اور وہ بڑی دیر تک یوں ہی مضحکہ خیز اور بھیانک شکل بنائے گھومتے رہے۔ لمبی، سرخ ناک عینک کے سیاہ شیشوں کے بیچ میں اس طرح لٹک رہی تھی جیسے زبان ہو اور سفید داڑھی کے پس منظر میں عینک کے دونوں شیشے دھندلے دھندلے چمک رہے تھے۔

میرے ماموؤں کی شرارتوں کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا تھا لیکن مستری جی بیچارے ایک لفظ کہے بغیر یہ سب کچھ برداشت کر لیتے تھے۔ بس ذرا سا بڑبڑاتے اور رہ جاتے البتہ اتنی احتیاط کرنے لگے تھے کہ چمٹا یا انگشتانہ یا قینچی پکڑنے سے پہلے اپنے ہاتھ پر خوب تھوک لگا لیتے تھے۔ اور اب یہ عادت اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ کھانا کھانے بیٹھتے تو چھری یا کانٹا اٹھانے سے پہلے بھی ہاتھ پر تھوک لیتے جس سے سب بچوں کو خوب مذاق اڑانے کا موقع ہاتھ آتا۔ جب انہیں کوئی دکھ ہوتا تو ان کے چوڑے چکلے چہرے پر سکڑن کی

لہریں سی بننے لگتیں جو ایک عجیب طریقے سے ماتھے تک پہونچتیں۔ وہ بار بار اپنی بھویں اٹھاتے اور وہ لہریں ان کے گنجے سر میں غائب ہوتی جاتیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ ان شرارتوں کے متعلق میرے نانا کا کیا خیال تھا لیکن میری نانی ہمیشہ ان لوگوں کی طرف مکا تان کر کہتیں:

''بے شرم شیطانو! ظالمو، بے دودو تم!''

تسیگانوک کے پیٹھ پیچھے میرے ماموں اس کے متعلق کمینہ پن کے ساتھ بات کرتے اور طنز سے اس کا ذکر کرتے، اس کے کام میں عیب نکالتے اور اسے نکما اور چوٹا کہتے۔

میں نے ایک دفعہ اپنی نانی سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

''وہ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کی خواہش ہے کہ تسیگانوک میری دوکان میں کام کرے'' نانی نے بہت صاف اور سیدھا سادے ڈھنگ سے جواب دیا۔''اس لئے یہ ایک دوسرے کے سامنے اس کی برائی کرتے رہتے ہیں''ذرا دیکھو۔ کتنا برا کاریگر ہے''۔ کمینے، چالاک ہیں نا! لیکن ڈر دونوں کو یہ ہے کہ وانیا ان میں سے کسی بھی دوکان پر کام نہیں کرے گا بلکہ تمہارے نانا کے پاس رہے گا۔ اور تمہارے نانا اپنی مرضی کے مختار ٹھہرے۔ وہ یہ چاہیں گے کہ وانیا کے ساتھ مل کر ایک تیسری دوکان کھولیں۔ اور یہ بات تمہارے ماموؤں کے حق میں بہت بری ہوگی۔ سمجھے؟''

''وہ ہنسنے لگیں:

''جیسی چال یہ لوگ چل رہے ہیں نا، اس پر تو خدا کو بھی ہنسی آتی ہوگی۔ اور تمہارے نانا ان کی چالاکی کیوں کو دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں اور پھر جان بوجھ کر ان کو چھیڑتے ہیں۔ کہتے ہیں''میں وانیا کے لئے ایک رنگروٹی کا سرٹیفکٹ خریدوں گا تاکہ لوگ اسے فوج میں نہ لے جاسکیں۔ اس کے بغیر میرا کام نہیں چل سکتا۔'' اب یہ سب وہ سنتے ہیں تو اور کا دماغ خراب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ یہ نہیں چاہتے۔ روپئے کی بھی ان کو فکر ہے۔ رنگروٹی کا سرٹیفکٹ کافی مہنگا ہوتا ہے۔''

میرا اور نانی اماں کا پھر اسی طرح سے ساتھ ہوگیا جس طرح اسٹیمر پر ہوا تھا۔ روز رات کو سونے سے پہلے وہ مجھے پریوں کی کہانیاں سنایا کرتیں یا اپنی زندگی کے واقعات جو پریوں کی کہانیوں ہی کی طرح دلچسپ ہوتے۔ لیکن جب کبھی وہ گھر کے روزمرہ کے مسائل پر بات کرتیں۔ جیسے میرے نانا کی جائداد کی

تقسیم میرے نانا کا ایک نیا مکان خریدنے کا ارادہ۔ تو پھر وہ بڑے طنز سے باتیں جیسے ان کا دل سب باتوں سے کھٹا ہو گیا اور وہ اس گھر کی بڑی ہونے کے بجائے کوئی پڑوسن ہوں۔

نانی اماں ہی سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ تسیگا نوک لے پالک تھا۔ ایک رات جب موسم بہار کا آغاز تھا اور بارش ہو رہی تھی تو ہمارے گھر والوں نے اسے پھاٹک کے پاس ایک بنڈل میں لپٹا ہوا بنچ پر پڑا پایا تھا۔

میری نانی نے مجھے بتایا:

''بس وہ وہاں پڑا تھا۔ ایک چادر میں لپٹا سردی سے ایسا جکڑا ہوا کہ آنکھیں تک نہیں کھل رہی تھیں۔''

''لوگ اپنے بچوں کو کیوں پھینک دیتے ہیں؟''

''ارے بیٹا، جب ماں کے پاس نہ دودھ ہو نہ پیسے کہ اپنے بچوں کچھ کھلا سکے تو پھر وہ کوئی ایسا گھرانا تلاش کرتی ہے جہاں کوئی ننھا بچہ اسی وقت پیدا ہو کر مرا ہو اور اپنے بچے کو لیجا کر اس کی جگہ رکھ دیتی ہے۔''

وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے ایک پل کے لئے رکیں۔

''یہ سب غریبی کے کھیل ہیں الیوشا'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بعض لوگ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ بس کچھ مت پوچھو۔ اور یہ بھی ایک شرم کی بات ہے کہ کسی کنواری کے بچہ ہو جائے! تمہارے نانا تو کہنے لگے کہ وانیا کو پولیس میں دیا جائے پر میں نے بات بنا کر ان کو راضی کر لیا۔ میں نے کہا ''نہیں۔ ہم ہی جو پال لیں گے اسے۔ خدا نے اسے ہمارے مرے ہوئے بچوں کے عوض میں بھیجا ہے۔'' بیٹا! میں نے اس دنیا میں اٹھارہ جانوں کو جنم دیا ہے۔ اگر جیتے رہتے تو اٹھارہ گھر بستے۔ ایک پوری گلی کی گلی آباد ہو جاتی۔ دیکھو میں چودہ برس کی تھی جب تو میری شادی کر دی گئی، پوری پندرہ کی بھی نہیں تھی کہ بچہ پیدا ہو گیا۔ لیکن میری کوکھ سے پیدا ہونے والے خدا کو اتنے پیارے تھے۔ کہ خدا نے ان کو اپنے پاس بلا لیا اور ان کو اپنا فرشتہ بنا لیا۔ ہائے کتنی خوشی ہوتی تھی اور پھر کتنا دکھ ہوتا تھا!''

وہ اپنا نائٹ گاؤں پہنے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی کنگھی کر رہی تھیں۔ ان کا سارا جسم بالوں سے ڈھکا ہوا

تھا۔اوراپنے بھاری بھرکم جسم کی وجہ سے وہ اس ریچھنی کی طرح لگ رہی تھیں جوایک کسان ابھی حال ہی میں سرگاچ کے جنگلوں سے پکڑ کر ہمارے احاطے میں لایا تھا۔

''تو خدا نے میرے سب اچھے پھلوں کو مجھ سے لے لیا، بس لے لیا اس نے اور بدترین کو میرے حوالے کر دیا'' وہ ہنسنے لگیں اور اپنے سفید چٹے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔''جب وانیا مجھے ملا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔اصل میں مجھے تمہارے ایسے چھوٹے بچوں سے بہت ہی پیار ہے۔میں نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا اور پھر اس کا بپتسما کروایا اور اب دیکھو وہ کیسا گبرو جوان نکلا ہے۔پہلے میں اس کو مکھی کہتی تھی، کیونکہ وہ بس ہر وقت بھن بھن کیا کرتا تھا۔ادھر لوٹتا، ادھر لوٹتا اور بس بھن بھن کرتا رہتا۔الیکسئی تم اس سے ضرور پیار کرنا، سیدھا بچہ ہے!''

مجھے سچ مچ وانیا سے بہت پیار ہو گیا تھا اور اس کے کمالات پر تو میں حیران ہو کر خاموش رہ جاتا تھا۔

سنیچر کے دن جب نانا ابا ان بچوں کو مار پیٹ چکتے جنہوں نے اس ہفتے کوئی گناہ کیا ہوتا تو وہ رات کی عبارت کے لئے گرجے کی طرف نکل جاتے اور پھر باورچی خانے میں ایک ایسی زندگی شروع ہوتی جس کی دلچسپی ناقابل بیان ہوتی۔تسیگانوک تندور کے پیچھے سے دو چار تل چٹے پکڑ لیتا، کاغذ کی گاڑی بناتا، دھاگے کی اس میں لگامیں لگاتا اور چاروں مشکی گھوڑوں کی گاڑی صاف ستھرے زرد چکنے میز پر ادھر سے ادھر دوڑتی پھرتی۔اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی ہوتی جس سے وہ گاڑی کو ہنکاتا اور بڑے جوش میں زور زور سے پکارتا جاتا:

''ہٹ جاؤ۔ہٹ جاؤ۔بڑے پادری صاحب کو لینے جا رہی ہے سواری!''

ایک اور تل چٹے کی پیٹھ پر وہ کاغذ کا ایک ننھا سا ٹکڑا لگا دیتا اور اسے گاڑی کے پیچھے دوڑاتا:

''لو بھئی وہ اپنا بستہ بھول گئے تو یہ چھوٹے راہب صاحب بستہ لئے دوڑے جا رہے ہیں۔''

ایک اور تل چٹے کی ٹانگیں باندھ دیتا۔وہ بیچارہ لنگڑا لنگڑا کے چلتا، لڑکھڑاتا، مٹکتا، گھسٹتا اور وانیا بڑے مزے میں زور زور سے تالی پیٹتا:

''لو بھئی یہ راھب صاحب نکلے شراب خانے سے اور چلے رات کی نماز پڑھانے۔''

کبھی کبھی وہ ہم لوگوں کو اپنے چوہوں کا تماشا دکھاتا۔اس کے چوہے خوب سدھے ہوئے تھے۔وہ جب چاہتا ان کو پچھلی ٹانگوں پر کھڑا کر دیتا۔اور جب وہ اس طرح کھڑے ہو کر چلتے تو ان کی لمبی لمبی پتلی

پتلی دمیں ان کے پیچھے پیچھے گھسٹتی جاتیں اور چھوٹی چھوٹی موتی سی آنکھیں بار بار جھپکتی ہوئی بڑی مضحکہ خیز لگتیں۔ وہ اپنے چوہوں سے بڑے شفقت سے پیش آتا تھا، انہیں اپنے کوٹ کے گریبان کے اندر لئے پھرتا اور اپنی زبان پر شکر رکھ کر کھلایا کرتا، ان کو پیار کرتا اور بڑے یقین اور اعتبار کے ساتھ کہتا:

''چوہا نہایت عقل مند دوست ہوتا ہے اور محبت شعار بھی۔ پریزادلوگ جو ہوتے ہیں وہ چوہوں کو بہت پسند کرتے ہیں اور جو چوہوں کو کھلائے پلائے اس سے بہت خوش رہتے ہیں۔''

تسیگا نوک کو تاش کے پتوں اور سکوں سے بہت سے کرتب کرنے آتے تھے، چیخنے اور شور مچانے پر آتا تو بچوں سے بھی بازی لے جاتا اور اس وقت اس میں اور ننھے بچوں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ ایک دن وہ بچوں کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ اس میں مسلسل کئی بار ''گدھا'' بننا پڑا تو بہت خفا ہوا اور منہ پھلا، کھیل

چھوڑ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بعد میں اس نے بہت پھنپھنا کر مجھ سے شکایت کی:

''سب بناوٹی کھیل تھا۔ مجھے سب پتہ ہے۔ ایک دوسرے کو آنکھ مارتے تھے وہ لوگ اور میز کے نیچے ہاتھ ڈال ڈال کر پتے بدل لیتے تھے۔ یہ بھلا کھیل ہوا؟ ویسے بے ایمانی کرنا چاہتا تو میں بھی کر سکتا تھا۔''

تسیگا نوک کی عمر انیس سال تھی لیکن وہ اتنا لمبا چوڑا تھا کہ ہم چاروں میرے ممیرے بھائی بہن ملائے جاتے تب بھی وہ بڑا نکلتا۔

اس کی ایک بات بہت اچھی طرح سے میرے ذہن پر نقش ہے۔ جب چھٹیوں کی کسی شام کو میرے نانا اور میخائل ماموں باہر کسی سے ملنے چلے جاتے تھے تو یا کوف ماموں اپنے گھنگھریالے بال بکھیرے، اپنا چھتارا لئے باورچی خانے میں آجاتے اور نانی اماں میز پر کھانے پینے کی چیزیں سجا دیتیں۔ کھانے کو بہت سی چیزیں بنے ہوئے تھے اور ایک سبز جگ میں سے جس کی تہہ میں لال پھول بنے ہوئے تھے واد کا انڈیلی جاتی۔ تسیگا نوک اتوار کے کپڑے پہنے پھرکی کی طرح ادھر ادھر مٹکتا پھرتا۔ مستری گریگوری آہستہ ہلتے ڈولتے پہونچتیں۔ ان کے چہرے پر ماتا کے داغ تھے، وہ مٹکے کی طرح گول مول تھیں، بھاری آواز ننھی ننھی تیز آنکھیں۔ کبھی اوسپینسکی گرجا کے گیسو دراز پادری صاحب بھی آکے شریک ہو جاتے اور کچھ اور لوگ بھی، سانولے رنگ، چکنے مکنے جو دیکھنے میں مچھلیوں کی طرح لگتے۔

ہر شخص خوب جی بھر کر کھاتا، جی بھر کر پیتا اور گہری گہری ٹھنڈی سانسیں لیتا جاتا۔ بچوں کی بھی تواضع ہوتی اور ان کو ان کا حصہ ملتا۔ چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں میٹھی شربا۔ اور پھر رفتہ رفتہ ایک عجیب ترنگ کی سی کیفیت پیدا ہونے لگتی۔

یاکوف ماموں محبت بھرے ہاتھ سے اپنے چھتارے کو الٹتے پلٹتے اور بار بار وہی ایک بات کہتے جاتے:

''لو بھئی تیار ہو جاؤ۔ اب میں شروع ہوتا ہوں۔''

سر کو جھٹکا دے کر وہ بالوں کے ڈھیر کو پیچھے پھینکتے، ساز پر جھک جاتے اور راج ہنس کی طرح کو گردن بڑھاتے۔ ان کے گول بے فکر چہرے پر ایک خواب کی سی کیفیت چھا جاتی، آنکھوں میں ایک چمکنی چمک دار سی دھند آ جاتی۔ دھیمے سے وہ ساز کے تاروں کو چھوتے جاتے۔ اور پھر ایک ایسی دھن بجانے لگتے جو لوگوں میں آگ لگا دیتی۔

ان کی موسیقی کا تقاضہ تھا کہ بالکل خاموشی ہو جائے۔ وہ اس طرح بڑھتی تھی جیسے دور کہیں کوئی چشمہ ابل رہا ہو، پھر جیسے موسیقی دیواروں اور فرش اور چھت سے پھوٹنے لگتی تھی اور دل میں ایک عجیب سے غمناک بیقراری ابھار دیتی تھی۔ انسان کو اپنے سارے دکھوں کا احساس ہونے لگتا تھا اور دوسروں کے دکھوں کا بھی۔ بڑوں پر یہ اثر ہوتا کہ وہ بھی بچے بن جاتے اور ہر شخص ساکت بیٹھا رہتا تھا۔ مکمل خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔

میخائل ماموں والا ساشا خاص طور پر بڑے غور سے سنتا تھا۔ وہ اپنا پورا جسم اپنے چچا کی طرف جھکا دیتا، آنکھیں چھتارے پر جم جاتیں، منہ کھلا ہوتا اور منہ کے کونوں سے رال ٹپکتی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اتنا محو ہو جاتا کہ کرسی سے پھسل پڑتا مگر ایسے موقع پر بھی جہاں وہ گرتا وہیں چاروں ہاتھ پاؤں کے بل رکا رہتا، آنکھیں اسی طرح چھتارے پر جمی رہتیں۔

موسیقی کے افسوں سے ہر شخص سانس روکے بیٹھا رہتا۔ صرف سماوار مدہم مدہم گنگناتا رہتا لیکن اس سے ہماری محویت میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ خزاں کی رات چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کو گھورتی رہتی تھی، کبھی کبھی کوئی آتا تو آہستہ سے کھڑکی کے شیشوں پر دستک دیتا۔ میز پر دو شمعیں جلتی رہتیں اور ان کے زرد پیکان کے سے نوکدار شعلے تھرتھراتے رہتے۔

یاکوف ماموں بےخودی کے عالم میں اور کھوتے جاتے۔ان کے دانت بھنچ جاتے اور ایسا لگتا کہ گہری نیند سو رہے ہیں۔لیکن ان کے ہاتھوں میں ایک اور ہی زندگی کی لہر بڑھتی جاتی۔ان کے داہنے ہاتھ کی بل کھاتی ہوئی انگلیاں ساز کے تھرتھراتے ہوئے تاروں کو چھیڑ رہی تھی اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں پرندے کی طرح تاروں پر دوڑ رہی تھیں۔

جب وہ ایک دو جام پی چکتے تو گانا شروع کرتے۔ان کی آواز ناگوار سی لگتی تھی جیسے وہ سسکیاں بھر بھر کے رو رہے ہوں:

یاکوف میاں پلے کی طرح گریوں روتے جائیں گے۔
ہمسائے بیچارے چین سے پھر کاہے کو سونے پائیں گے
او...وو و پروردگار عالم!
او...وو و مرا ناک میں ہو گیا دم!
وہ دیکھو ادھر گلی میں نن ایک بیچاری آتی ہے
اور کاؤں کاؤں اک
کوے کی، اس کی چاپ سے تال ملاتی ہے
اک جھینگر اوٹ میں چولھے کی، مدہم سر میں کچھ گاتا ہے
اور دور کہیں پیڑوں تلے، مینڈک کوئی ٹراتا ہے
او...وو و، مرا ناک میں ہو گیا دم
دھوپ میں ڈالی اپنی نیکر ایک کسی بھک منگے نے
آتے جاتے اس کو چرایا جانے کس رہ چلتے نے
او...وو و مرا ناک میں ہو گیا دم
بالکل ناک میں ہو گیا دم
او...وو و پروردگار عالم

مجھ سے یہ گانا بالکل برداشت نہیں ہوتا تھا۔اور جب میرے ماموں فقیروں کا ذکر کرتے تو میرے دل کو کسی طرح صبر نہ آتا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

تسیگا نوک بھی اوروں کی طرح موسیقی بڑی توجہ سے سنتا، اپنے گھنگھریالے بالوں کے گچھوں میں وہ اپنی انگلیاں پھنسا لیتا اور زور زور سے سانس لیتا ہوا ایک طرف کو کونے میں گھورنے لگتا۔ کبھی کبھی وہ بڑے درد بھرے انداز میں کہتا:

''آہ، کاش خدا نے مجھے آواز دی ہوتی! تو میں کیا گاتا! کیا ہی گاتا!''

''اچھا اب زیادہ کچوکے نہ لگاؤ یاکوف!'' میری نانی ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں ''چلو اٹھو، ایک ناچ ہو جائے وانیا...''

نانی اماں کی بات ہمیشہ تو نہیں پوری کی جاتی تھی لیکن بعض بعض وقت ساز نواز ایک پل کے لئے زور سے تاروں پر جھکتا، مٹھیاں بھینچتا اور ایک وحشت کے عالم میں جیسے ایک چیز زمین پر پٹختا۔ ایک ایسی چیز جو خاموش اور ساکت ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ پھر وہ شہدوں کی طرح زور سے چلاتا:

''بس۔ ختم کرو اس اداسی کو! کھڑے ہو جاؤ وانیا!''

وانیا اس طرح کھڑا ہو جاتا جیسے پر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا ہو، اپنی زرد قمیص کو کھینچ کو سیدھی کرتا اور یوں چلتا ہوا کمرے کے بیچوں آ کھڑا ہوتا جیسے شیشے پر چل رہا ہو۔ پھر ذرا جھینپتا ہوا، شرماتا ہوا بڑی لجاحت سے کہتا:

''یاکوف، ذرا تیزی سے!''

چھتارے سے تیز گتیں پھوٹنے لگتیں، فرش پر تسیگا نوک کے پیر تال دینے لگتے، میز اور الماری پر برتن کھڑکنے لگتے اور تسیگا نوک پھرکی کی طرح کمرے کے بیچوں بیچ چکر کاٹنے لگتا۔ ایک بڑی سی پر پھیلائے ہوئے چڑیا کی طرح وہ ادھر ادھر جھکتا اور اپنے شہپر کے سے بازو ہلاتا ہوا اپنے پیروں کو اتنی تیزی سے حرکت دیتا کہ نگاہیں ان پر جم نہیں سکتی تھیں۔ ایک دم سے وہ اکڑوں بیٹھ جاتا اور سونے کے لٹو کی طرح گول گول چکرانے لگتا۔ اس کی ریشمی قمیص کی چھوٹ کپکپی اور تھرتھراہٹ شعلہ کی مانند دمکتی اور تمام چیزوں پر روشنی چھٹکتی جاتی۔

تسیگا نوک کبھی ناچتے نہیں تھکتا تھا۔ اور ناچتے بالکل بے خود ہو جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اگر دروازہ کھول دیا جائے تو وہ ناچتے گلی میں نکل جائے، وہاں سے شہر میں اور پھر وہاں سے ہوتا ہوا کسی نامعلوم دیس کی طرف...

''مڑ جاؤ، مڑ جاؤ'' یا کوف ماموں چیخے اور برابر پاؤں سے تال دیتے گئے۔

اورانہوں نے زور کی سیٹی بجائی اور اپنی ناگوار آواز میں شعر پڑھا:

آہ ماں! اگر مجھے اپنے جوتوں کا خیال نہ ہوتا

تو کب کا بیوی بچے چھوڑ نو دو گیارہ ہو گیا ہوتا

میز پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی مزے میں آ گئے، کبھی چلاتے، کبھی سیٹی بجاتے، کبھی ''آئی'' ''اوئی'' کرتے جیسے ان کو کوئی گرم لوھے سے داغ رہا ہو۔ بوڑھے مستری جی اپنی صاف چندیا پر انگلیوں سے تال دے رہے تھے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے جاتے تھے۔

ایک بار وہ بالکل مجھ پر جھک پڑے، لمبی داڑھی میرے کندھوں پر چھا گئی، دھیمے سے اس طرح مجھ سے بولے جیسے میں کوئی بڑا بوڑھا ہوں:

''اگر تمہارے باپ یہاں ہوتے الیکسئی، تو ہوتو اور کمال دکھاتے، وہ بڑے خوش باش آدمی تھے۔ یاد ہیں؟''

''نہیں۔''

''آہ! بس ان کی تو تمہاری نانی خوب نبھتی تھی... ٹھہرو۔ ایک منٹ ٹھہرو۔''

مستری گریگوری کھڑے ہو گئے۔ لمبا قد، دبلا پتلا جسم، لمبے جیسے کوئی ولی اللہ ہو۔ پھر وہ میری نانی کے سامنے جھکے اور غیر معمولی جذباتی آواز میں بولے:

''اکولینا ایوانووِنا، ذرا ہم لوگوں کو ایک ناچ دکھاؤ۔ جیسا تم میکسم سواتیوچ کے ساتھ ناچتی تھیں نا... آؤ، آؤ، نا۔ مہربانی کرے کے!''

''ارے کیا کہہ رہے ہو گریگوری؟ ذرا ہوش کو دوا کرو۔ ارے توبہ میں مر جاؤں؟ نانی پیچھے کھسکتی ہوئی ہنسنے لگیں۔ ''میں ناچوں؟ کیا لوگوں کو مجھے پر ہنسوانا ہے؟''

لیکن پھر ہر شخص نے ان سے اصرار کرنا شروع کر دیا۔ اور یکا یک وہ کسی دوشیزہ کی طرح اٹھ کھڑی ہوئیں، اپنا لہنگا وغیرہ ٹھیک کیا، سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا اور جیسے بہتی ہوئی نکل کھڑی ہوئیں۔

''اگر لوگ ہنسنا چاہتے ہیں تو ہنسیں! چلو یا کوف! گت تال ٹھیک ہوئیں۔

'میرے ماموں بھی پیچھے کو ہو بیٹھے، اپنے پاؤں پھیلا لئے، آنکھیں ذرا بند کر لیں اور ایک مدہم سی

تان بجانی شروع کی۔تسیگا نوک ایک لمحہ کے لئے رک گیا، پھر اچھلا اور مارے خوشی کے نانی اماں کے چاروں طرف کودنے لگا۔ وہ بالکل خاموشی سے فرش پر اس طرح قدم اٹھا رہی تھیں اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کہیں دور خلا میں جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بڑی مضحکہ خیز معلوم ہو رہی ہیں اور میں نے ''کھی'' سے کیا ہی تھا کہ مستری گریگوری نے مجھ کو انگلی دکھائی اور سب بڑے غصے سے گھورنے لگے۔

''ہٹ ایوان'' مستری گریگوری ہنس کے بولے۔ایوان بڑی سعادت مندی سے ہٹ گیا اور ایک کونے میں جا کے بیٹھ گیا۔ایوگینیا بوانے گال پھلائے اور بڑی ہی نفیس اور گہری آواز میں گانا شروع کیا:

لڑکی ایک پاؤں پر ناچتی رہی
پورے سات دن کام کرتی رہی
ہائے کام کے بوجھ سے
وہ تو مرتے مرتے بچی

نانی اماں کا ناچ ناچ تو لگتا ہی نہیں تھا۔ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کوئی کہانی کہہ رہی ہیں۔کبھی ان کی رفتار مدھم ہو جاتی، کبھی ایک طرف کو جھکتیں، کبھی دوسری طرف کو کبھی اٹھے ہوئے ہاتھ کے نیچے سے جھانکتیں۔ بڑی احتیاط سے رک رک کے قدم اٹھاتیں۔پھر یکا یک تھم، جاتیں جیسے ڈر گئی ہوں، چہرے پر بل پڑ جاتے، تھرتھری طاری ہو جاتی۔ ایک دم سے ان کے چہرے پر ایک شفیق دوستانہ گھلاوٹ والی مسکراہٹ کی روشنی دمکنے لگتی، اچھل کر وہ ایک طرف کہ ہو جاتیں جیسے سب کو ٹھیل کر کسی کے آنے کے لئے جگہ بنا رہی ہوں۔ پھر سر جھکائے خاموش کھڑی ہو جاتیں جیسے بڑے غور سے کوئی آہٹ سن رہی ہوں۔ اور ان کے چہرے پر خوشی کی روشنی جھلملانے لگتی۔ یکا یک پھر تیزی سے رقص کرنے لگتیں، گول گول پھرتے ہوئے وہ اتنی سیدھی اور سرو قد لگتیں، ویسی تو عام پر کبھی نہ لگتی تھیں۔اور اس کیفیت میں ان پر جوانی لوٹ آتی اور اس قدر دلکش و دلربا دکھائی دیتیں کہ ان پر سے نظریں ہٹانا ناممکن ہوتا۔

اس دوران میں ایوگینیا بوا بگل کی طرح گلا پھاڑتی رہتیں۔

اتوار کو دن سے رات تک
ناچتی رہی وہ، ناچتی رہی وہ
سڑک سے وہ سب سے آخر میں لوٹی،

ہائے چھٹی کا دن کس طرح گزر گیا پلک جھپکتے

جب رقص ختم ہو جاتا تو نانی اماں سماوار کے پاس اپنی جگہ پر جا بیٹھتیں۔ سب ان کی تعریفیں کرتے پر وہ بڑی خاکساری کے انداز میں برا مانتیں:

''اچھا، اچھا۔ بس ہوا، بس ہوا۔ تم نے کبھی سچ مچ کسی رقاص کو دیکھا ہو تو جانو'' وہ اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتے ہوئے کہتیں۔ ''جہاں ہم رہتے تھے نا بالاخنا میں تو وہاں ایک لڑکی رہتی تھی۔ لو میں اس کا نام بھی بھول گئی، یہ بھی بھول گئی کس کی تھی۔ وہ ایسا ناچتی تھی کہ مارے خوشی کے لوگوں کی آنکھوں سے آنسو چھلک چھلک پڑتے تھے۔ اس کو دیکھنا ہی بس جشن سے کم نہ تھا۔ پھر کسی اور بات کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ تبھی مجھے اس سے بڑی جلن ہوتی تھی۔ مجھ گنہ گار کو!''

ایوگینیا بوآ کر کہتیں'' گانے اور ناچنے والوں ہی سے دنیا کا مزا ہے جیسے کھانے کا نمک سے'' اور پھر وہ حضرت داؤد کے متعلق کوئی گانا شروع کر دیتیں۔

یاکوف ماموں تسیگانوک کے گلے میں باہیں ڈالتے۔ ''ارے تجھے تو کسی شراب خانے میں رقاص کی جگہ ملنی چاہئے۔ ایسا لوگوں کا جی خوش کرے گا کہ کیا کہنا!..''

''ارے نہیں'' تسیگانوک شکوہ آمیز لہجے میں کہتا ''میرا تو دراصل گانے کو جی چاہتا ہے، کاش خدا مجھے آواز بخش دیتا تو دس برس بغیر رکے گاتا جاتا۔ پھر چاہے میرا جو کچھ حشر ہوتا۔ چاہے میں پھر خانقاہ کا راہب ہی کیوں نہ بن جاتا!''

سب لوگ خوب واد کا چڑھاتے، خاص طور پر مستری گریگوری۔ نانی اماں ان کو گلاس پر گلاس انڈیل کر دیتی جاتیں اور کہتی جاتیں:

''دیکھو گریگوری، ذرا طبیعت کو روک کے! نہیں تو بالکل اندھے ہو جاؤ گے۔ خاک نہیں سوجھے گا۔''

''تو پھر کیا ہوا'' وہ جواب دیتے۔ ''مجھے اب دیدوں کی کیا پڑی ہے! جو کچھ دیکھنا چاہتا تھا دیکھ چکا...''

وہ کبھی مدہوش نہیں ہوتے تھے لیکن جیسے جیسے پیتے جاتے، بات کی رفتار بڑھتی جاتی۔ مجھ سے سارے وقت میرے باپ کے متعلق باتیں کرتے رہتے:

''اھا۔کیا فراخ دل آدمی تھا وہ۔ہاں ہاں وہ تھا بس۔میرا اچھا دوست میکسم...''

نانی اماں ٹھنڈی سانس بھر کر ان سے اتفاق کرتیں ''ارے ہاں۔وہ تو بڑا اللہ والا آدمی تھا...''

مجھے یہ سب باتیں بڑی اچھی لگتی تھیں اور دل سرخوشی اور شوق سے لبریز ہو جاتا اور اس فضا سے خوشی کے ساتھ ساتھ غم آمیزی بھی پیدا ہوتی، ایک اداسی بھی چھا جاتی۔سب کے دلوں میں خوشی اور دکھ کا احساس ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا جیسے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے الگ نہ ہو سکتی ہوں اور بڑی تیزی تیزی سے بار بار ایک دوسرے کی جگہ لیتی رہتی ہوں۔

ایک بار یاکوف ماموں کچھ ایسے مدھوش ہوئے کہ وہ اپنا گریبان پھاڑنے لگے، اپنے گھنگھریالے بال نوچنے لگے، اپنی بے رنگ مونچھیں، ناک اور لب کھینچنے لگے۔

''ہائے ہائے، کیوں؟ ارے کیوں؟'' وہ زور زور سے روتے اور آنسو بہتے جاتے۔''ہائے ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے؟''

روتے روتے وہ اپنے گالوں پر، بھوؤں پر، سینے پر مکے مارتے جاتے: ''ہائے میں کتنا نالائق ہوں، کتا برا! میرا کہیں ٹھکانہ نہیں...''

''آہ!'' مستری جی چیختے۔''یہ بات، یہ بات ہے!..''

''بس ہوا یاکوف'' نانی اماں بھی نشے میں کچھ کھوئی ہوئی اپنے بیٹے کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہتیں۔ ''خدائے رحیم و کریم ہمیں جس حال میں رکھے اس کی مصلحت ہے۔''

تھوڑا سا پی لینے کے بعد نانی اماں اور بھی خوب ہو جاتی تھیں۔ان کی مسکراتی ہوئی سیاہ آنکھیں ہر شخص پر گرمجوشی کا نور برسانے لگتیں، گنگناتی ہوئی آواز میں اپنے آپ کو رومال سے پنکھا جھلتے ہوئے کہتیں:

''ارے خدا! آہ اے ذرا۔کس قدر اچھا ہے یہ سب! ارے دیکھو تو سہی کس قدر اچھا ہے یہ سب!''

دراصل یہی ان کی دل کی پکار تھی۔یہی ان کی زندگی کا نعرہ تھا۔

جب مجھے اس بات پر حیرانی ہوتی کہ میرے بے فکرے ماموں کیوں اس طرح سے روتے اور اپنے آپ کو مکے مارنے لگتے ہیں تو میری نانی ہچکچا کے بڑبڑانے کے انداز میں کہتیں:

''ارے بیٹا، تجھے تو سب معلوم ہونا ہی ہے! بس ذرا صبر کر۔ابھی تیرے دن نہیں ہیں کہ ہر بات

میں اپنی ٹانگ اڑاتا پھر...''

اس بات سے میری کرید اور بڑھ جاتی تھی۔ میں کارخانے میں گھس جاتا اور ایوان سے طرح طرح کے سوالات کرتا۔ مگر وہ بھی ہمیشہ میری بات کا گول مول جواب دیتا۔ دبی سی ہنسی ہنس دیتا مستری جی کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا اور مجھے دوکان کے باہر ٹھیل دیتا:

''بس بس بہت ہوا۔ بھاگو یہاں سے نہیں تو انہیں ناندوں میں سے کسی میں ڈبودوں گا! پھر نکلو گے رنگے ہوئے۔ کھسکو یہاں سے!''

مستری جی ایک چولھے کے آگے کھڑے تھے جس پر تین ناندین بنی ہوئی تھیں۔ وہ ان میں سے ایک میں بھرے ہوئے رنگ کو ایک سیاہ بانس سے چلا رہے تھے اور کبھی کبھی رنگ میں پڑے ہوئے کپڑے کو بانس پر نکال کر دیکھتے اور پانی کے باہر نکلے نچڑے ہوئے کپڑے کو دیکھ کر رنگ کا اندازکرتے۔ ان کے چمکتے ہوئے چمڑے کے پچرنگے اپرن میں آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کا عکس اس طرح دکھائی دیتا تھا جیسے کسی پادری کی کارچوبی عبا ہو۔ ناندوں میں رنگین پانی کھل کھل، کھل کھل ابل رہا تھا اور کڑوی بھاپ کے بادل دھوئیں کی طرح دروازے سے نکل نکل کر باہر ٹھنڈے صحن میں پہونچ رہے تھے۔

مستری نے عینک کے پیچھے سے اپنی سرخ اور دھندلی آنکھوں سے مجھے غور سے دیکھا، پھر ایوان سے بولے:

''ابے تجھے دکھائی نہیں دیتا کہ مجھے اور لکڑیوں کے کی ضرورت ہے؟''

جب تسیگانوک صحن کی طرف دوڑا تو وہ صندل کی ایک بوری پر بیٹھ گئے اور مجھے اشارہ کیا:

''یہاں آؤ۔''

انہوں نے مجھے اپنے گھٹنوں پر بٹھالیا، ان کی نرم گرم داڑھی میرے گالوں سے چھونے لگی اور پھر انہوں نے مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو میں کبھی بھول نہیں سکوں گا:

''تمہارے ماموں نے اپنی بیوی کو مارتے مارتے مار ڈالا اور اب اس کا ضمیر اسے چین نہیں لینے دیتا۔ سمجھے؟ تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم کو یہ سب باتیں بتائی جائیں۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ورنہ یہاں بہت مصیبت میں پھنسو گے۔''

نانی اماں کی طرح مستری گریگوری سے بھی باتیں کرنا آسان تھا لیکن مجھے ان کی باتوں سے خوف

سا لگتا کیونکہ ایسا لگتا تھا کہ جہاں انہوں نے اپنی سیاہ عینک کے نیچے سے دیکھا اور بس ہر چیز کی حقیقت ان پر کھل گئی۔

''اور یہ پوچھو بھلا کیسے مار ڈالا؟'' وہ آہستہ آہستہ کہتے رہے ''اس طرح کہ وہ بستر میں اس کے ساتھ لیٹتا اور پھر اس کو لحاف سے ڈھک، اس کی خوب دھنائی کرتا، خوب کوٹتا اسے! کیوں؟ یہ بات تو اسے خود بھی معلوم نہیں تھی کہ کیوں؟''

اتنے میں ایوان لکڑی کا ایک گٹھا لئے اندر آ گیا اور آگ کے سامنے پھسکڑا مارے بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھ سینکنے لگا۔ لیکن گریگوری اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور اپنی بات بڑے موثر لہجے میں کہتے رہے:

''ممکن ہے وہ اس کو اس لئے مارتا رہا ہو کہ وہ اس سے اچھی تھی اور وہ اس سے جلتا تھا۔ یہ کاشیرین خاندان والے کوئی اچھی چیز دیکھ ہی نہیں سکتے، سمجھے بیٹے۔ ہر اچھائی سے وہ جلتے ہیں۔ لیکن وہ اچھائی اپنے میں پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس کا صفایا ہی کر دیتے ہیں۔ تم ذرا اپنی نانی سے پوچھو ان لوگوں نے کیسے تمہارے باپ کی زندگی میں زہر گھولا۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دیں گی۔ وہ جھوٹ نہیں برداشت کر سکتیں۔ کہ لوگ کچھ ان کے پلے نہیں پڑتے۔ یہ تمہاری نانی تو بس ایک طرح کی ولی ہیں۔ کبھی کبھی تھوڑی سی پی لیتی ہیں یا نسوار لیتی ہیں تو اس سے کیا۔ بڑی پاک باز عورت ہیں۔ تم ان کی قدر کرنا بیٹا...''

انہوں نے مجھے پرے ہٹا دیا اور میں باہر احاطے میں چلا گیا، حیران اور سہما ہوا۔ ڈیوڑھی تک پہونچتے پہونچتے مجھے وانیا نے جا لیا۔

''ان سے ڈرنا مت، وہ بڑے بھلے آدمی ہیں'' اس نے میرے کان میں چپکے سے کہا۔ ''اس کی آنکھ ڈال کر دیکھ، وہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔''

ہر چیز عجیب و غریب طریقے سے بوکھلا دینے والی تھی۔ مجھے کسی اور زندگی کا پتہ نہیں تھا لیکن پھر بھی کچھ کچھ یاد تھا کہ میری ماں اور میرے باپ اس طرح تو نہیں رہتے تھے وہ تو اور ہی طرح سے بات کرتے، ان کی اور ہی دلچسپیاں تھیں، ساتھ اٹھتے بیٹھتے، ساتھ نکلتے گھومتے، ساتھ، ایک ساتھ۔ شام کو وہ کھڑکی پر بیٹھ کر گاتے، دل کھول کر دیر تک ہنستے رہتے۔ ان کی بات سننے کو، انہیں دیکھنے کو تو پڑوسی تک جمع ہو جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ان پڑوسیوں کے اوپر اٹھے ہوئے چہروں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ کھانے کی جھوٹی

رکابیوں کا خیال آتا۔ یہاں اس کے بالکل برعکس لوگ کبھی کبھار ہی ہنستے تھے اور جب ہنستے تو یہ بھی ٹھیک سے نہ کہا جا سکتا کہ ہنس کس بات پر رہے ہیں۔ ہر وقت ایک دوسرے پر چلاتے رہتے، ایک دوسرے کو دھمکاتے رہتے اور کونے میں کانا پھوسی کیا کرتے۔ بچے ہر وقت خاموش رہتے جیسے ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو، ہر وقت سہمے سہمے۔ جیسے بارش سے گرد بیٹھ جاتی ہے۔ میں اپنے کو اس گھر میں بالکل اجنبی محسوس کرتا اور میرے چاروں طرف کی زندگی جیسے ہر وقت ہزاروں سوئیاں چبھوتی رہتی۔ ہر وقت میرے کان کھڑے رہتے اور میں ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتا۔

ایوان سے میری دوستی بڑھ گئی۔ دن نکلنے سے لے کر رات گئے تک نانی گھر کے دھندوں میں پھنسی رہتیں اور میں دن بھر تسیگا نوک کے پیچھے پیچھے لگا رہتا۔ جب کبھی میرے نانا میرے پٹائی کرتے تو تسیگا نوک اپنے بازوؤں سے بچھاتا اور پھر بعد کو اپنی سوجی ہوئی انگلیاں مجھے دکھاتا اور کہتا جاتا:

''کیا تک ہے آخر اس کا! تم کو تو کوئی فائدہ ہوتا نہیں اور مجھے یہ ملتا ہے۔ دیکھو! اور اب بس ہو چکا۔ اب سے جو تم پر پڑے وہ اپنا بھگتنا!''

لیکن دوسری مرتبہ وہ پھر سے خواہ مخواہ کی سزا بھگت لیتا۔

''تم نے تو کہا تھا اب نہیں بھگتو گے؟''

''کہنا اور کرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مجھے خود ہی پتہ نہیں کہ کیا ہو گیا۔''

جلد ہی مجھے ایوان کے متعلق کچھ اور باتیں معلوم ہوئیں جن سے میرے دل میں اس کی محبت، احترام اور دلچسپی اور بڑھ گئی۔

میرے نانا کا ایک کمیت گھوڑا تھا، بے حد شریر اور میٹھی چیزیں کھانے کا شوقین۔ نانی اس گھوڑے پر جان دیتی تھیں۔ تسیگا نوک ہر جمعے کو اس پر ساز کستا، اسے ایک بڑی سے گاڑی میں جوتتا، خود ایک بڑی ٹوپی پہنتا، چمڑے کا اٹنگا کوٹ پہنتا، کمر میں سبز رنگ کی پیٹی کستا اور ہفتے بھر کا سامان لانے کے لئے بازار جاتا۔ کبھی کبھی اس کو گئے بہت دیر ہو جاتی تو سب لوگ گھبرانا شروع کرتے۔ ہر شخص باری باری سے جا کر کھڑکی کے پالے سے دھندلائے شیشوں کو پھونک مار مار کے صاف کرتا اور باہر کی طرف جھانکتا۔ باقی لوگ پوچھتے:

''آ رہا ہے؟''

''ابھی تو نہیں۔''

سب سے زیادہ نانی اماں پریشان ہوتیں۔

''ہائے ہائے میں مرجاؤں'' وہ اپنے شوہر اور بیٹوں سے کہتیں۔''ارے تم لوگ ایک اچھے انسان اور ایک اچھے گھوڑے کی جان لے کر ہی رہو گے! ارے تمہارا ضمیر مر گیا ہے۔ بے شرمو! لالچی خاندان احمق قبیلہ! خدا تم سے سمجھے!''

میرے نانا ابروؤں پر بل ڈال کر بڑبڑاتے:

''اچھا بھئی اچھا۔اب کے بعد پھر کبھی...''

بعض اوقات تسیگا نوک دوپہر ڈھلے لوٹتا۔ میرے نانا اور ماموں اس کو لینے صحن تک دوڑتے، پیچھے پیچھے نانی اماں ہوتیں۔ ریچھ کی طرح بھدا بھدکرتی، نسوار سونگھتی۔ نہ جانے کیوں ایسے موقع پر وہ ہمیشہ گڑبڑا جاتی تھیں۔ بچے بھی دوڑتے ہوئے آجاتے اور پھر سامان اتروانے کا دلچسپ کام شروع ہوتا۔ گاڑی بھری ہوئی ہوتی تھی۔ تازہ مارا ہوا شکار کا گوشت، پورے پورے سور، مچھلی اور باقی ہر قسم کے گوشت کے مختلف ٹکڑے۔

نانا ابا اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے گاڑی میں بھری ہوئی ہر چیز کو دیکھتے جاتے:

''کیوں، جو کچھ کہا تھا وہ سب لے آئے نا؟''

ایوان خوشی خوشی گاڑی سے نیچے کودتا اور دستانوں میں چھپے ہوئے ہاتھوں کو اور گرم کرنے کے لئے زور زور سے ملتے ہوئے کہتا:

''جی ہاں، جی ہاں۔ ہر چیز جیسے آپ نے کہی تھی ویسے ہی۔''

''انہہ مت رگڑو دستانوں کو ان میں پیسے لگتے ہیں مفت نہیں آتے'' نانا ابا سختی سے چیختے۔''کچھ پیسے بچے؟''

''نہیں۔''

نانا آہستہ آہستہ گاڑی کے چاروں طرف گھومتے جاتے اور بڑبڑاتے جاتے:

''لگتا ہے پھر وہی بے تحاشا بھر لائے ہو سب چیز۔ مگر یہ خیال رکھا کرو کہ پیسہ دئے بغیر کچھ نہ لینا کبھی۔ میرے گھر میں نہیں چلے گا۔ سمجھے؟''

اور وہ منہ بنائے ہوئے وہاں سے کھسک جاتے۔

پھر میرے ماموؤں کی بن آتی۔ خوشی کے مارے وہ گاڑی پر ٹوٹ پڑتے اور مرغیوں، مچھلیوں، ران کے گوشت اور دوسرے گوشت کے ٹکڑوں کے وزن اور قیمت کا اندازہ کرتے۔

''بھئی چیزیں تو خوب چھانٹ کے خریدی ہیں'' وہ کہتے اور داد دینے کے انداز میں کبھی چیختے، کبھی سیٹی بجانے لگتے۔

خاص طور پر میخائل ماموں تو بس وجد میں آجاتے اور اس طرح گاڑی کے چاروں طرف اچھلنے لگتے جیسے ان کے پیروں میں اسپرنگ لگا ہو۔ ہدہد کی طرح وہ اپنی ناک بڑھا بڑھا کر ہر چیز کو سونگھتے، اپنے ہونٹ چاٹتے جاتے اور ان کی بیقرار آنکھیں بار بار سکڑ جاتیں۔ وہ میرے نانا کی طرح سوکھے سہمے تھے اور خانہ بدوشوں کی سی سانولی رنگت پائی تھی۔ اپنی آستینوں میں اپنے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ گھسا کے پوچھتے:

''کہو۔ بڑے میاں نے کتنے روپئے دئے تھے؟''

''پانچ روبل۔''

''لیکن یہ سامان تو کم از کم پندرہ روبل کا ہوگا۔ تو ہاں خرچ کتنے ہوئے؟''

''چار روبل دس کوپک۔''

''ہوں تو یوں کہو کہ نوے کوپک تم نے اپنی جیب میں رکھے۔ کیوں؟ سنو یاکوف، ایسے پیدا ہوتا ہے پیسہ؟''

یاکوف ماموں خالی قمیص پہنے سردی میں ٹھٹھرتے، کہر بھرے نیلے آسمان کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے چپکے چپکے ہنسنے لگتے اور سانس کھینچ کر کہتے:

''تو پھر پلاتے ہو ہم لوگوں کو ایک پوا۔ کیوں وانیا۔''

نانی اماں گھوڑے کا ساز کھولتیں۔

''کیوں میری جان! کیا ہوا؟ کیا ہوا ہے تجھے؟ کیا بات ہے؟ میری بلی! کھیلے گا؟ اچھا کھیل، کھیل لے ہاں۔ تھوڑا سا کھیلنے میں کیا ہرج ہے! تھوڑی تفریح میں خدا کا کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے...''

لمبا چوڑا گھوڑا اپنی ایال کو زور سے جھٹکتا، بڑے بڑے دانتوں سے نانی اماں کے کندھے کھجلانے لگتا، ان کے سر پر رکھا ہوا ریشمی رومال گھسیٹ لیتا، مسرت بھری نظروں سے ان کے چہرے کو دیکھتا اور

اپنی پلکوں پر سے جمی ہوئی برف گراتے ہوئے آہستہ آہستہ ہنہنا تا جاتا۔

''ارے تو تو روٹی کھائے گا؟ روٹی چاہئے؟'' نانی اماں کہتیں اور ایک خوب سنکی ہوئی خوب نمکین روٹی کا بڑا سا ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونستیں۔ وہ کھاتا جاتا اور نانی اس کے منہ کے نیچے اپنا اپرن پھیلائے کھڑی رہتیں اور اسے کھاتے دیکھتیں۔

''نانی اماں یہ بڑا ہی حسین گھوڑا ہے! اتنا تیز ہے کہ بس ہی بس۔''

''اب دیکھو، نانا ابا اس کو پانچ کا نوٹ دیتے ہیں'' وہ منہ بنا کے کہتیں۔ ''تو یہ تین روبل خرچ کرتا ہے اور دس روبل کا سامان لے آتا ہے دوکانداروں کی نظریں بچا کے۔ اسے چوری کرنے میں مزہ آتا ہے۔ بے ایمان کہیں کا! بس ایک دفعہ ایسی چال چلی ہوگی۔ وہ کامیاب ہوگئی۔ یہاں گھر میں بھی سب لوگ خوب ہنسے اور خوب تعریف کی۔ تو بس اب عادت ڈال لی کمبخت نے! اصل میں تمہارے نانا نے چھٹپن میں اتنی غریبی بھگتی ہے کہ اب وہ روپئے کو دانتوں سے پکڑتے ہیں۔ انہیں اپنے بچوں سے زیادہ روپئے کا خیال رہتا ہے۔ کوئی چیز مفت مل جائے تو بس خوش ہیں۔ اور میخائل اور یاکوف کا جہاں تک سوال ہے، وہ تو...'' انہوں نے بس ایک ہاتھ کا اشارہ کر کے ان کا ذکر ختم کر دینا کافی سمجھا۔

''بس نہ پوچھو بیٹا الیوشا کہ کیا الجھاؤ ہے، جیسے کوئی خوبصورت بیل بنتے بنتے دھاگا الجھ گیا ہو'' وہ اپنی نسوار کی ڈبیہ میں جھانکتی ہوئی کہتیں۔ ''جیسے کسی اندھی پھوس بڑھیا نے سارا نمونہ غلط ڈال دیا ہو۔ اب اگر تمہاری سمجھ میں اس کا سر پیر نہیں آتا تو کیا تعجب کی بات ہے! لیکن ایک مرتبہ بھی اگر لوگوں نے وانیا کو چوری کرتے پکڑ لیا تو مارتے مارتے اس کو مار ہی ڈالیں گے۔''

وہ ذرا دیر کو خاموش ہوگئیں اور پھر جو انہوں نے بات کرنی شروع کی تو ان کی آواز بہت مدہم ہوگئی:

''ہائے افسوس! ہم لوگوں نے قاعدے تو بہت سے بنا رکھے ہیں لیکن ان قاعدوں میں سچائی کہاں ہے جو وہ چلیں!''

دوسرے دن میں تسیگانوک کی خوشامد کی کہ چوری کرنا چھوڑ دے:

''وہ لوگ تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔''

''پکڑ چکے مجھکو۔ میں صاف نکل جاؤں گا۔ میں بہت چالاک ہوں اور میرا گھوڑا اتنا تیز دوڑتا ہے بس ہی بس'' اس نے ہنس کے کہا لیکن فوراً ہی اس کی ابرو پر بل آ گیا جس سے اس کی ہنسی کو گہن لگ گیا۔

''انہہ۔کیا میں نہیں جانتا کہ چوری کرنا برا ہے اور خطرناک بھی۔مگر مجھے اس میں بہت مزہ آتا ہے اور میں کوئی اپنے پاس پیسہ نہیں جوڑ رکھتا۔ایک ہی ہفتے کے اندر یہ تمہارے ماموں سب نکلوا لیتے ہیں مجھ سے۔ پر مجھے پروا نہیں، لیتے ہیں تو لے لیں۔مجھے پیٹ بھر کھانے کو مل جاتا ہے، چلو بہت ہے۔''

پھر اس نے ایک دم مجھے گود میں اٹھا لیا اور پیار سے جھنجھوڑا۔

''یار تم ہو تو دبلے پتلے اور ہلکے مگر تمہاری ہڈیاں خوب مضبوط ہیں۔زوردار نکلو گے بڑے ہو کر۔ سنو! تم چھتارا بجانا سیکھو۔اپنے یاکوف ماموں سے کہو سکھا دیں گے۔سچ، مذاق نہیں! بس مشکل یہی ہے کہ تم ابھی چھوٹے بہت ہو۔ویسے ننھے ہوتے ہوئے بھی تمہارا تیہا کافی تیز ہے۔تمہیں اپنے نانا اچھے لگتے ہیں نا؟''

''معلوم نہیں۔''

''مجھے اس کا شیرین خاندن میں سب ناپسند ہیں سوائے نانی اماں کے۔شیطان کی ماران پر!''

''اور میں؟''

''تم کا شیرین کب ہو۔تمہارا تعلق تو پیشکوف خاندان سے ہے نا۔ان کا تو خون ہی الگ ہے۔وہ قبیلہ ہی اور ہے۔''

یکا یک اس نے مجھے بھینچ کر اپنے سینے پر دبا لیا اور آہ بھر کر کہنے لگا:

''اے خدا کاش میں گا سکتا! لوگوں کے دل ہلا دیتا! اچھا بھیا، جا اب۔چلیں کام کریں...''

اس نے مجھے فرش پر اتار دیا، ایک مٹھی بھر کے ننھی ننھی کیلیں اپنے منہ میں بھریں اور ایک بڑے سے چوکھٹے تختے پر ایک سیاہ کپڑا اجڑنے لگا۔

اس کے فوراً ہی بعد تسیگانوک کی موت واقع ہوئی۔

ہوا ایسے کہ ہمارے باہری پھاٹک کے پاس احاطے کی دیوار سے ٹکی ہوئی ایک بہت بڑی اور بھاری پھاٹک کے پاس احاطے کی دیوار سے ٹکی ہوئی ایک بہت بڑی اور بھاری صلیب رکھی ہوئی تھی۔یہ صلیب شاہ بلوط کی لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور اس کا پایہ بہت بھاری سا اور نکلا ہوا تھا۔وہ بہت دنوں سے اس جگہ پر رکھی تھی۔مجھے یاد ہے کہ پہلے دن جب میں یہاں رہنے کے لئے آیا تھا تو اس وقت بھی وہ وہیں رکھی ہوئی تھی۔لیکن اس وقت وہ نئی تھی اس لئے اس کا رنگ زرد تھا۔اب خزاں کی بارش میں بھیگنے کی وجہ سے

اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا اور اس میں سے بھیگے ہوئے شاہ بلوط کی خوشبو اڑا کرتی تھی۔ ہمارے احاطے میں یوں ہی بہت سی چیزیں بکھری رہتی تھیں۔ اور اس پر اس صلیب کی موجودگی بری طرح سے اڑچن رہتی تھی۔''

یہ صلیب یاکوف ماموں نے اپنی بیوی کی قبر پر لگوانے کے لئے خریدی تھی اور قسم کھائی تھی کہ اس کی پہلی برسی پر وہ اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر قبرستان لے جائیں گے۔

برسی جس دن پڑی اس دن سنیچر تھا۔ جاڑوں کی شروعات تھی، سردی خوب تھی اور مکانوں کی چھتوں پر تیز ہوا برف کو اڑا اڑا کر گرا رہی تھی۔ میری نانی، نانا ابا اور دوسرے تین بچے پہلے ہی سے گاڑی میں بیٹھ کر برسی کی رسم ادا کرنے کے لئے قبرستان کے گرجے روانہ ہو چکے تھے۔ باقی سب لوگ احاطے میں نکل آئے تھے۔ مجھ سے اس درمیان کوئی خطا ہو گئی تھی، اس لئے مجھ کو بطور سزا گھر پر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

پہلے میرے دونوں ماموؤں نے جو ایک ہی سے سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھے صلیب کو سر کی جانب سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کا ایک بازو میخائل ماموں اور دوسرا بازو یاکوف ماموں کے کندھے پر رکھ دیا گیا۔ ایک آدمی اور تھا، اس نے اور مستری جی نے مل کر بڑی مشکل سے صلیب کا پایہ اٹھایا اور اسے تسیگا نوک کے بھاری کندھوں پر رکھا۔ وہ بوجھ سے لہرا گیا اور اپنے پاؤں پھیلا کر اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''کیوں، سنبھال لو گے؟'' مستری گریگوری نے پوچھا۔

''معلوم نہیں بھاری بہت ہے۔''

''پھاٹک کھول، اندھے شیطان!'' میخائل ماموں چیخے۔

''ڈوب مرو وانیا'' یاکوف ماموں نے کہا۔ ''ہم دونوں تم سے تو دبلے ہی ہیں۔''

لیکن مستری گریگوری نے پھاٹک کھول کر ذرا سختی سے وانیا کو رائے دی:

''دیکھو، زیادہ زور نہ لگانا۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔''

میخائل ماموں باہر گلی میں قدم رکھتے ہوئے بولے:

''احمق بڈھا، گدھا کہیں کا!''

احاطے میں کھڑے ہوئے سب لوگ مسکرانے لگے اور آپس میں زور زور سے باتیں کرنے لگے جیسے اس بات پر خوش ہو رہے ہوں کہ چلو اچھا ہوا صلیب کی اڑچن گئی۔ احاطہ صاف ہو گیا۔

مستری جی نے میرا ہاتھ پکڑا اور کارخانے میں لے گئے۔

''شاید آج تمہارے نانا پٹائی نہ کریں، آج تو ان کا موڈ ذرا اچھا لگتا ہے۔''

پاس ہی اون کا ایک بڑا سا گٹھر رنگنے کے لئے پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے گود میں اٹھا کر اس پر بٹھا دیا۔ پھر میرے ادھر ادھر اون لپیٹ کے ناندوں میں سے نکلتی ہوئی بھاپ کو سونگتے ہوئے بڑی توجہ سے باتیں کرنے لگے:

''میں تمہارے نانا کو سینتیس سال سے جانتا ہوں بیٹے!'' وہ بولے۔ ''میں نے اس کاروبار کا آغاز بھی دیکھا تھا اور اب انجام بھی دیکھ رہا ہوں۔ ہم دونوں میں بڑی دوستی تھی، ساتھ ہی سوچ بچار کر یہ کاروبار شروع کیا تھا۔ تمہارے نانا بڑے تیز آدمی ہیں۔ اب دیکھو وہ اس کاروبار کے مالک بن بیٹھے اور میں نہیں بن سکا۔ لیکن خدا ہم دونوں سے زیادہ تیز نکلا۔ اس کی بس ایک مسکراہٹ ہی کافی ہوتی ہے اور بڑے بڑے کائیاں احمقوں کی طرح آنکھیں جھپکاتے رہ جاتے ہیں۔ تم ابھی کیا جانو دنیا میں کیا ہوتا اور کیوں ہوتا ہے، مگر بہتر یہی ہے کہ تم باتوں سے آگاہ ہو جاؤ۔ یتیم کی زندگی کوئی آسان نہیں ہے۔ تمہارے ابا میکسم سواتیوچ تو ہزاروں میں ایک تھے۔ وہ سب سمجھتے تھے! اسی لئے تو تمہارے نانا کی ان سے نبھتی نہیں تھی۔ اور ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے...''

اس جگہ بیٹھ کر مستری جی کی محبت بھری باتیں سننے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ چولھے میں سرخ اور سنہری آگ بھڑک رہی تھی، ناندوں کی بھاپ سے دودھیا بادل اٹھ رہے تھے جو تر چھے جھکے ہوئے چھپر پر بیٹھتے جاتے تھے اور جم جم کے برف بنتے جاتے تھے۔ چھپر کے ایک چھید سے مجھے نیلے آسمان کی ایک چٹ نظر آ رہی تھے۔ ہوا کا بہاؤ رک گیا تھا، سورج چمک رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ احاطے میں پسا ہوا شیشہ بکھرا پڑا ہے۔ باہر گلی سے جمی ہوئی برف پر دوڑتی ہوئی گاڑیوں سے کرکراہٹ کی آواز آ رہی تھی، گھروں کی چمنیوں سے بل کھاتا ہوا نیلا دھوان نکل رہا تھا اور برف پر پڑتی ہوئی اس دھویں کی پرچھائیں بھی اس طرح آگے پیچھے نکلتی جاتی تھی جیسے وہ بھی اپنی داستان کے حصے دھرا رہی ہوں۔

مستری گریگوری کا وجود اپنے دراز ہڈیالے جسم، لمبی داڑھی اور بڑے بڑے کانوں کی وجہ سے کسی مہربان جادوگر کا سا لگتا تھا۔ انہوں نے ٹوپی اتار دی تھی اور مجھے نصیحتیں کرتے ہوئے پکتے ابلتے رنگ کے پاس کھڑے، اس کو بانس سے چلائے جا رہے تھے:

''ہمیشہ لوگوں سے آنکھ ملا کے بات کرو۔ اگر کوئی کمینہ کتا بھی تمہارے پیچھے لگا ہو تو ایسا کرنے سے وہ بھی رک جائے گا...''

ان کی بوجھل عینک کھسک کر ان کے ناک کے بانسے پر آ گئی تھی جس سے ناک کی نوک نیلی پڑ گئی تھی، نانی اماں کی ناک کی طرح۔

یکا یک وہ رک گئے ''یہ کیا معاملہ ہے؟'' انہوں نے ایک پل غور سے سنا، لات مار کر چولھے کا ڈھکنا بند کیا اور احاطے سے ہو کر بھاگے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

تسیگا نوک باورچی خانے کے فرش پر چت پڑا تھا۔ کھڑکیوں سے روشنی کی دو دھارائیں اندر گر رہی تھیں، ایک اس کے سر اور سینے پر اور دوسری پاؤں پر۔ اس کی پیشانی ایک عجیب طرح کے نور سے منور تھی۔ بھویں اٹھی ہوئی، دنبالہ دار آنکھیں ٹنگی ہوئی دھویں سے سیاہ چھت کی طرف تک رہی تھیں۔ سنولائے ہوئے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور ان میں سے گلابی جھاگ نکل رہا تھا۔ دھانے کے دونوں کونوں سے خون کی پتلی پتلی دھاریں گر کر گردن سے ہوتی ہوئی فرش پر بہہ رہی تھیں، اس کے نیچے بھی تمام خون ہی خون تھا۔ ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں اور جس طرح اس کے پتلون کی چوڑی مہریاں زمین کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خون سے بھیگ چکی ہیں۔ فرش کو ریت سے ایسا صاف کیا گیا تھا کہ وہ چمکنے لگا تھا اور اس پر خون کے چھوٹے چھوٹے چشمے سے بہہ رہے تھے۔ جہاں جہاں پر سورج کی روشنی پڑتی تھی وہاں وہ خوب دمک رہے تھے۔

تسگا نوک بالکل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ البتہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی انگلیاں فرش کو آہستہ آہستہ کھرچ رہی تھیں اور ایسے میں جب بھی سورج کی روشنی ان پر پڑتی تو رنگے ہوئے ناخن جواہرات کی طرح چمکنے لگتے۔

ایوگینیا بوا ایوان کے پاس گھسی ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک موم بتی پکڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن وہ پکڑ نہیں پا رہا تھا۔ موم بتی گری اور اس کی لو خون میں پھک سے بجھ گئی۔ بوا نے اس کو پھر اٹھایا، پونچھا اور پھر اس کی تڑپتی ہوئی انگلیوں میں پکڑانے کی کوشش کرنے لگیں۔

باورچی خانے کی فضا دبی دبی گھبراہٹ اور پریشانی سے سنسنا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ہوا کا ایک زبردست تھپیڑا ہے جو مجھے چوکھٹ سے اڑا لے جائے گا لیکن میں ٹیک کو پکڑ کر زور سے چمٹ گیا۔

''ٹھوکر کھا گیا بھئی'' یا کوف ماموں سے ہلا ہلا کر کھوکھلی آواز میں کہہ رہے تھے۔ اپنی بے رنگ آنکھوں کو بار بار جھپکاتے ہوئے وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے ان کا سارا وجود سکڑ کر غائب ہو گیا ہو۔ ''بس گر پڑا اور صلیب کے نیچے کچل گیا۔ وہ اس کی پیٹھ پر گر پڑی۔ اگر ہم لوگ فوراً چھوڑ نہ دیتے تو ہم لوگوں کو بھی کچل ڈالتی۔''

''تو یہ آپ لوگوں کی حرکت ہے!'' مستری جی بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''آپ سمجھتے ہیں کہ ہم....''

خون برابر بہتا رہا۔ دروازے کے پاس ایک اچھا خاصہ تالاب سا بن گیا تھا، اور خون کی سطح ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ تسیگا نوک پڑا ہوا تھا اور اس کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جیسے وہ خواب میں برا رہا ہو۔ گلابی جھاگ منہ سے برابر اٹھ رہا تھا، جسم گھلتا جا رہا تھا، اس طرح چپٹا ہو کر زمین سے ملتا جا رہا تھا جیسے اسی میں سما جائے گا۔

''میخائل تو گھوڑا لے کر گرجے گیا ہے۔ ابا کو بلانے۔ اور میں اسے گھوڑا گاڑی میں ڈال کے یہاں لے آیا۔ اچھا ہوا جو میں نے پائے کی طرح سے نہیں اٹھایا ورنہ اب دیکھو اس وقت میرا کی حشر ہوتا...''

بوا پھر اس کے ہاتھ میں شمع تھمانے لگیں۔ شمع پگھل کر ان کے آنسوؤں کے ساتھ تسیگا نوک کی ہتیلی میں گر رہی تھی۔

مستری گریگوری نے ڈانٹا:

''ارے اس کے سرہانے کیوں نہیں جما دیتی ہو، پھوہڑ!''

''ہاں ٹھیک کہتے ہو۔''

''ٹوپی تو اتارو اس کی!''

بوا نے ٹوپی اتاری اور ایوان کا سر بھد سے زمین پر لگا۔ اب اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ اس لئے خون زیادہ تیزی سے لیکن ایک ہی طرف سے بہہ رہا تھا۔ بڑی دیر تک یہی ہوتا رہا۔ پہلے تو مجھے یہ امید تھی کہ تسیگا نوک تھوڑی دیر آرام کر کے ایک دم اٹھ بیٹھے گا، منہ بنا کر تھوکے گا اور اپنے خاص انداز میں کہے گا:

''تھو، کیا گرمی ہے...''

اتوار کے دن جب وہ دوپہر کو ذرا دیر سوتا تھا تو اٹھ کر یہی کہتا تھا۔ لیکن اٹھنے کے بجائے وہ وہیں پڑا

رہا اور گھلتا گیا، گھلتا گیا۔ سورج آگے بڑھ گیا، روشنی کی دھارائیں چھوٹی ہو کر اب صرف کھڑکی کی چوکھٹ پر پڑنے لگیں۔ تسیگا نوک کے ہاتھوں اور اس کے چہرے پر سیاہی بڑھتی لگیں۔ تسیگا نوک کے ہاتھوں اور اس کے چہرے پر سیاہی بڑھتی گئی اور منہ سے نکلنے والے جھاگ کے بلبلے بیٹھتے گئے۔ اس کے سر کے آس پاس تین شمعیں روشن کر دی گئی تھیں جن کی سنہری لوؤں کی چھوٹ اس کے سرمئی سیاہ بالوں کے ڈھیر، اوپر کو اٹھی ہوئی ناک کی نوک اور خون آلود دانتوں پر پڑ رہی تھی۔ تڑپتی ہوئی روشنی کا کچھ حصہ سانولے رخساروں پر بھی نظر آ رہا تھا۔

بوا اس کے پاس بیٹھی بین کر رہی تھیں:

''ہائے میرا غریب کبوتر! ہائے تجھ سے تو گھر کی رونق تھی...''

سردی بڑھ گئی تھی اور بڑا ڈر لگ رہا تھا۔ میں کھسک کر میز کے نیچے بیٹھ گیا۔ پھر نانا ابا لڑکھڑاتے ہوئے ریچھ کی کھال کا کوٹ پہنے باورچی خانے میں داخل ہوئے، پیچھے پیچھے نانی اماں تھیں بڑا کوٹ پہنے جس کا کالر میں کسی جانور کی دم کا سمور لگا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے میخائل ماموں تھے، پھر بچے اور پھر کئی اجنبی لوگ تھے۔ میرے نانا نے اپنا کوٹ اتار کر زمین پر پھینک دیا:

''ارے یہ حرامزادے! ارے ایسے آدمی کو مار ڈالا۔ پانچ سال بعد وہ سونے میں تلتا۔ سونے میں۔''

زمین پر پڑے ہوئے کپڑوں کے ڈھیر کی وجہ سے ایوان کی لاش میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ میں رینگا اور ذرا بہتر جگہ کھسکنے کی کوشش میں اپنے نانا کے پیروں میں آ گیا۔ انہوں نے مجھے زور سے لات ماری اور اپنی چھوٹی سرخ مٹھیاں میرے ماموؤں تانتے ہوئے گرجے:

''ارے بھیڑیو۔ بس تو بھیڑیے ہو۔ درندے!''

وہ ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور اس کو زور سے پکڑ کر اپنی باریک آواز میں جلی کٹی سنانے لگے:

''ارے میں نے تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم لوگ اسے دیکھ نہیں سکتے... آہ وانیا! میرے بھولے بچے! اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا، اب کیا کریں گے ہم؟ گھوڑا غیر کا اور لگام سڑی ہوئی ہو تو کوئی کیا کرے! ارے وروارا کی ماں! اب کہتی ہو۔ یہ تو نے کہاں کا بدلہ لیا ہے میرے خدا... پچھلے کئی سال سے یہی ہو رہا ہے۔ مصیبت پر مصیبت...''

میری نانی اماں ایوان کے پہلو میں فرش پر گر پڑیں۔ وہ بار بار اس کے چہرے، سر، سینہ اور ہاتھوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں، کبھی اس کی آنکھوں میں پھونکیں مارتیں اور کبھی اس کے ہاتھ لے لے کر سہلاتیں۔ ساری شمعیں بھی انہوں نے الٹ پلٹ کر گرادی تھیں۔ آخر کار وہ مشکل سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس وقت وہ ایک بڑا سا سیاہ بت معلوم ہو رہی تھیں۔ آنکھیں بھیانک طریقے سے گول گول گھومتی ہوئی، سیاہ لباس چمک رہا تھا۔ انہوں نے مدہم آواز میں حکم دیا:

''نکل جاؤ یہاں سے، کمبختو! ملعونو۔''

نانا ابا کے سوا سب ایک ایک کر کے باہر چلے گئے...

بغیر کسی دھوم دھام، چپ چاپ تسیگا نوک کو دفنا دیا گیا۔

4

میں ایک چوڑے چکلے بستر پر لیٹا تھا، چاروں طرف سے لحاف لپیٹے اور نانی اماں کو دعا مانگتے غور سے سن رہا تھا۔ وہ دوزانو جھکی ہوئی تھیں، ایک ہاتھ سینے پر تھا اور دوسرے سے آہستہ آہستہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتی جاتی تھیں۔

کھڑکی سے باہر مجھے برف چٹخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شیشوں پر پالے سے پھول پتیاں بن گئی تھی اور ان پھول پتیوں سے چھنتی ہوئی چاند کی سبزی مائل تابناک اجلی کرنیں ان کے شفیق چہرے، بڑی سی ناک اور سیاہ آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ ان کے سر پر بندھا ہوا ریشمی رومال اس طرح دمک رہا تھا۔ جیسے وہ کسی دھات کا بنا ہوا تھا۔ اور ان کا چنٹ دیا ہوا سیاہ لباس لہریں کھاتا ہوا کندھوں سے ہو کر زمین پر چاروں طرف پھیل گیا تھا۔

جب وہ دعا ختم کر چکیں تو خاموشی سے کپڑے تبدیل کئے اور کونے میں رکھے ہوئے بکس پر سلیقہ سے تہہ کر کے رکھنے کے بعد میرے پاس آئیں۔ میں ایسا بن گیا جیسے گہری نیند سو رہا ہوں۔ وہ دھیرے سے بولیں:

''بے ایمان کہیں کا، بہانہ کرتا ہے؟ بھلا تو سو رہا ہے؟ اٹھ۔ ہاں اب دیکھ کہاں گئی نیند، کبوتر کا بچہ! چل، مجھے بھی دے تھوڑا سا لحاف!''

مجھ کو تو معلوم ہی تھا کہ اب اس کے بعد کیا ہوگا، میں اپنی مسکراہٹ روک نہ سکا۔ تب وہ خفا ہونے

لگیں۔

''اچھا تو اب اپنی بڑھیا نانی کا مذاق اڑائے گا۔ کیوں؟''

انہوں نے لحاف کا ایک کونہ پکڑا اور اس زور سے اور ایسی ترکیب سے جھٹکا کہ میں آتش بازی کی طرح ہوا میں اڑ گیا اور گول گول چکر کاٹتا ہوا پھر اس پروں کے بستر پر دھم سے آ گرا۔ اور وہ زور زور سے قہقہہ لگانے لگیں:

''ارے شیطان! کیوں مزا آیا؟''

کبھی کبھی وہ اتنی دیر تک دعائیں مانگتی رہتیں کہ میں اونگھتے اونگھتے سو جاتا اور مجھے پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ کب بستر میں آئیں۔ جب کبھی گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا یا کوئی پریشانی آتی تو وہ رات کو ہمیشہ ایسی لمبی دعائیں اور نمازیں پڑھا کرتیں۔ نانی اماں جس طرح سے پروردگار کو ہر بات کی تفصیل بتایا کرتیں کہ کیا ہوا، کیا نہیں ہوا، اس کو سننے میں بے حد مزہ آتا تھا۔ پہاڑ کی پہاڑ ایسی دوزانو ہو جاتیں اور اپنی دعا شروع کر دیتیں۔ شروع میں تو ان کا لہجہ تیز ہوتا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا لیکن رفتہ رفتہ ان کی آواز مدہم پڑتی جاتی اور منہ ہی منہ میں کہتی جاتیں: ''اے پروردگار تو تو جانتا ہے کہ آخر اپنے اپنے فائدے کی ہر ایک کو ہی پڑی رہتی ہے۔ اب میخائل بڑا ٹھہرا۔ ایسا تو ہونا ہی چاہئے کہ وہ یہاں شہر میں رہے۔ یہ تو بڑا گناہ ہوگا کہ اس کو دریا پار بھیج دیا جائے جہاں اب تک کسی نے قسمت آزمائی نہیں کی ہے۔ نہ جانے کیسی پڑے، کیسی نہ پڑے۔ لیکن بڑے میاں جو ہیں وہ یاکوف کی طرف داری کرتے ہیں۔ بھلا کسی بھی باپ کے لئے یہ مناسب ہے؟ پروردگار، تیری بڑی عنایت ہو جو انہیں ایک زرد برابر تو عقل دے دے۔''

نگاہ اٹھا کے وہ مقدس شبیہوں کی طرف دیکھتیں اور اپنے خدا کو مشورہ دیتیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی۔

''اے مالک! کبھی ان کے خواب میں آ کر ان کو ہدائت دے دے کہ اپنے بیٹوں میں بٹائی کیسے کریں۔''

پھر وہ سینے پر صلیب کا نشان بناتیں اور اتنا جھکتیں کہ ان کی چوڑی پیشانی فرش سے چھونے لگتی، پھر سیدھی ہوتیں اور اس طرح خدا سے مخاطب ہوتیں جیسے اسے سمجھا رہی ہوں:

''اور ایک قطرہ خوشی کا وروارا کو کیوں نہ بخش دیا جائے معبود؟ آخر اس نے کیا گناہ کیا ہے جو تو اس

سے پھر گیا ہے مالک؟ دوسروں کے مقابلے میں وہی کیوں اتنی دکھی رہے۔ایسی مضبوط ایسی جوان عورت اوراتنی دکھیا۔پھر مستری جی بھی تو ہیں مالک۔ذرا ان کی آنکھوں کا خیال رکھنا۔دن بہ دن زیادہ خراب ہوتی جارہی ہیں۔اورایک بار اگر وہ بالکل اندھے ہو گئے تو پھران کے لئے بھیک مانگنے کے سوا کیا چارہ ہے! اور کیا یہ انصاف ہوگا؟ آخران بیچارے نے نانا کے کاروبار میں اپنا سارا جیون کھپایا ہے...لیکن یہ بڑے میاں کبھی ان کے تھکے وقت میں کام نہیں آئیں گے!'' آہ مالک! میرے اچھے معبود۔رحیم...کریم...''

پھر بڑی دیر تک وہ دوزانو ہو کر خاموش رہتیں، سر جھکا رہتا، دونوں بازو جھولتے رہتے۔ایسا لگتا جیسے سوگئی ہیں۔آخر میں وہ اپنی بھوؤں پر بل ڈال کر سوچتے ہوئے کہتیں:

''ہاں اور کیا کہنا تھا؟..سب دینداروں پر رحم کرنا معبود!اور مجھ بدنصیب کو بھی بخش دینا۔تجھے تو معلوم ہے میں گنہ گار ہوں۔مجھ سے جو کچھ گناہ ہوتے ہیں معبود وہ اس لئے کہ میرے دماغ میں عقل نہیں۔لیکن میرا دل بے ایمان نہیں ہے پروردگار...''

''پھر وہ ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرتیں اور محبت بھرے اطمینان سے کہتیں:

''لیکن بھلا کوئی ایسی بھی بات ہے جو تو نہیں جانتا عالم الغیب، کوئی بات ایسی نہیں جو تو نہ سمجھتا ہو میرے مقدس باپ۔''

مجھے اپنی نانی اماں کا خدا بہت اچھا لگتا تھا جیسے ان سے بالکل قریب اوران کو بے حد محبوب ہو۔اکثر میں کہتا:

''نانی اماں، خدا کے بارے میں مجھے بتایئے نا!''

تو وہ ایک خاص انداز میں اس کے متعلق بیان کرتیں۔پہلے بیٹھتیں، پھر آنکھیں بند کرتیں اور ایک عجیب طریقے سے الفاظ اور آواز کھینچ کر مدہم لہجے میں بیان کرنے لگتیں۔مجھے آج بھی یاد ہے کہ کس طرح سے وہ اس گفتگو کے لئے تیار ہوتیں۔بیٹھتیں، سر پر رومال باندھتیں اور پھران کا تخیل تانے بانے بننے لگتا یہاں تک کہ میں سو جاتا۔

''پروردگار دور رہتا ہے، پہاڑوں کی بلندیوں پر، جنت کی وادیوں میں گھرا ہوا، الماس کے تخت پر، اوراس کے سر پر نقرئی پھولوں کا چتر ہے، ایسے پھول جو سال بھر تک کھلے رہتے ہیں، جن کو بالا مار نہیں سکتا۔ یہی پھول جنت کے باسی ولیوں کے دل میں بھی مسرت کے پھول کھلاتے رہتے ہیں۔اور معبود کے

چاروں طرف فرشتوں کے دل کے دل اڑتے رہتے ہیں جیسے شہد کی مکھیوں کے دل یا خوب گھنی گہری برف، یا جیسے فاختاؤں کے جھنڈ کے جھنڈ آسمان سے زمین تک آتے ہوں اور پھر لوٹ جاتے ہوں۔ اپنے پروردگار کو ہم زمین کے رہنے والوں کا حال سناتے ہوں۔ اور ہم میں سے ہر ایک کا الگ فرشتہ ہوتا ہے۔ میرا بھی ہے، تمہارا بھی، نانا ابا کا بھی۔ کیونکہ پروردگار کا برتاؤ اپنے ہر بندے کے ساتھ ایک برابر کا ہے۔ جیسے تمہارا فرشتہ ہے، اب وہ یہاں آیا اور پھر اس نے معبود سے جا کر کہا کہ الیکسئی نے آج اپنی زبان اپنی زبان نکال کر نانا کا منہ چڑایا تھا۔ بس معبود نے فوراً حکم دیا ''جاؤ اور ایسا کرو کہ بڑے میاں اس کو خوب پیٹیں''۔ تو بس ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی حال ہے۔ انسان کو، ہر چیز کو اپنی کرنی کا پھل بھرنا پڑتا ہے۔ کسی کو غم ملتا ہے، کسی کو خوشی۔ اور پھر فرشتے بڑے مزے میں اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور گاتے جاتے ہیں ''تعریف اس خدا کی، تعریف اس رب عظیم کی!'' اور وہ بس مسکرا کر دیکھتا جاتا ہے ''ٹھیک ہے۔ بڑے چلو میرے حسین فرشتو۔ اگر تمہیں یہ اچھا لگتا ہے تو اپنا کام کئے جاؤ!'' حسین فرشتو۔ اگر تمہیں یہ اچھا لگتا ہے تو اپنا کام کئے جاؤ!''

پھر نانی اماں خود بھی مسکراتیں اور سر ہلاتیں۔

''نانی اماں، کیا تم نے یہ سب دیکھا ہے؟''

''نہیں بیٹا'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں کہتیں۔ ''خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے تو پہچانا ہے۔''

جب وہ خدا اور فرشتوں اور جنت کے متعلق باتیں کرتیں تو ان کو وجود پر بچپن اور بھولا پن چھا جاتا، چہرے پر سے کارواں عمر کے نشانات مٹ جاتے اور نمنا آنکھوں میں ایک خاص طرح کا نور چمکنے لگتا۔ میں ان کی لٹکتی ہوئی ریشمیں نرم چوٹی کو اپنی گردن میں لپیٹ لیتا اور بے حس و حرکت ان کے جادو اثر قصے سنتا رہا جن سے میرا جی کبھی نہ بھرتا۔

''ہم فانی انسانوں کی بھلا کب مجال ہے کہ معبود کے جمال کو دیکھ سکیں۔ ہماری آنکھیں اس کے نور سے اندھی ہو جائیں گی۔ صرف اولیا ہی اس کو آنکھ کھول کر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن فرشتوں کو میں نے دیکھا ہے۔ مگر وہ لوگ بھی بس صرف اس وقت دکھائی دے سکتے ہیں جب دل تمام برائیوں سے پاک ہو جائے۔ ایک دن میں گرجے میں کھڑی صبح کی نماز پڑھ رہی تھی اور منبر پر مجھے دو فرشتے نظر آئے۔ وہ بس کہر کی طرح تھے اور اس قدر نورانی کہ بس حد تھی نور کی۔ اتنے شفاف کہ آر پار دکھائی دیتا تھا۔ پر زمین پر

گھسٹ رہے تھے، نازک نازک شفاف چمکتے ہوئے پھول جیسے پر۔ منبر کے پاس کھڑے ہوئے وہ پادری ایلیا صاحب کی مدد کر رہے تھے۔ جب وہ اپنے بوڑھے کمزور کپکپاتے ہوئے ہاتھ دعا کے لئے اٹھاتے تو فرشتے ان کی کہنیوں کو سہارا دیتے۔ پادری صاحب بہت بوڑھے تھے نا اور آخر وقت میں تو ان کی آنکھوں سے اتنا کم سوجھتا تھا کہ ہر چیز سے ٹکرا جاتے تھے۔ پادری صاحب جلدی چل بسے۔ میں تب فرشتوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوئی کہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہی۔ دردمندی کے مارے بس میرا دل جیسے پھٹا جا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے۔ آہ، کس قدر زبردست مسرت تھی وہ بھی۔ پروردگار نے آسمان کی بلندیوں پر جنت بھی کیا ہی خوب چیز بنائی ہے، الیوشا، میرے کبوتر۔ اور زمین کی پستیوں پر یہ دنیا بھی کیا ہی خوب بنائی ہے...''

''کیا یہ بھی خوب بنایا ہے۔ ہمارا گھر؟''

''ہاں، خدا کا شکر ہے! ضرور، ہمارا گھر بھی اچھا ہے! تعریف ہو مقدس مریم کی'' میری نانی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہتیں۔

''اس بات پر میں ذرا گڑبڑا جاتا۔ یقیناً یہ تو ماننا مشکل تھا کہ یہاں ہمارے گھر میں بھی ہر بات خوب تھی جب کہ آپس کے لڑائی جھگڑا اور پریشانیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں میخائل ماموں کے کمرے کے سامنے سے گذرا۔ دروازہ کھلا تھا اور میری نظر پڑ گئی تو میں نے دیکھا کہ نتالیا ممانی سر سے پاؤں تک سفید کپڑے پہنے، اپنے سینے پر دونوں ہاتھ دبائے کمرے میں چاروں طرح بے قرار پھر رہی ہیں اور نہایت اندوھناک آواز میں آہستہ آہستہ روتی ہوئی کہتی جا رہی ہیں:

''اے پروردگار! مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ مجھے کسی طرح یہاں سے چھٹکارا دے...''

ان کی دعا میری سمجھ میں آ گئی تھی اور مستری گریگوری کی بات بھی میں سمجھ گیا تھا جب وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے:

''اچھا ہے جلدی سے اندھا ہو جاؤں اور سڑک پر بھیک مانگوں۔ اس سے تو بہتر ہی ہوگا...''

میرا جی چاہا تھا کہ وہ جلدی سے اندھے ہو جائیں تا کہ میں ان کے آگے آگے ان کا ہاتھ پکڑ کے چل سکوں اور اس طرح ہم دونوں دنیا بھر میں اپنی روٹی مانگتے پھریں۔ ایک دفعہ میں نے یہ تجویز ان کے

سامنے رکھی تو ان کی داڑھی ہنسی سے چھننے لگی:

''اچھی بات ہے۔ چلیں گے ہم دونوں اور میں گلی گلی پکارتا پھروں گا تا کہ سب سن لیں کہ ''یہ اس واسیلی کا شیرین کا نواسہ ہے جس کی سب سے بڑی رنگریزی کی دوکان ہے''۔ بڑا مزہ آئے گا! اچھی بات ہے، اچھی بات ہے...''

میں نے اکثر غور کیا تھا کہ نتالیا ممانی کے ہونٹ سوجے رہتے ہیں اور ان کے زرد چہرے پر نیلے اور سیاہ نشان پڑے رہتے ہیں۔

''کیا ماموں ان کو مارتے ہیں؟'' میں نے نانی اماں سے پوچھا۔

''ہاں، چھپ چھپ کر، تمہارے نانا نے مارنے کو منع کر رکھا ہے تو وہ رات کو مارتا ہے، کمینہ، اور اس عورت میں بالکل ہمت نہیں ہے۔''

پھر وہ گرمجوشی سے اپنا قصہ جاری کر دیتیں:

''لیکن اب تو ویسی مار لوگ مارتے بھی نہیں ہیں جیسے مارا کرتے تھے۔ اب تو یہ ہے کہ کبھی کبھار دانتوں پر یا کان پر تھوڑی سی لگا دی یا چوٹی کھینچ لی اور بس لیکن پہلے تو گھنٹوں دھنائی ہوتی تھی۔ ایک بار ایسٹر کے ہفتے کے پہلے دن تمہارے نانا نے صبح کی نماز کے وقت سے جو مجھے پیٹنا شروع کیا تو مغرب تک پیٹتے رہے۔ بیچ میں ذرا دیر کو آرام کر لیتے اور پھر پیٹنے لگتے۔ گھوڑے کی لگام سے یا اور بھی جو کچھ ہاتھ آ جاتا اس سے۔''

''مگر کیوں؟''

''پتہ نہیں۔ اب تو یاد بھی نہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا تھا اور پھر پانچ دن تک کھانے کو بھی نہیں دیا۔ بس یہ سمجھو کہ خدا خدا کر کے کسی طرح میں زندہ بچ نکلی۔ ایک بار تو...''

یہ واقعات سن سن کر میری سٹی گم ہو جاتی۔ نانی اماں جسامت میں نانا سے دونی تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نانا ان پر کیسے قابو پاتے تھے۔

''کیا وہ تم سے اتنے مضبوط ہیں نانی اماں؟''

''نہیں مجھ سے مضبوط تو نہیں ہیں لیکن عمر میں بڑے ہیں نا۔ پھر وہ میرے شوہر ٹھہرے۔ خدا نے انہیں میرا وارث بنایا ہے اور مجھ کو یہ حکم دیا ہے میں ان کی ہر بات برداشت کروں۔''

جب نانی اماں مقدس شبیہوں کو جھاڑتیں پونچھتیں اور ان کے بیل بوٹے صاف کرتیں تو مجھے ان کو دیکھنے میں بہت مزہ آتا۔ ہمارے گھر کی یہ مقدس شبیہیں بڑی قیمتی اور نفیس تھیں۔ ان میں تمام چاندی کا جالدار کام بنا ہوا تھا اور جواہرات اور موتی وغیرہ جڑے ہوئے تھے۔ نانی اماں ان کو نہایت چاؤ سے دیکھتیں اور کہتیں:

''کیسی پیاری صورت ہے!''

وہ ان کو بوسہ دیتے ہوئے اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہتیں:

''سب گرد سے بھر گئی ہے اور دھوئیں کی کالک سے۔ اے خدا کی مقدس ماں! تو بڑی قدرت والی ہے۔ تیری مہربانیاں سب پر یکساں ہیں، ناقابل بیان مسرت بخشنے والی! الیوشا، یہ دیکھ بیٹا۔ کتنی اچھی تصویر ہے۔ کیوں میرے کبوتر و بوتر! ذرا دیکھنا نقش ونگار کتنے ننھے ننھے ہیں، نقش کی ہر لکیر الگ سے الگ دیکھ لو!... دیکھ اس کا نام ہے ''بارہ تعطیلات''۔ بیچ میں فیڈورووسکی والی پاک مریم ہیں۔ کسی قدر رحیم و کریم ہیں۔ اور یہ دیکھ۔ تیسری تصویر کا نام ہے ''میری ماں، میری قبر پر آنسو نہ بہانا...''

بعض اوقات تو مجھے ایسا لگتا جیسے نانی اماں اس سنجیدگی اور انہماک سے ان شبیہوں سے کھیل رہی ہیں جس طرح میری ماموں زاد بودی بہن کاتیرینا اپنی گڑیوں سے کھیلا کرتی ہے۔

کبھی کبھی ان کو شیطان دکھائی دیتا تھا۔ کبھی تنہا اور کبھی شیطانوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔

''ایک دفعہ روزوں کے زمانے میں میں روڈلف کے مکان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی۔ اور ایک ایک چیز نظر آ رہی تھی۔ بس ایک دم سے میں نے دیکھا کہ چھت پر چمنی کے پاس کوئی کالا کالا سا سایہ منڈلا رہا ہے۔ خوب چوڑا چکلا اور بھدا سا اور اپنا سینگ دار سر اس نے چمنی کے اندر گھسا رکھا تھا۔ وہ زور زور سے سونگھ رہا تھا اور فوں فوں کر رہا تھا اور دم کو بار بار چھت پر پٹکتا اور بڑے بڑے پاؤں کو بار بار ہلا رہا تھا۔ میں نے فوراً صلیب کا نشان بنایا اور کہا ''یسوع مسیح اپنے دشمنوں کو شکست دینے پھر زمین سے اٹھے گا!'' بس اس نے چین سے ایک زور کی چیخ ماری اور پھسلتا ہوا احاطے میں آ گرا اور غائب ہو گیا! غالباً روڈلف کے گھر میں روزہ کھولنے کے لئے کوئی مزیدار چیز پک رہی تھی اور وہ کمبخت ندیدہ اسی کو سونگھ رہا تھا۔''

مجھے اس بات پر بڑی ہنسی آئی کہ شیطان قلابازی کھاتا ہوا احاطے میں گرا۔ نانی اماں بھی میرے

ساتھ ہنسنے لگیں۔

''اور بڑے ہی شریر بھی ہوتے ہیں یہ بھوت پریت اور شیطان، ننھے بچوں کی طرح! ایک رات میں حمام میں کپڑے دھو رہی تھی۔ کوئی آدھی رات آئی ہوگی کہ بس ایک دم سے تندور کا دروازہ کھل گیا اور اس میں سے مار شیطان ہی شیطان نکل آئے۔ چھوٹے چھوٹے اور لال لال، ہرے ہرے، کالے کالے جیسے تل چٹے۔ میں نے دروازے کا رخ کیا۔ مگر نکلنے کا راستہ ہی نہیں۔ اب یہ سوچو کہ وہاں حمام میں ان شیطانوں کو بیچ میں پھنس گئی۔ کوئی لاکھوں ہی تو رہے ہونگے۔ تمام حمام میں اٹم اٹ بھر گئے تھے۔ میرے تلوؤں کے نیچے گھس گئے، ٹانگوں پر چڑھ گئے۔ کہیں کاٹ رہے ہیں، کہیں نوچ رہے ہیں، کہیں کچھ چبھو رہے ہیں یہاں تک کہ مجھے اتنا بھی موقع نہیں ملا کہ صلیب کا نشان بناتی جو کم بخت اڑنچھو ہو جاتے۔ بالکل چھوٹی چھوٹی بلیوں کی طرح تھے وہ۔ نرم، گرم اور بال دار، پچھلے دونوں پیروں پر چلتے تھے، ادھر مڑتے، ادھر جھومنے، چوہوں کے سے دانت دکھاتے، چھوٹی چھوٹی سبز آنکھیں چمکاتے، سر کو جھٹکے دے دے کے وہ نوکیں ہلاتے جن پر دونوں سینگ اگے ہوئے، دمیں گھماتے! اوخدا، اس وقت بھی کیا گذر گئی مجھ پر، میں تو بے ہوش ہوگئی! ہاں بے ہوش تو ہو ہی گئی! اور جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ شمع جل جل کر بجھنے کے قریب تھی، کپڑے دھونے کا پانی سب ٹھنڈا ہو گیا تھا اور دھلنے والے کپڑے سب فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ''تھو'' میں نے کہا ''تمہیں طاعون لیجائے کم بخت شیطانو!''

میں نے اپنی آنکھ بند کر لی اور مجھے دکھائی دینے لگا کہ پتھر کے بنے ہوئے ٹیالے بھورے رنگ کے تندور کا دروازہ بھڑ سے کھل گیا ہے اور چھوٹے چھوٹے شیطانوں کا ایک ریلا اس میں سے نکل نکل کر حمام میں بھر رہا ہے، پھونک مار کر انہوں نے شمع گل کر دی اور اپنی چکنی چکنی گلابی گلابی زبانیں نکالے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ اس تخیل میں مزہ تو بہت آیا مگر ڈر بھی لگا۔ نانی اماں نے ایک بار سر ہلایا اور پھر چپ ہوگئیں یہاں تک کہ ان کے تخیل نے پھر زور مارا:

''اور میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جن پر شیطان کا سایہ ہوتا ہے اور جن کو خدا سزا دیتا ہے۔ یہ واقعہ بھی رات ہی میں ہوا تھا۔ جاڑوں کی بڑی سرد رات تھی، برف کا طوفان آیا ہوا تھا۔ میں دیوکوف تلیا پار کر رہی تھی۔ وہ جگہ تھی جہاں یاد ہے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یاکوف اور میخائل تمہارے ابا کو تالاب میں ڈبو کر مار ڈالنا چاہتے تھے۔ تو میں اسی طرف جا رہی تھی۔ سڑک پر سے ہو کر تلیا کے پیندے کے پاس ہی

پہونچی تھی کہ ایک دم سے زور کی سیٹیاں بجنے لگیں اور چوں چوں کی آواز زور سے آنے لگی۔ سر اٹھا کر جو دیکھتی ہوں تو تین سیاہ گھوڑوں والی گاڑی بس جیسے میرے اوپر ہی چڑھی چلی آ رہی ہے۔ کوچبان جو تھا وہ ایک چھوٹا سا موٹا سا شیطان تھا۔ سر پر ایک نوکدار سرخ ٹوپی پہنے سیٹ پر کھڑا ہوا، بازو پھیلے ہوئے اور لگاموں کی جگہ وہ زنجیروں سے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ جب گھوڑے تلیا میں اتر نہیں سکے تو وہ برف کے بادل اڑاتے ہوئے سیدھے تالاب کی طرف ہو لئے۔ گاڑی میں بیٹھنے والے بھی سب شیطان ہی تھے، ٹوپیاں اچھالتے، سیٹیاں بجاتے! اس طرح کی سات گاڑیاں ایک کے بعد ایک آگ سے بھری ہوئی گاڑیوں کی طرح میرے پاس سے اڑتی ہوئی نکل گئیں۔ گاڑیوں میں ان لوگوں کی روحیں جتی ہوئی تھیں جن کو ماں باپ کی بددعاؤں نے راند دیا تھا۔ شیطان ان لوگوں کو خوب تماشہ بنائے پھرتے ہیں، ان کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور پھر رات بھر ان کو جگہ جگہ گھسیٹتے پھرتے ہیں اور خوب خوش ہوتے ہیں۔ اس دن تو ایسا معلوم ہوتا جیسے میں نے کسی شیطان کی برات دیکھی تھی!''

نانی اماں کے لہجے میں کچھ ایسا یقین اور ایسی سادگی ہوتی تھی کہ ان کی باتوں پر یقین نہ کرنا ناممکن تھا۔

لیکن سب سے زیادہ بہتر وہ نظمیں ہوتی تھیں جو وہ مقدس ماں کے متعلق دوہرایا کرتی تھیں۔ کہ کس طرح مقدس ماں نے کانٹوں پر چل کر پوری دنیا کا سفر کیا تا کہ ''ڈاکو شہزادی'' اینگا لیچیوا روسیوں کو لوٹنا اور مارنا بند کر دے، پھر الیکسئی کے گیت جو بڑا خدا کا دوست تھا، ایوان سپاہی کے گیت، عقل مند واسیلیسا کی کہانی، پادری نما بکری اور اس کے خدا پرست بیٹے کی داستان۔ پھر مارفا پوسادنیتسا کے قصے، ڈاکوؤں کی سردار بی بی اوستیا اور مصر کی گنہگار میریا کے قصے، ڈاکو کی ماں کی پپتا کے بھیانک قصے۔

ان کے پاس قصوں، داستانوں، روائتوں اور نظموں کا ایسا خزانہ تھا جو کبھی خالی نہیں ہوتی تھا۔

وہ کسی سے ڈرتی نہیں تھیں۔ نانا تک سے نہیں، نہ شیطان سے اور نہ کسی اور بھوت پریت کی طاقت سے، لیکن تل چٹوں کے ڈر سے ان کا دم نکلتا تھا۔ اگر تل چٹا دور دور بھی کہیں ہوتو ان کو فوراً پتہ لگ جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ آدھی رات کو مجھے اٹھا کے بٹھا دیتیں اور آہستہ سے کہتیں:

''الیوشا، میرا بچہ، دیکھ تو تل چٹا رینگ رہا ہے۔ یسوع مسیح کا واسطہ ذرا مار دے اسے!''

میں نیند میں دھت، کچھ سوتا کچھ جاگتا، شمع روشن کرتا اور چاروں ہاتھ پاؤں کے بل دشمن کی تلاش

میں فرش پر ادھر ادھر رینگتا مجھے اپنی مہم میں کامیابی نہیں ہوتی تھی۔

''نہیں ہے یہاں تو'' میں کہتا۔ لیکن وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت لیٹی، لحاف سے منہ ڈھکے گہری گہری سانسیں لیتی رہتیں۔

''نہیں نہیں! ہے، ضرور ہے۔ ڈھونڈ تو میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ وہیں ہے۔ مجھے معلوم کہ ہے''

اور ان کی بات ہمیشہ ٹھیک ہوتی تھی۔ اکثر مجھے تل چٹا پلنگ سے دور کہیں ملتا۔

''مار ڈالا؟ آہ، تیرا شکر ہے معبود! جیتا رہ بیٹا۔ تیرا شکریہ۔''

اور وہ مسکراتی ہوئی لحاف ہٹا کر اپنا منہ کھول دیتیں۔

لیکن اگر تل چٹا نہ ملتا تو پھر ان کے لئے سونا ناممکن ہو جاتا۔ رات سناٹے میں کہیں ذرا سی بھی سرسراہٹ ہوتی کہ ان کا سارا جسم کانپنے لگتا، سانس روک روک کر آہستہ آہستہ سہمے ہوئے لہجے میں کہتیں:

''وہ رہا دروازے کے پاس... وہ گیا بکس کے نیچے...''

''وہ اپنے ہوش و حواس ٹھیک کر کے جواب دیتیں:

''بھلا ان کم بختوں سے فائدہ بھی کیا ہے؟ بس رینگتے پھرتے ہیں، رینگتے پھرتے ہیں، کم بخت منہ کالا ہو ان شیطانوں کا۔ خدا نے حقیر سے حقیر مخلوق کی پیدائش کا بھی کوئی مقصد رکھا ہے۔ کھٹمل پیدا ہوتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بھئی دیواریں گندی ہیں، صفائی کی ضرورت ہے۔ اگر جوں کہیں کپڑے میں ملے تو اس کے معنی ہیں کہ کوئی بیماری آنے والی ہے۔ تو یہ سب تو ایک بات ہوئی لیکن یہ بھلا کوئی بتائیے یہ کس کام آتے ہیں؟ انہیں زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟''

ایک دن وہ دوزانو بیٹھی اپنے پروردگار سے بڑے ذوق و شوق سے باتیں کر رہی تھیں کہ نانا ابا نے دھڑام سے دروازہ کھولا اور گھٹی ہوئی آواز میں زور سے چیخے:

''لو ورارا کی ماں! اب تو واقعی ہم پر خدا کی پھٹکار برس پڑی۔ دوکان میں آگ لگ گئی!''

''کیا؟'' نانی اماں چیخیں اور لڑکھڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دونوں دھڑا دھڑ کرتے ہوئے لمبی سی اندھیری ڈیوڑھی میں سے ہو کر بھاگے۔

''ایو گینیا! مقدس شبیہوں کو تو کھونٹیوں پر سے اتارو! نتالیا، جلدی بچوں کو کپڑے پہناؤ!'' نانی اماں نے زور سے اور بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ حکم دیا۔

''ہائے...ے...ے!'' نانا ابا زور سے رو رہے تھے۔

میں باروچی خانے میں بھاگا۔ اس کی جو کھڑکی احاطے میں کھلتی تھی وہ تمام سونے کی طرح چمک رہی تھی اور اس میں سے پھسل پھسل کر فرش پر بھی جا بجا سنہری رنگ کے قتلے بکھرے ہوئے تھے۔ یاکوف ماموں ننگے ہی پیروں پر جوتا چڑھا رہے تھے اور پھر اچھل اچھل کر بار بار روشنی کے ان قتلوں کو کچلتے جیسے وہ روشنی نہیں، انگارے ہوں جو ان کے پیروں کو جھلسے دے رہے ہوں۔

''ارے یہ میخائل نے ہمارے گھر میں آگ لگائی ہے۔ ہمارے گھر میں آگ لگا کے بھاگ گیا آ آ...'' یاکوف ماموں چیخ رہے تھے۔

''چپ رہ کتے!'' نانی اماں نے ان کو دروازے سے باہر ایک ایسا دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچے۔

کھڑکی کے شیشوں پر جمی ہوئی برف میں سے میں نے دیکھا کہ دوکان کی چھت جل رہی تھی اور کھلے دروازے سے شعلے زبانیں نکال نکال کے لپک رہے تھے۔ رات سناٹے میں آگ کی سرخ سرخ کلیاں دھویں بغیر ہی پھول بن بن کر کھلتی جا رہی تھیں، دھویں کے بادل تو صرف اوپر ہوا میں نظر آتے تھے۔ لیکن ان کے اوپر کہکشاں کی چاندی کی لکیر اسی طرح آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دھویں سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ سرخ شعلوں کے عکس سے برف دمک رہی تھی اور گھروں کی دیواریں ایسا جھوم رہی تھیں، تھرتھرا رہی تھیں جیسے لڑکھڑاتی ہوئی احاطے کے اس کونے میں پہونچ جانا چاہتی ہوں جہاں آگ کے شعلے مسرت سے تھرک رہے تھے اور دوکان کی دیواروں میں پڑی ہوئی دراڑوں میں اپنی چمکتی بل کھاتی زبانیں ڈال رہے تھے۔ آگ کی دو سرخ اور سنہری چٹیں تیزی سے چھت کی خشک سیاہ لکڑی میں لپٹ گئیں جہاں پتلی سی چمنی اوپر کو منہ اٹھائے ہوئے تھی۔ اور اس میں سے دھویں کی ایک پتلی سی دھارا بہہ رہی تھی۔ کھڑکی کی شیشوں کو ہوا کی ریشمی سرسراہٹ چھو گئی اور برف چٹخنے لگی۔ آگ بڑھتی ہی گئی اور اس کے جلال سے دوکان ایک ایسا حسن اختیار کر گئی جیسا گرجے میں ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اپنے پر قابو نہیں رکھ سکتا۔

میں نے چمڑے کا ایک لبادہ اپنے سر پر ڈالا، نہ جانے کس کے جوتے چڑھائے اور ڈیوڑھی سے دھڑاتا گرتا پڑتا باہر برساتی میں نکل آیا۔ وہاں پہونچ کر میرے قدم خوف سے جمے کے جمے رہ گئے۔ آگ کی روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اس کی گھڑگھڑاہٹ، اپنے نانا اور ماموں اور گریگوری

کی چیخوں سے میرے کان بہرے ہو گئے تھے اور اپنی نانی کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر پاؤں تلے کی زمین نکلی جا رہی تھی۔ نانی اماں نے اپنے سر پر ایک بوری اوڑھی، جسم پر گھوڑے کا کمبل لپیٹا اور شعلوں سے ابلتی ہوئی دوکان میں دوڑتی ہوئی گھس گئیں۔

''ارے احمقو! وہ گندھک کا تیزاب اڑ جائے گا!''

میرے نانا زور سے روتے ہوئے چیخے:

''گریگوری! ارے ان کو روکو! ہائے! ختم ہو گئیں! ختم ہو گئیں...''

لیکن نانی اماں تو نکل بھی چکی تھیں، ان کے پورے جسم سے دھواں اٹھ رہا تھا، سر کو جھٹکے دیتی ہوئی وہ گندھک کے تیزاب کے ایک بڑے کنڈال کو دوہری ہو کر اٹھائے ہوئے تھیں۔ کھانستے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں وہ زور سے چلائیں۔

''بڑے میاں، گھوڑے کو تو باہر نکالو! ارے اس کمبل کو تو مجھ پر سے کھینچو۔ سوجھتا نہیں کہ جل رہی ہوں!''

گریگوری نے لپک کے سلگتا ہوا گھوڑے کا کمبل ان پر سے کھینچا۔ پھر ایک بیلچہ اٹھایا اور دوہرے ہو کر دوکان کے دروازے پر برف کو زور زور سے پھینکنے لگے۔ میرے ماموں نے بھی ہاتھ میں کلہاڑی لے کے ان کے آس پاس کود کود کے کھودنا شروع کر دیا اور میرے نانا نانی کے پاس پہونچ کر ان پر مٹھیاں بھر بھر کے برف پھینکنے لگے۔ نانی اماں نے گندھک کے تیزاب والے کنڈل کو برف میں گاڑ دیا اور احاطے کا پھاٹک کھولنے دوڑیں۔

''اے لوگو! اے پڑوسیو! دوڑو! گودام کو بچاؤ'' انہوں نے اندر آتے ہوئے لوگوں کے سامنے جھک جھک کر کہا۔ ''اگر گودام میں اور گھاس میں آگ لگ گئی تو ہمارا سارا گھر جل جائے گا اور پھر آپ لوگوں کی باری ہے! گھاس کو باغ میں پھینکو اور دوکان کی چھت چیر ڈالو! گریگوری برف اوپر پھینکو، اوپر! نیچے سے کیا فائدہ! یا کوف بے کار نہ دوڑتے پھرو! پڑوسیوں کو کلہاڑیاں اور بیلچہ لا کے دو اندر سے! اچھے پڑوسیو! اچھے لوگو! ہماری مدد کرو، سب مل کر کوشش کرو! خدا ہماری مدد کرے گا۔''

نانی اماں کی ہستی اس وقت کچھ کم دلکش نہ تھی۔ لپکتے ہوئے شعلے بار بار جیسے ان کا پیچھا کرتے تھے لیکن وہ ان کی روشنی میں اس پھرتی سے سٹاسٹ دوڑ رہی تھیں جیسے کوئی تاریک پر چھائیں احاطے میں

بھاگ رہی ہو۔ ہر چیز ان کو نظر آجاتی تھی، وہ ہر جگہ بیک وقت پہونچ جاتی تھیں اور ہر شخص کو حکم دے رہی تھیں۔

یکا یک گھوڑا شراپ دوڑتا ہوا احاطے میں گھس آیا اور الف ہو گیا۔ نانا گرتے گرتے بچے، وہ کود گئے۔ گھوڑے کی ابلتی ہوئی گول آنکھیں آگ کی روشنی میں سرخ چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ فوں فوں کرتا وہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کے قابو میں نہ آئے گا۔ نانا ابا نے لگا چھوڑ دی اور اچک کر ایک طرف کو ہو گئے۔

''پکڑو! پکڑو وروارا کی ماں! اسے پکڑو!''

جیسے ہی گھوڑے نے مڑنا چاہا میری نانی نے فوراً اپنے کو تقریباً اس کے پیروں میں ڈال دیا اور نہایت سکون سے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کے سامنے خاموش کھڑی ہو گئیں۔ گھوڑا گردن جھکا کے بڑے دردناک انداز میں ہنہنایا اور آگ کی طرف بار بار کنکھیوں سے دیکھتا ہوا بالکل چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

نانی اماں نے اس کی لگام پکڑیں، گردن تھپتھپائی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں:

''ڈر مت بیٹا! تو سمجھا کہ اس خطرناک موقع پر میں تجھ کو چھوڑ دوں گئی؟ بے وقوف کہیں کا! ننھا سا احمق چوہا!''

ننھا سا احمق چوہا جو سائز میں نانی اماں سے تین گنا بڑا تھا بڑی مسکینی سے ان کے پیچھے پیچھے پھاٹک کی طرف چلنے لگا۔ بار بار وہ ان کے تمتمائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا اور آہستہ سے ہنہناتا۔

ایوگینیا بوا بچوں کو لے کر باہر نکلیں۔ سب گڈ مڈ، بھنبھناتے ٹھٹھناتے اپنے اوپر طرح طرح کے کپڑے چڑھائے ہوئے۔

''واسیلی واسیلی وچ'' وہ چیخیں۔ ''الیکسئی مجھے نہیں مل رہا ہے۔ کہاں ہے؟''

''چلو، چلو!'' نانا ابا بولے۔ میں ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کے نیچے چھپ گیا تاکہ بوا مجھے ڈھونڈ نہ سکیں۔

دوکان کی چھت اندر کو بیٹھ گئی۔ صرف جلتی ہوئی چھتوں کا دھواں پھینکتا ہوا شعلہ گوں ڈھانچہ آسمان کے پس منظر میں کھڑا تھا۔ اس ڈھانچے کے اندر سے سرخ، سبز اور نیلے شعلوں کے دغنے کی آواز آرہی تھی جو بار بار باہر احاطے کی طرف لپک رہے تھے اور ان لوگوں کی طرف بڑھ رہے تھے جو اس زبردست آگ کو برف پھینک پھینک کو بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ناندیں زوروں میں پکنے لگی تھیں اور ان میں سے

دھویں اور نارنجی رنگ کے بادلوں کے دل کے دل اٹھ کر احاطے میں عجیب طرح کی بو پھیلاتے ہوئے آنکھوں میں گھس رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر آئے تھے۔ میں سیڑھیوں کے نیچے سے نکلا اور نانی اماں کے پیروں میں آ گیا۔

''نکل یہاں سے! کچل جائے گا! نکل...''

پھر احاطے میں ایک گھوڑ سوار گھس آیا جس کے خود میں پر لگا ہوا تھا۔ اس کے کمیت گھوڑے کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور اپنی چابک اٹھائے وہ دھمکی دینے کے انداز میں بڑھا چلا آ رہا تھا:

''ہٹ جاؤ۔ بچ جاؤ۔ ہٹ جاؤ!''

چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بڑے مزے میں بج رہی تھیں اور سارے ماحول پر میلے کی سی کیفیت طاری تھی۔ نانی اماں نے مجھے جلدی سے اوپر برآمدے میں دھکیل دیا:

''سنتا نہیں ہے کیا کہہ رہی ہوں؟ بھاگ یہاں سے! ارے کہہ رہی ہوں بھاگ!''

اب اس وقت ان کی حکم عدولی بھی ناممکن تھی۔ میں باورچی خانے میں چلا گیا اور پھر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لیکن لوگوں کا تاریک ہجوم اتنا بڑھا کہ آگ میرنظروں سے اوجھل ہو گئی۔ صرف جاڑے کی گہرے رنگوں والی ٹوپیوں اور ہیٹوں کے درمیان تانبے کے خود چمکتے دکھائی دیتے تھے۔

آگ پانی ڈال کر اور پیٹ پیٹ کر جلد ہی بجھا دی گئی۔ پولیس کے لوگوں نے بھیڑ کو چلتا کر دیا اور آخر کار نانی اماں اندر باورچی خانے میں آئیں۔

''کون ہے یہاں؟ اچھا تم ہو؟ سوئے نہیں؟ کیا ڈر لگ رہا ہے؟ ڈر نہیں۔ ہو گیا جو کچھ ہونا تھا۔''

وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئیں اور ایک لفظ کہے بغیر آگے پیچھے ہلنا شروع کر دیا۔ خاموش رات کا پھر واپس آ جانا اور اندھیرے کا چھا جانا اچھا لگ رہا تھا لیکن پھر بھی مجھے آگ کے ختم ہو جانے سے کچھ افسوس سا ہوا۔

اتنے میں نانا ابا آ کر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔

''ورورا کی ماں؟''

''جل گئیں نا؟''

''کوئی ایسی بہت تو نہیں۔''

نانا نے گندھک کی ایک ماچس جلائی اور اس کی روشنی میں ان کا دھویں سے سیاہ چہرہ چمکنے لگا۔ انہوں نے میز پر رکھی ہوئی شمع روشن کی اور وہ بھی میری نانی اماں کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

''چلو ہاتھ منہ دھولو'' نانی بولیں حالانکہ وہ خود بھی تمام کالک سے تپی ہوئی تھیں اور اس سے دھویں کی تیز بو آ رہی تھی۔

نانا ابا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''کبھی کبھی معبود آدمی پر اپنا فضل کرتا ہے، عقل کی ایک جھلک بخش دیتا ہے'' انہوں نے نانی کی پیٹھ تھپتھپائی اور کھیسیں نکال کے بولے۔ ''چند منٹوں کے لئے سہی، ذرا سی دیر کے لئے سہی، مگر پھر بھی بخش تو دیتا ہے۔''

نانی اماں بھی ہنسنے لگیں اور کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ نانا ابا ابروؤں پر بل ڈال کے بولے:

''اس گریگوری کو نکالنا ہوگا۔ اب سٹھیا گیا ہے یہ دیہاتی!

سب اسی کی لاپرواہی سے ہوا۔ اور یا کوف وہاں باہر برآمدے میں بیٹھا رو رہا ہے، بے وقوف کہیں کا۔ تم ذرا اس کے پاس چلی جاتیں...''

نانی اماں اٹھیں اور باہر چلی گئیں اپنا ایک ہاتھ اٹھائے اور انگلیوں پر پھونکیں مارتی ہوئی۔ میرے نانا میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے مخاطب ہوئے:

''دیکھا سب تماشہ؟ شروع سے آخر تک؟ کہو اب اپنی نانی کے بارے میں کیا کہتے ہو! اور یہ نہ بھولنا کہ وہ بڑھیا ہو چلی ہیں... بالکل ٹوٹ گئی ہیں، بالکل لٹ گئی ہیں... یہ ہے تمہارے لئے غور کرنے کی بات۔ اور باقی جو لوگ ہیں۔ تھو...و...و، کیا لوگ ہیں!..''

وہ جھکے کھڑے رہے اور کچھ دیر تک کچھ نہیں بولے۔ پھر اٹھے اور شمع کا جلا ہوا گل توڑتے ہوئے بولے:

''کیا تمہیں ڈر لگا تھا؟''

''نہیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔''

انہوں نے جھنجھلاتے ہوئے انداز میں قمیص اتاری اور کونے میں لگے ہوئے طسلے کی طرف

بڑھے۔

''آگ لگنا بھی کیا ہی حماقت ہے'' وہ پیر پٹخ کے زور سے بولے۔''جس کے گھر میں آگ لگے اس کو تو پکڑ کر سر بازار پیٹنا چاہئے کیونکہ وہ یا تو چور ہے یا پھر احمق! ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے اور تب ہی آگ لگنا بند ہوسکتا ہے!..جاؤ اپنے بستر پر۔تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

میں باہر کھسک لیا لیکن پھر اس رات مجھے نیند نہ آئی کیونکہ میں بستر میں گھسا ہی تھا کہ ایک غیر انسانی چیخ سنائی دی اور میرا احساس پھر جی اٹھا۔میں پھر باورچی خانے میں بھاگا اور وہاں میرے نانا کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ان کے جسم پر قمیص بھی نہیں تھی،ان کے ہاتھ میں شمع تھرتھرتھرتھر کانپ رہی تھی۔وہ بار بار قدم اٹھاتے اور دھرتے لیکن اپنی جگہ سے ذرہ برابر نہ کھسک پاتے۔

''وروارا کی ماں،یا کوف،یہ کیا ہے؟'' وہ سانس روک روک کے کہہ رہے تھے۔

میں تندور پر چڑھا اور کونے میں دبک گیا۔گھر میں پھر ہراسانی پھیل گئی۔تمام چیزیں الٹ پلٹ ہونے لگیں جیسے آگ لگنے کے وقت ہوئی تھیں۔آہ وزاری کی چیخیں لہراتی،تانیں لیتی ہوئی آکر دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں اور برابر تیز تر ہوتی جارہی تھیں۔ان کی فریاد بڑھتی جارہی تھی۔میرے نانا اور ماموں نے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنا شروع کر دیا تھا اور نانی اماں ان کو ڈانٹ ڈانٹ کر باورچی خانے میں سے ہنکا رہی تھیں۔گریگوری الگ تندور میں لکڑیاں ٹھونسنے کی کھڑبڑ مچائے ہوئے تھے۔انہوں نے کئی عدد پتیلے پانی سے بھر لئے تھے اور اس طرح منہ اٹھائے،ہلتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے جیسے استراخان کا کوئی اونٹ ہو۔

''پہلے آگ تو جلاؤ'' نانی اماں نے حکم دیا۔

گریگوری ایندھن اتارنے کے لئے تندور پر چڑھے تو میرا پاؤں ان کو چھو گیا۔وہ گھبرا کے چیخے:

''ارے یہ کون ہے؟ تھو..تم ہو۔کیا ڈرایا ہے مجھے۔تم ہمیشہ ایسی جگہ گھسے رہتے ہو جہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔''

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''تمہاری نتالیا ممانی کے بچہ ہو رہا ہے۔''

مجھے یاد آیا کہ جب میری ماں کے بچہ ہوا تھا تو وہ اتنا چیخی چلائی نہیں تھیں۔جب مستری گریگوری

پتیلوں کو تندور پر چڑھا چکے تو وہ بھی تندور پر چڑھ کر میرے پاس آ بیٹھے، جیب سے چکنی مٹی کا پائپ نکالا اور مجھ کو دکھاتے ہوئے بولے:

''میں نے اپنی آنکھوں کو ذرا ٹھیک رکھنے کے لئے تمبا کو پینا شروع کیا تھا۔ تمہاری نانی کہتی ہیں نسوار لیا کرو مگر میں سمجھتا ہوں یہی بہتر ہے۔''

وہ تندور کے کنارے پر سے نیچے پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور شمع کی چندھی روشنی کی طرف تکے جا رہے تھے۔ ان کے کانوں اور گالوں پر کالک تپی تھی، قمیص پھٹ گئی تھی اور اس میں سے ان کی پسلیوں کی طرح خم کھائی پسلیاں مجھے دکھائی دے رہی تھیں۔ کالی عینک کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور اس میں سے ان کی نمناک سرخ آنکھ کے ایک کونے کی جھانکی دکھائی دے سکتی تھی جو ناسور کی طرح لگتا تھا۔ انہوں نے اپنے پائپ میں پتی کا تمبا کو بھرا اور بیٹھے ہوئے پیتے اور چیخیں مارتی ہوئی عورت کی آہ وزاری سنتے رہے اور اس طرح منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے جیسے نشے میں ہوں:

''ایسا لگتا ہے کہ بالاکر تمہاری نانی تھوڑا بہت جل ہی گئیں۔ اب وہ بچے کی دیکھ بھال کیسے کریں گی۔ سنو ذرا اب تمہاری ممانی کا کیا حال ہے؟ لوگ اس کو بھول ہی گئے تھے۔ بات یہ ہوئی کہ آگ جو لگی نا تو اس کے خوف سے اس کے درد شروع ہو گیا۔ دیکھو ایک جیتی جاگتی زندگی کو دنیا میں جنم دینا کتنا مشکل ہے۔ پھر بھی لوگوں کے دلوں میں عورت کی قدر نہیں! عورت کی عزت ہونی چاہئے۔ یعنی ماں کی۔ اور تم یہ بات کبھی نہ بھولنا۔''

میں اونگھ چلا تھا لیکن دروازہ جو دھڑام سے ہوا اور میخائل ماموں کی نشے میں دھت چیخ پکار ابھری اور گڑبڑ شروع ہو گئی تو میں جاگ پڑا۔ میرے کان میں ایک عجیب سی آواز آئی:

''جنت کا دروازہ کھلنے کی گھڑی آ گئی۔''

''ارے چراغ کے تیل میں ذرا سی شراب ملا کر دو اسے، اس میں تھوڑی سی کالک بھی ملا دینا۔ آدھا گلاس تیل، آدھا گلاس شراب اور ایک بڑا چمچہ بھر کے کالک۔''

''ارے ذرا مجھ کو تو دکھا دو اسے'' میخائل ماموں بار بار کہتے جا رہے تھے۔

وہ زمین پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ پھیلی ہوئی ٹانگوں کے بیچ میں تھوکتے جا رہے تھے اور زمین پر ہاتھ مار رہے تھے۔

تندور پر گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے میں نیچے اترا لیکن جیسے ہی اپنے ماموں کے نزدیک پہونچا انہوں نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں دھڑام سے گر پڑا اور میرا سر زمین سے ٹکرا گیا۔

''بیوقوف'' میں ایک دم چیخا۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے، مجھے گھسیٹا اور گرجتے ہوئے مجھے اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا اور چیخے:

''تندور پر پٹک کر چیتھڑے چیتھڑے کر دوں گا۔''

جب مجھے ہوش آیا تو میں بیٹھک کے مقدس شبیہوں والے کونے میں اپنے نانا کے گھٹنوں پر سر رکھے لیٹا تھا۔ وہ مجھے جھکورے دے رہے تھے اور ان کی آنکھیں چھت سے لگی ہوئی تھیں، دھیرے دھیرے بڑبڑاتے جا رہے تھے:

''کسی کی بخشش نہیں ہوگی، ہم میں سے کسی کی بخشش نہیں ہوگی۔''

ان کے سر کے اوپر لگا مقدس شبیہہ والا چراغ خوب روشن تھا، کمرے کے بیچوں بیچ بھی ایک شمع جل رہی تھی اور کھڑکی سے جاڑوں کی دھندلی صبح جھانک رہی تھی۔

''کہاں دکھتا ہے بیٹا؟'' میرے نانا نے مجھ پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

میں کیا بتاتا؟ ہر جگہ دکھ رہی تھی۔ سر پسینے میں تر تھا، جسم سیسے کی طرح بھاری تھا مگر ان کے بارے میں زبان کھولنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف ہر چیز اجنبی سی لگ رہی تھی۔ کمرے میں زیادہ تر کرسیوں پر ایسے لوگ بیٹھے نظر آ رہے تھے جن کو میں پہچانتا بھی نہیں تھا۔ ایک بڈھا پادری تھا عنابی رنگ کی عبا پہنے، ایک بوڑھے بزرگ سے آدمی عینک لگائے فوجی لباس پہنے اور کئی لوگ اور۔ وہ سب کے سب بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ لکڑی کی مورتیوں کی طرح، جیسے کسی چیز کا انتظار کرتے کرتے جم گئے ہوں۔ سب کے کان پانی کی ایک عجیب سی چھپا چھپ پر لگے ہوئے تھے جس کی قریب ہی کہیں سے آواز آ رہی تھی۔ یاکوف ماموں دونوں ہاتھ پیچھے باندھے بیچوں بیچ دروازے میں سیدھے کھڑے تھے۔

''لو اسے لے جا کر سلا دو، یاکوف'' نانا ابا نے کہا۔

میرے ماموں نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں چپکے چپکے نانی اماں کے کمرے کی طرف چلے۔ جب میں بستر میں گھس کے لیٹنے لگا تو یاکوف ماموں آہستہ سے بولے:

''تمہاری نتالیا ممانی مر گئیں...''

اس بات پر مجھے کوئی خاص تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ پچھلے کئی دنوں سے وہ گھر میں کہیں چلتی پھرتی نہیں دکھائی دیتی تھیں، باورچی خانے میں یا میز پر کھانا کھانے بھی نہیں آتی تھیں۔

''نانی اماں کہاں ہیں؟''

''وہاں ہیں، اندر'' انہوں نے ہاتھ گھما کر کہا۔ وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ ننگے پاؤں، پنجوں کے بل چلتے ہوئے۔

میں بستر میں اکیلا لیٹا ہوا ادھر ادھر تک رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں پر چندھی چندھی، سفید بالوں والی شکلیں چپکی ہوئی تھیں۔ کونے میں بکس کے اوپر نانی اماں کا لباس ٹنگا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ لباس ہے لیکن اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی زندہ انسان ہو جو اندھیرے میں کونے میں دبکا ہوا ہے۔ میں نے ایک آنکھ دروازے پر رکھتے ہوئے اپنا سر تکیئے میں چھپالیا۔ جی چاہتا تھا جست بھر کر اٹھوں اور غائب ہو جاؤں۔ کمرے میں گرمی بہت تھی اور سارے گھر میں ایک ایسی بو پھیلی ہوئی تھی جس سے مجھے بار بار یاد آتا تھا کہ تسیگا نوک کسی طرح مرا تھا اور کسی طرح اس کا خون باورچی خانے کے فرش پر بہہ گیا تھا۔ میرا دماغ یا شاید میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس گھر میں میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے بعد مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پہیئے میرے وجود پر سے گذر رہے ہوں۔ مجھے پیستے ہوئے، کچلتے ہوئے، مٹاتے ہوئے۔

آہستہ سے دروازہ کھلا اور نانی اماں دبی سکڑی اس میں سے اندر آئیں۔ انہوں نے اپنے کندھے سے ٹھیل کے دروازہ بند کیا اور پھر اس کے سہارے ٹک مقدس شبیہہ والے چراغ کی نیلی لو کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے۔

''آہ میرے ہاتھ، میرے بیچارے ہاتھ۔ کتنی تکلیف ہوئی ہے ان میں'' وہ بچوں کے سے ٹھنٹھناتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہتی جا رہی تھیں۔

اسی سال موسم بہار میں جائداد کا بٹوارہ ہوا۔ یاکوف ماموں شہر ہی میں رہے اور میخائل ماموں دریا پار چلے گئے۔ نانا ابا نے پولیوایا گلی میں ایک نیا مکان خریدا جس میں نیچے شراب خانہ تھا اور اوپر ایک کھپریل کا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک باغ تھا جس سے پہاڑی نالہ دکھائی دیتا تھا۔ اور اس کے آس پاس بید کا گھنا جنگل تھا۔

''چابکیں تو بہت سی ہیں'' میرے نانا ابا میری طرف آنکھ مار کے مسکراتے ہوئے بولے۔ ہم دونوں

باغ کا معائنہ کرنے کے لئے نرم نرم روشوں پر چل رہے تھے جن پر برف پگھل رہی تھی۔ ''اب جلد ہی تمہاری پڑھائی شروع کرنے والا ہوں۔ تب یہ بیدیں خوب کام آئیں گی۔''

گھر کے زیادہ تر حصوں میں کرایہ دار رہتے تھے۔ نانا ابا نے صرف اپنے اور آنے جانے والوں کے لئے اوپر کی منزل میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ میں اور نانی اماں دو چھتی کے کمرے میں رہتے تھے۔ اس کمرے کی کھڑکی نیچے گلی کی طرف کھلتی تھی اور اس میں جھک کر میں شام کے وقت یا چھٹیوں کے موقع پر شرابیوں کو نیچے شراب خانے سے نکلتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ گلی میں لڑھکتے بھٹکتے چلتے اور شور مچاتے ہوئے گرتے۔ کبھی ان کو آٹے کی بوریوں کی طرح شراب خانے سے باہر لڑھکا دیا جاتا لیکن وہ رینگ کر پھر دروازے کے پاس پہنچ جاتے۔ دروازہ اپنے زنگ آلودہ قبضوں پر چوں سے بند ہو جاتا اور شیشوں کی جھنکار سنائی دیتی، پھر جھگڑا ہونا شروع ہوتا۔ اوپر سے یہ سب قضیئے دیکھنے میں بڑا مزہ آتا۔ نانا ابا روز اپنے بیٹوں کی دوکانوں پر جاتے تاکہ انہیں کام چالو کرنے میں مدد دیں۔ شام کو تھکے ہارے جھنجھلاتے ہوئے واپس آتے۔

نانی اماں سلائی میں لگی رہتیں، کھانا پکاتیں اور باغ میں گڑائی کرتیں۔ سارے دن وہ اسی طرح چکر کاٹتی رہتیں جیسے وہ کوئی بھاری سالٹو ہوں جو غیر مرئی اسپرنگوں پر ناچ رہا ہو۔ چٹکی میں نسوار بھر کر ناک میں لیتیں، بڑے مزے میں چھینکتیں اور اپنا پسینے میں تر چہرہ پونچھتے ہوئے کہتیں:

''فرشتوں پر اور خدا کے پیاروں پر ہمیشہ ہمیشہ صلوٰۃ ہو! آخر کار ہماری زندگی میں سکون آیا الیوشا، میرا کبوتر و بوتر! پاک مریم کا شکر ہے کہ اب ہماری سب بات بن گئی۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا!''

لیکن ہم لوگوں کی زندگی مجھے تو کوئی خاص پرسکون نظر نہیں آتی تھی۔ صبح سے شام تک کرایہ دار لوگ احاطے میں ادھر ادھر بھاگتے پھرتے تھے۔ پڑوسنیں آن آن کر جھانکتیں۔ انہیں ہمیشہ کہیں جانے کی جلدی پڑی رہتی ہمیشہ کہیں پہونچنے میں دیر ہونے کی آفت مچائے رہتیں، ہمیشہ کہیں نہ کہیں جانے کی تیاری کرتی رہتیں۔

''اکولینا ایوانونا'' وہ میری نانی اماں کو آواز دیتیں اور اکولینا ایوانونا ان سب کی طرف دیکھ کر اپنے دوستانہ انداز میں مسکراتیں، سب کی باتیں غور سے سنتیں اور نسوار چٹکی میں دبا کے سونگھتی جاتیں، وہ بڑے قاعدے سے ناک پونچھتیں اور پھر انگلیاں سرخ رومال سے صاف کرتی جاتیں اور کہتیں:

''جوؤں کے مارنے کے لئے؟ ذرا جلدی جلدی حمام میں نہایا کرو بیٹی اور اگر پیر منٹ کے تیل کی بھاپ لے لیا کرو تو سب سے اچھا ہے۔ لیکن اگر جوئیں کھال کے اندر بیٹھ گئی ہیں تو ایک چمچہ بطخ کی چربی لو۔ بالکل خالص والی چربی، تھوڑا سا پارے کا ست اور تین قطرے پارہ۔ اسے کسی چینی یا شیشے کے چمچے سے خوب ملا کر سات بار حل کر لو۔ کسی لکڑی یا ہڈی کے چمچے سے ہرگز نہ ملانا ورنہ پارہ ضائع ہو جائے گا۔ اور نہ ہی چاندی یا تانبے کے چمچے سے ملانا۔ اس سے مضر ہوگا۔''

کبھی کبھی وہ کافی غور کرنے کے بعد جواب دیتیں:

''بہن، تم پیر آصف سے مل لو پیچورے کے گرجے جا کر۔ تمہارے سوال کا جواب دینا میرے بس کے باہر ہے۔''

وہ لوگوں کے یہاں زچگیاں کراتیں، خاندانوں کے آپسی جھگڑے چکاتیں، بیمار بچوں کے لئے دوائیں دیتیں، کوئی عورت اپنی بگڑی قسمت بنانے کے سلسلے میں ان سے ''بی بی مریم کا خواب'' والی دعا پڑھنے اور سیکھنے کے لئے آتی۔ تو کہیں امور خانداری میں ان سے مشورے کئے جاتے:

''کھیرا تو خود بخود منہ سے بولتا ہے کہ کب آچار پڑنے کا وقت ہے جب اس میں سے سوندھی خوشبو آنی بند ہو جائے تب اس کو نمک لگا کے ڈالنا چاہئے۔ کو اس شراب میں جان پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خوب چلاؤ، خوب پھینٹو اسے۔ چونکہ کو اس جیسی شرابیں مٹھاس نہیں قبول کرتیں اس لئے ان میں چند عدد کشمش ڈال دو یا زیادہ سے زیادہ ایک بالٹی میں چمچہ بھر شکر۔ ہاں ہاں رائتے کی بہت سی ترکیبیں ہیں۔ ڈینوب والا طریقہ الگ ہے، ہسپانوی طریقہ اور ہے اور پھر قفقاز کا بھی طریقہ ہے...''

میں سارے سارے دن ان کی دم لگا کر گھوما کرتا، کبھی احاطے احاطے میں، کبھی باغ میں، کبھی پڑوسیوں کے یہاں جہاں وہ گھنٹوں بیٹھی چائے پیا کرتیں اور قصے سنایا کرتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں بھی ان کے وجود کا ایک حصہ بن گیا ہوں۔ اور مجھے اپنی زندگی کے ان دنوں کی اور کوئی یادیں اتنی گہری نہیں ہیں جتنی اس نیک دل، ان تھک کام کرنے والی، محبت شعار عورت کی۔

تھوڑے تھوڑے عرصے بعد میری ماں کبھی کبھی آجاتی تھیں۔ ان میں ابھی تک وہی طنطنہ اور سختی تھی، ہر چیز کو ایسی بے پروائی، بے نیازی اور حقارت سے دیکھتی تھیں جیسے ان کی آنکھیں نہ ہوئیں۔ جاڑوں کی ٹھٹھرتی بے جان دھوپ ہوئی۔ پھر وہ بہت جلد غائب ہو جاتیں کچھ اس طرح کہ ان کی یاد بھی کھو جاتی۔

ایک دن میں نے نانی اماں سے پوچھا:

''نانی اماں، کیا آپ جادوگرنی ہیں؟''

''لواور سنو! ارے یہ تو نے کیسے سوچا کہ میں جادوگرنی ہوں؟ تجھے یہ خیال کیسے آیا'' ہو ہنسنے لگیں۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد سنجیدہ ہوگئیں اور بولیں ''بھلا میں کیا بچاری جادوگرنی بنونگی۔ جادوگرنی ہونے کے لئے تو بہت علم کی ضرورت ہے۔ اور میں نے الف کے نام ب بھی نہیں جانتی۔ دیکھو تمہارے نانا کتنے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ لیکن پاک بی بی مریم نے اس میں مصلحت نہیں سمجھی کہ مجھے علم حاصل کرنے کے لائق بناتیں۔''

پھر انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اور رخ مجھے بتایا:

''میں بھی یتیم تھی بیٹا۔ میری ماں بے چاری بیوہ تھیں اور اوپر سے اپاہج۔ جب وہ ایک امیر گھر میں نوکرانی تھیں تو ان کے مالک نے ایک دن رات کو ڈرایا تھا، تو وہ کھڑکی سے کود پڑی تھیں۔ بس جس طرف کو گریں ادھر کا ہاتھ اور کندھا بے کار ہوگیا۔ وہ لیس بنانے میں بڑی ماہر تھیں۔ مگر سوچو ذرا کہ گرنے کے بعد سے ان کا دھنا ہاتھ بس سوکھتا ہی چلا گیا اور بالکل ٹھٹھر گیا۔ پھر مالک کو رکھنے میں کیا فائدہ تھا۔ نکال باہر کیا۔ پھر وہ جس طرح بھی بن پڑا اپنے دن گذارتی رہیں۔ مگر ایک ہاتھ سے لنجی بھلا کیا کرتیں کیا نہ کرتیں۔ اس لئے انہوں نے بھیک مانگنی شروع کر دی۔ لیکن اس زمانے میں بالاخنا میں لوگوں کی حیثیت بھی اچھی تھی اور ذرا خدا ترس بھی تھے۔ ایسے ایسے دل والے ہنر مند مستری اور بڑھئی اور لیس بنانے والے تھے کہ کیا کہوں۔ اس لئے میں اور میری ماں دونوں شہر بھر میں بھیک مانگا کرتے تھے۔ خزاں میں بھی، جاڑوں میں بھی۔ لیکن جب جبرئیل علیہ السلام اپنی تلوار اٹھاتے اور برفباری نوک دم بھاگتی اور زمین پر بہار چھا جاتی تو پھر جہاں تک ہمارے پاؤں ساتھ دیتے ہم دور دور نکل جاتے۔ شہر موروم تک پہنچتے، یورئے ویتس کی خبر لاتے اور والگا اور اوکا کے کنارے کنارے چلتے جاتے۔ آہ! موسم بہار میں اور گرمیوں میں زمین پر چلنے میں کتنا لطف آتا ہے۔ قدموں تلے دھرتی کتنی نرم لگتی ہے، گھاس جیسے مخمل بچھا ہو، چاروں طرف پاک مریم کے اگائے ہوئے پھول جو اس نے ہمیں مسرت بخشنے کے لئے پیدا کئے ہیں اور چاروں طرف دل خوش کن میدان پھیلے ہوئے۔ پھر میری ماں اپنی نیلی آنکھوں کو نیم وا کر کے گانا شروع کرتیں اور ان کے گیت فرفر کرتے ہوئے آسمانوں کی طرف پرواز کرنے لگے۔ ان کی آواز بڑی میٹھی اور ہلکی ہلکی

تھی۔اور چاروں طرف ایسا سناٹا چھا جاتا تھا جیسے کائنات نے ان کا گیت سننے کے لئے سانس روک لی ہو۔اس وقت بھیک مانگنے میں بھی کتنا لطف آتا تھا! لیکن جب میرا دسواں سال شروع ہوا تو میری ماں کو مجھے ساتھ لے کر بھیک مانگتے مانگتے لاج آنے لگی کیونکہ اس میں بے عزتی ہوتی تھی۔اس لئے وہ مستقل طو ر پر بالاخنا میں رہنے لگیں۔وہاں وہ اکیلی۔وہاں وہ اکیلی ہی در بدر پھرا کرتیں اور چھٹیوں کے دن گرجا گھر کے پاس بھیک مانگتیں۔اور میں گھر پر بیٹھی لیس بنانا سیکھا کرتی۔ مجھے اپنی امی کی مدد کرنے کی اتنی جلدی پڑی رہتی تھی کہ میں سب کچھ بھول کر دن رات کام میں جٹی رہتی۔کبھی کبھی نمونے بگڑ جاتے اور میں بیٹھ کر آنسو بہایا کرتی۔لیکن دیکھو،تقریباً دو سال سے کچھ اوپر ہوئے تھے کہ میں نے لیس بننے کا فن پوری طرح سیکھ لیا اور میری شہرت شہر بھر میں پھیل گئی۔جب بھی کسی کو کوئی خاص کام بنوانا ہوتا تو وہ میرے پاس آتے اور کہتے ''چلو بھئی اکولینا،شروع کرو،اپنا لٹو گھمانا!'' اور اس سے مجھے کیسی کچھ خوشی ہوتی! یقیناً اس میں میری کوئی تعریف نہ تھی بلکہ میری ماں کی تعریف تھی جس نے مجھے لیس بنانا سکھایا تھا۔کیا ہوا اگر وہ اپنے ایک ہاتھ سے خود کام نہیں کر سکتی تھیں۔وہ سکھانا تو جانتی ہی تھیں اور ایک اچھا کاریگر دس مزدوروں پر بھاری ہوتا ہے۔مجھے بڑا فخر محسوس ہوتا۔اکثر ان سے کہتی ''امی اب تم بھیک مانگنا چھوڑ دو۔اب میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں کما کر کھلا سکتی ہوں۔'' میری ماں کہتیں ''چل،چپ رہ! تجھے معلوم نہیں۔اس روپئے سے تو تیرا جہیز خریدا جائے گا۔'' اس کے فوراً ہی بعد تمہارے نانا وارد ہو گئے۔بڑے گبرو جوان تھے اس وقت۔ ان کی عمر تو صرف بائیس ہی برس کی تھی کہ وہ جہاز کے بڑے قلی بن گئے! ان کی اماں مجھ کو دیکھنے آئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ میں کس قدر غریب تھی۔ایک فقیرنی کی لڑکی جس کی معنی تھے کہ میں ضرور فرمان بردار بیوی ثابت ہوں گی۔ہوں۔وہ خود کلچے بیچا کرتی تھیں اور بہت ہی بری طبیعت کی عورت تھیں۔لیکن اب مرے ہوؤں کی کیا برائی کروں! آخر ہمارے کہنے سے کیا ہوتا جب کہ خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔خدا دیکھتا ہے اور صرف شیطان کو ایسی باتوں کی پڑی رہتی ہے...''

وہ خوب جی بھر کے ہنسنے لگیں،ناک عجیب مضحکہ خیز طریقے سے کانپ رہی تھی اور آنکھوں سے میرے لئے محبت کی دھار پھوٹ رہی تھی،شفقت بھری،جو لفظوں سے زیادہ معنی رکھتی تھی۔

مجھے ایک شام خاص طور پر یاد ہے۔میں اور نانی اماں نانا کے کمرے میں چائے پی رہے تھے۔نانا ابا کی طبیعت اچھی نہیں تھی اور وہ اپنے پلنگ پر بغیر قمیص پہنے بیٹھے تھے،کندھوں پر ایک بڑی سی تولیہ لپٹی

ہوئی تھی جس سے وہ بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھتے تھے۔ان کی سانس گھراہٹ کے ساتھ اور تیز تیز چل رہی تھی، سبز آنکھیں دھندلی لگتی تھیں اور چہرہ سرخ اور بھربھرایا ہوا تھا۔نوکدار کان خاص طور پر بہت سرخ ہو رہے تھے اور جب انہوں نے چائے کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ اس بری طرح سے کانپ رہا تھا تھا کہ ترس آتا تھا۔وہ اس وقت بے حد مسکین لگ رہے تھے، بالکل بدلے ہوئے۔

''مجھے چینی کیوں نہیں دیتی ہو ذرا سی'' انہوں نے نانی اماں سے کچھ ایسے لہجے میں کہا جیسے کوئی لاڈلا بچہ ضد کر کے ٹھنک رہا ہو۔

''کیونکہ شہد تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے'' نانی اماں نے بڑی پیار سے مگر بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ کہا۔

بہت ہی ٹھنکتے اور بڑبڑاتے ہوئے نانا ابا نے چائے حلق میں انڈیلی۔

''دھیان رکھنا، مر نہ جاؤں کہیں!''

''نہیں نہیں، فکر نہ کرو، میں دھیان دے رہی ہوں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔کیونکہ اس وقت اگر میں مر گیا تو سمجھو میں اپنے لئے ایک لمحہ بھی نہیں جیا۔بے کار ہی جیا۔''

''اچھا بس اب آپ لیٹ جایئے اور زیادہ باتیں نہ کیجئے۔''

وہ ایک منٹ تک تو چپ چاپ لیٹے اپنے نیلے ہونٹ چاٹتے رہے، پھر ایک دم اٹھ بیٹھے جیسے کسی نے ان کے چٹکی بھر لی ہو۔

''وروارا کی ماں، دیکھو، وہ میخائل اور یاکوف کی شادی بھی تو کرنی ہے، جلد از جلد۔ممکن ہے بیویاں آجائیں، کچھ بچے اور ہو جائیں تو ان کی وحشت کچھ گھٹے۔کیوں؟''

شہر میں جتنی لڑکیاں شادی کے لائق تھیں ان سب کے نام انہوں نے لینے شروع کر دئے اور میری نانی اماں خاموش بیٹھی، چائے کے گلاس پر گلاس پیتی رہیں۔نانا ابا نے مجھ کو باہر جانے سے تو منع ہی کر رکھا تھا کہ کہیں کچھ الٹی سیدھی نہ کر بیٹھوں۔اس لئے میں کھڑکی پر بیٹھا ڈوبتے ہوئے سورج اور مکانوں کی کھڑکیوں پر پڑتے ہوئے اس کے لال لال عکس کو دیکھ رہا تھا۔

نیچے باغ میں بھڑوں کے دل کے دل بید کی جھاڑیوں پر اڑتے پھر رہے تھے۔پڑوس کے احاطے

میں ایک بڑھئی اپنی ہتھوڑی سے کھٹ کھٹ کر رہا تھا اور قریب ہی سے مجھے دھار تیز کرنے والی مشین کی کھچر کھچر سنائی دے رہی تھی۔ باغ کے اس پار نالے کی طرف سے گھنی جھاڑیوں میں بچوں کے کھیلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا دل بے اختیار تڑپ رہا تھا کہ میں بھی جا کر ان کے ساتھ کھیلوں اور دل پر عجیب سی شام کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔

یکا یک میرے نانا نے ایک کتاب نکالی، بالکل نئی کتاب۔ اپنی ہتھیلی پر اس کے ورق پھٹا پھٹ پھٹ کرنے لگے اور بڑی مسرت بھری آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئے:

''چل بے نکمے! کیا پنکھے سے کان لئے گھوم رہا ہے۔ ادھر آ، بیٹھ یہاں، چندھی شکل! دیکھتا ہے یہ حرف؟ یہ الف ہے۔ سمجھا؟ الف سے انڈا۔ ب سے بکری۔ ج سے جہاز۔ یہ کیا ہے؟''

''ب سے بکری۔''

''ٹھیک! اور یہ؟''

''ج سے جہاز۔''

''غلط! الف سے انڈا ہے! غور سے دیکھ۔ س سے سوار۔ ی سے یکہ۔ ف سے فوارہ۔ یہ کیا ہے؟''

''ی سے یکہ۔''

''ٹھیک ہے! اور یہ؟''

''س سے سوار۔''

''شاباش! اور یہ؟''

''الف سے انڈا۔''

نانی بیچ میں بولیں:

''وروارا کے ابا، آپ ذرا دیر چپ چاپ لیٹتے تو زیادہ اچھا ہوتا آپ کے لئے۔''

''چپ رہو۔ اپنی پریشانیاں بھلانے کے لئے یہ بہترین شغل ہے میرے لئے۔ ہاں الیکسئی بیٹا، چلا چل!''

انہوں نے اپنا گرم پسینے میں بھیگا ہوا بازو میرے گلے میں ڈال دیا اور دوسرے میں کتاب اٹھا کر تقریباً میری ناک سے لگا دی۔ نانا کے جسم سے پسینے، سر کے اور پکی ہوئی پیاز کی بو آنے لگی جس سے میرا

دم گھٹا جا رہا تھا۔ ایک عجیب سا اشتیاق ان پر طاری ہو گیا تھا۔ میرے کان میں چیخے:

''ل سے لومڑی! ک سے کباب!''

یہ الفاظ تو میں نے سنے تھے لیکن حروف میں اور الفاظ میں کوئی مشابہت ہی نہ تھی۔ ل تو لومڑی کے بجائے کیڑا سا لگتا تھا، م ٹیڑھا لگتا تھا مستری گریگوری کی طرح، اور ن کی توند دیکھ کر مجھے خیال ہوتا تھا کہ میں اور نانی اماں ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے ہیں۔ البتہ ہر حرف میں تھوڑی سی مشابہت نانا ابا کی سی ضرور لگتی تھی۔ وہ کبھی سلسلے وار کبھی بیچ بیچ میں سے پڑھ کر مجھے حروف پہچاننے کی مشق کرواتے رہے یہاں تک کہ ان کا جوش مجھ میں بھی سرائت کر گیا۔ میں بھی زور زور سے چیخنے لگا اور مجھے بھی پسینہ آنے لگا۔ ان کو یہ بات بڑی عجیب لگی اور وہ مجھ پر ہنسنے لگے، ہنسنے سے کھانسی کا ایک دورہ پڑا۔

''دیکھتی ہو وروارا کی ماں کیا فر فر سیکھ رہا ہے'' وہ اپنا سینہ اور کتاب پکڑے کھانستے ہوئے بولے۔

''تھو... تم تو استراخان کی بلا ہو۔ کیا تضیع اوقات کر رہی ہو؟''

''آپ خود تضیع اوقات کر رہے ہیں...''

نانی اماں میز پر اپنی کہنیاں ٹکائے، دونوں مٹھیوں پر دونوں رخسار جمائے بڑے پر مذاق انداز میں ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں اور مجھے اپنے نانا اور نانی کو دیکھ کر بڑا مزہ آ رہا تھا۔

''اچھا اب بس کرو دونوں۔ کیوں چیخ چیخ کر کھوپڑی خالی کر رہے ہو'' وہ بولیں۔

میرے نانا بڑے دوستانہ انداز میں میری طرف مڑے اور ایسے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے جیسے صفائی پیش کر رہے ہوں:

''ارے میں تو بیمار ہوں نا۔ آواز نکل نہیں رہی، اس لئے چیخ رہا ہوں۔ مگر تو کیوں چیخ رہا ہے؟''

مگر تو کیوں چیخ رہا ہے؟''

پھر انہوں نے اپنا پسینے سے بھیگا ہوا سر ہلایا:

''مرحومہ نتالیا جو جمایا کرتی تھی نا کہ اس کا حافظہ خراب ہے تو وہ غلط کہتی تھی۔ اس کی یادداشت تو ایسی ہے جیسے گھوڑے کی۔ ہوں، چل بے نک پھلے!''

آخر کار انہوں مذاقیہ انداز میں مجھے پلنگ پر سے ڈھکیلا۔

''بس، بس ہوا! اب کتاب کو چپکا رہنا۔ سمجھا؟ کل پوری ابجد یاد کر کے مجھے سنانا اور اگر سب ٹھیک

سنا دیا تو پانچ کو پک انعام ملیں گے۔''

جب میں نے کتاب اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑے درد سے بولے:

''ہائے تیری ماں تجھے کیوں چھوڑ کے چلی گئی بیٹے؟''

''اچھا اچھا۔ اب رہنے دیجئے وروارا کے ابا'' نانی اماں نے ان کی بات کاٹی۔ ''ایسی باتوں سے فائدہ؟''

''میں کبھی ذکر نہ کرتا لیکن کیا کروں اس بات کے صدمے سے مجبور ہوں۔ ہائے کیا لڑکی تھی اور کیا برباد ہوئی...''

انہوں نے جلدی سے مجھے الگ دھکیلا۔

''باہر جا، کھیل۔ مگر دیکھ گلی میں مت جانا۔ احاطے میں یا باغ میں کھیلنا۔ سمجھا؟''

باغ میں جانے کیلئے تو مر ہی رہا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جیسے ہی میں کنارے پر پہونچوں گا نالے پر جولڑکے کھیل رہے تھے وہ مجھ پر پتھر پھینکیں گے اور میں بھی ان سے بدلہ لینے پر اتارو تھا۔

''وہ آ گیا پلا'' وہ لوگ مجھے دیکھتے ہی چیخنے لگے۔ ''لینا، وہ گیا'' انہوں نے جلدی جلدی حملے کا سامان اکٹھا کرتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ''پلا'' کیا ہوتا ہے اس لئے اس نام سے ہتک محسوس نہ ہوئی لیکن اتنے بہت سے دشمنوں کے مقابلے میں اپنے کو اکیلا پا کر ایک عجیب سا جوش محسوس ہو رہا تھا اور اس خیال سے خوشی ہو رہی تھی کہ اگر ٹھیک سے نشانہ لگا کے ایک پتھر بھی پھینکو تو یہ سب دشمن بھاگ کھڑے ہوں گے اور جھاڑیوں کی اڑ میں گھس جائیں گے۔ اس طرح کی لڑائیوں کے بعد دل میں نہ تو کوئی کینہ رہتا تھا نہ یہ خیال کہ کتنی چوٹ لگی۔

میں نے ابجد بہت جلد سیکھ لیا اور غالباً اسی وجہ سے اب نانا ابا میری طرف توجہ بھی زیادہ کرتے تھے اور مارتے بھی کم تھے۔ حالانکہ میرے خیال میں اب مجھ پر زیادہ ''چاٹ'' پڑنی چاہئے تھی۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا نانا ابا کے بنائے ہوئے سارے قاعدہ قانونوں کو توڑنے لگا۔ لیکن وہ بس یا تو مجھے جھوکتے ڈانٹتے یا مکا دکھا کر رہ جاتے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پہلے تو انہوں نے اکثر مجھ کو بلا وجہ ہی مارا ہے اور ایک دن میں نے یہ

بات ان سے کہہ دی۔

انہوں نے میری ٹھڈی کے نیچے ایک ٹہوکا دیا اور میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولے:

''کیا؟''

''ارے او بے ایمانئے! تو کون ہوتا ہے یہ طے کرنے والا کہ کتنی چاٹ پڑے تجھے؟ یہ بات تو بس میں ہی جانتا ہوں۔ دور ہو!''

لیکن مڑا ہی تھا کہ انہوں نے میرا کندھا پکڑ لیا اور پھر میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا:

''کیوں بے تو چلتا پرزہ بنے گا کہ بدھو؟''

''معلوم نہیں۔''

''معلوم نہیں؟ تجھے معلوم نہیں تو ٹھہر میں تجھے بتاتا ہوں۔ چلتا پرزہ بننا! بدھو بننے سے کہیں بہتر ہے۔ بھیڑیں بدھو ہوتی ہیں، سمجھا؟ اب چل باہر بھاگ۔ کھیل جا کے...''

جلد ہی میں حرف حرف کر کے، ہجے کر کے دعاؤں کی کتاب پڑھنے لگا۔ عام طور پر یہ کام شام کی چائے کے بعد ہوتا تھا اور ہر بار مجھے پورا وظیفہ پڑھنا پڑتا تھا۔

''م سے مرغا، ب سے بکری، الف سے انڈا، ر سے ریل، ک سے کباب۔ ملا کر ہوا مبارک۔ ہ سے ہرن، ی سے یکہ۔ ہے۔ مبارک ہے نام...'' میں ہجے کر کر کے پڑھتا جاتا اور اپنی شہادت کی انگلی سطروں کے نیچے چلاتا جاتا اور اتنا اکتا جاتا کہ ہر طرح کے بے تکے سوالات پوچھتا جاتا:

''مبارک کون ہے؟ یا کوف ماموں؟''

''ایک جھانپڑ دوں گا سر پر تب تجھے معلوم ہوگا مبارک کون ہے'' نانا غراتے ہوئے کہتے۔ لیکن مجھے پتہ چل جاتا کہ ان کا غصہ بناوٹی تھا۔ وہ تو صرف اپنا رعب قائم رکھنے کے لئے عادتاً ہی غصہ کیا کرتے تھے اور میرا یہ خیال غلط بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایک ہی منٹ بعد نانا ابا میرے وجود تک کو بھول جاتے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے:

''ہاں ہاں گیت گانے کو کہہ دو، بجانے کو کہہ دو تو حضرت داؤد بن بیٹھے گا اور کام کو کہو تو بھانڈ، مداری، مسخرہ!...تھو...و...و، کیا لوگ ہیں! اور پوچھو بھلا بجانے سے کیا بنائے گا بھائی تو؟ کچھ بھی تو نہیں۔''

میں اپنا پڑھنا چھوڑ کر ان کی بات سننے لگتا اور سر اٹھا کر ان کے بل پڑے ہوئے پریشان چہرے کی طرف تکنے لگتا۔ ان کی سکڑی ہوئی آنکھیں دور خلا میں دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور ان میں ایک ایسا گہرا دکھ بھرا ہوا نظر آتا تھا جس سے ان کی ہمیشہ چھائی رہنے والی سختی پگھلتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ سنہری بھوئیں کپکپاتیں اور جب وہ گھبراہٹ کے عالم میں میز پر انگلیوں سے طبہ بجانے لگتے تو رنگے ہوئے ناخن چمکنے لگتے۔

''نانا ابا!''

''ہوں؟''

''مجھے کہانی سنائیے ایک۔''

وہ اپنی آنکھیں ملتے جیسے ابھی ابھی نیند سے چونکے ہوں۔

''تو اپنا سبق پڑھ، کاھل الوجود'' وہ بڑبڑائے۔ ''بس تیرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ دعاؤں کی کتاب چھوڑ کر پریوں کی کہانیاں سنا کرے۔''

ویسے مجھے شک تھا کہ غالباً ان کا بھی یہی جی چاہتا تھا کہ دعاؤں کی کتاب چھوڑ کر پروں کی کہانیاں سنیں۔ اگرچہ ان کو دعاؤں کی کتاب تقریباً زبانی یاد تھی کیونکہ انہوں نے عہد کیا تھا کہ روز رات کو سونے سے پہلے اس میں سے کچھ دعائیں زور زور سے پڑھا کریں گے یا اس طرح گا گا کر جس طرح گرجے میں پادری صاحب مناجات پڑھا کرتے تھے۔

میں ان سے کہانی کہنے کے لئے ان کے سر ہو گیا۔ آخر کار وہ مان گئے۔

''اچھا۔ اچھی بات ہے! تجھے تو ساری زندگی ہی مناجات پڑھنی ہے مگر میں کہاں رہوں گا۔ میں تو اب بہت جلدی اپنے مالک کے سامنے جانے والا ہوں جو تخت انصاف پر بیٹھا ہوگا۔''

پھر وہ اپنی پرانی آرام کرسی کے کنگورے پر سہارا لے کر لیٹ گئے، سر پیچھے کو جھکا لیا، آنکھیں چھت سے لگا لیں اور پرانے زمانے کی یاد میں کھو گئے:

''ایک بار بالاخنا میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ سوداگر زالیف کو لوٹنے کے لئے گھس پڑا۔ میرے نانا ابا کے ابا کو پتہ چل گیا اور وہ گرجے کے مینار پر چڑھ گئے تاکہ گھنٹیاں بجائیں اور لوگوں کو خبردار کریں۔ لیکن ڈاکوؤں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نیچے پھینک دیا۔

''میں اس وقت بالکل بچہ تھا۔ میں نے دیکھا بھی نہیں کہ یہ سب کیسے ہوا اور مجھے کچھ یاد بھی نہیں۔ جب کہ 1812 میں فرانسیسی آئے تو تب سے مجھے یاد ہے کہ کیا کیا ہوا۔ اس وقت میں صرف بارہ سال کا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت ایک مرتبہ لوگ تیس قیدیوں کو بالاخانہ ہنکاتے ہوئے لائے تھے۔ سب چھوٹے چھوٹے، سوکھے سوکھے، جو چیتھڑا تھڑا مل گیا وہ پہنے ہوئے۔ فقیروں سے بدتر، بوٹی بوٹی کانپتی ہوئی، ٹھٹھرتی ہوئی۔ بعض بعض کے تو ہاتھ پاؤں ٹھٹھر کر رہ گئے تھے یہاں تک کہ وہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ کسان ان کو مار ڈالنا چاہتے تھے مگر ان کے ساتھ پہرہ تھا، اس نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ پھر گارڈ دستے سے کچھ اور سپاہی بلوائے گئے اور کسان بھاگ گئے۔ پھر سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ ہم عادی ہو گئے۔ فرانسیسی نکلے بڑے تیز اور کائیاں، بڑے خوش مزاج اور زندہ دل۔ کبھی کبھی گیت گانے بجانے کی محفل بھی جما دیتے۔ نیو نی سے بڑے بڑے لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر ان کا تماشا دیکھنے جاتے تھے۔ جو لوگ آتے تھے ان میں سے کچھ لوگ فرانسیسیوں کو گالی دیتے اور ان پر دانت پیستے، ان کو مار بھی بیٹھتے۔ بعض لوگ ان کی ہی زبان میں ان سے نرمی سے بات کرتے، ان کو روپئے دیتے اور ان کا دکھ کم کرنے کی کوشش کرتے۔ مجھے ایک بوڑھے شخص کا خیال آتا ہے۔ شریف اور امیر آدمی تھے۔ انہوں نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ''ذرا دیکھو تو، اس جلاد نپولین نے فرانسیسیوں کی کیا درگت بنائی ہے'' وہ کہنے لگے۔ ''ذرا سوچو تو ایک تو روسی۔ اور پھر اوپر سے امیر۔ اور پھر اتنا نیک دل، غیر ملکیوں پر ترس کھانے والا۔''

ایک منٹ نانا ابا چپ رہے، آنکھیں بند کئے، وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ روک روک کر اپنی بات جاری کر دی جیسے اپنی یادداشت کو دھیرے دھیرے کریدر ہے ہوں۔

''اس وقت برف کا طوفان آیا ہوا تھا۔ سردی بڑی قیامت کی تھی۔ فرانسیسی دوڑے دوڑے آتے اور ہماری کھڑکی کے نیچے جمع ہو کر میری ماں سے گرما گرم کلیجے مانگتے۔ وہ پھیری کر کے کلیجے بیچا کرتی تھیں۔ میری ماں ان کو جھونپڑی کے اندر تو نہ آنے دیتیں لیکن کھڑکی میں انہیں کلیجے پکڑا دیتیں۔ وہ کلیجے جھپٹ کر اپنی قمیصوں کیا اندر دبا لیتے بالکل دل میں گرم بھاپ دیتے ہوئے کلیجے جو تازہ تازہ دبا لیتے بالکل دل میں گرم بھاپ دیتے ہوئے کلیجے جو تازہ تازہ تنور سے نکلے ہوئے ہوتے۔ پتہ نہیں کیسے انہوں نے وہ سردی برداشت کی۔ بیچارے گرم ملک کے رہنے والے وہ یہ برف کا طوفان کیا جائیں۔ ان میں سے بہت

سے تو سردی سے مر ہی گئے۔ دو آدمی ہمارے حمام میں رہتے تھے، ایک افسر اور ایک اس کا ماتحت جس کا نام میرون تھا۔ افسر لمبا تھا اور بے حد دبلا۔ ہڈی چمڑا۔ اور وہ ایک زنانہ گاؤن پہنے گھوما کرتا تھا جو اس کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ وہ آدمی طبیعت کا اچھا تھا لیکن بے حد شرابی۔ میری اماں چھپا کر بیئر بناتی اور بیچتی تھیں۔ وہ بیئر جریدتا اور پی کر بدمست ہو جاتا تو اپنے یہاں کے گیت گایا کرتا تھا۔ ہماری زبان میں بھی اس نے شد بد سیکھ لی تھی۔ کہتا ''تمہارا ملک سفید نہیں۔ سخت ہے، کالا ہے''۔ ویسے ٹوٹی پھوٹی بات کرتا تھا لیکن اس کی بات سمجھ میں آ جاتی تھی اور وہ ٹھیک بھی تھی ہمارے ادھر شمالی حصے میں نرمی کا تو نام شان نہیں۔ ہاں والگا سے نیچے کی طرف چلے جاؤ تو زمین کی نرمی اور گرمی بڑھتی چلی جاتی ہے اور کیسپین کے پاس تو برف بالکل ہے ہی نہیں۔ یقیناً اس بات کو اس لحاظ سے اور بھی مانا جا سکتا ہے کہ انجیل مقدس میں اور تفسیروں میں کسی جگہ برف کا ذکر نہیں ہے۔ کیونکہ یسوع مسیح دوسرے ملک کے رہنے والے تھے...اب جیسے ہی مناجات کی کتاب ختم ہو گی ہم تم انجیل مقدس پڑھنی شروع کر دیں گے۔''

وہ پھر خاموش ہو جاتے اور ایسا لگتا اونگھ گئے ہیں۔ جب ان کی ذہن میں کوئی بات جم جاتی تو وہ کھڑکی سے باہر غور سے دیکھنے لگتے، آنکھیں سکیڑ لیتے اور ان کے خط و حال میں بڑا تیکھا پن پیدا ہو جاتا۔

''کہئے نا'' میں دھیمے سے اصرار کرتا۔

''اچھا ہوں۔ تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ فرانسیسی ہے نا؟ ہاں تو فرانسیسی بے چارے بھی آخر انسان ہی ہیں، ہم گنہگاروں سے کوئی بدتر تو ہیں نہیں۔ بے چارے ''مادام، مادام'' کہتے ہوئے میری ماں کے پیچھے گھوما کرتے۔ ''مادام'' کے معنی ہیں ''میری خاتون'' اور وہ جو ''میری خاتون'' تھیں۔ تو وہ اتنی بڑی ڈھائی من کی آٹے کی بوری پیٹھ پر اٹھا لیتیں اس طرح جیسے وہ چھٹانک بھر کیہو۔ وہ بیل کی طرح تگڑی تھیں۔ میں بیس برس کا ہو گیا تھا لیکن میرے بال پکڑ کر مجھ کو پٹخنیاں دینا تو ان کے لئے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اور اس وقت میں ایسا گھسا پٹا بھی نہ تھا۔

''وہ جو ماتحت افسر تھا نا میرون، اس کو گھوڑوں سے بہت محبت تھی۔ وہ اصطبل اصطبل پھرا کرتا اور اشارے کرتا کہ مجھے گھوڑے کو صاف کرنے دو۔ پہلے پہل تو لوگ ذرا ڈرے کہ دشمن ٹھہرا کہیں گھوڑوں کا کچھ بگاڑ نہ دے۔ لیکن پھر کسان اسے خود بلاتے ''اے ادھر اے میرون!'' اور وہ ہنستا اور بیل کی طرح سر جھکا کے جھٹکتا اور دوڑتا چلا آتا۔ اس کے بال چقندر کی طرح لال تھے، بڑی سی ناک، موٹے موٹے

ہونٹ۔ وہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنا جوب جانتا تھا اور گھوڑوں کی طرح طرح کی بیماریوں کے علاج بھی اس کو خوب آتے تھے۔ بعد میں بیژنی میں گھوڑوں کی دیکھ بھال پر نوکر ہو گیا تھا۔ وہیں اس کا دماغ خراب ہو گیا اور پھر آگ بجھانے والوں نے اس کو مارتے مارتے مار ڈالا۔ اور وہ جو افسر تھا تو جب بہار کا موسم آیا تو اس پر ڈوبنے کی اور بجھنے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ گھلنے لگا اور جب سینٹ نکولائی کا دن آیا تو بڑی خاموشی کے ساتھ اس دنیا سے اٹھ گیا۔ حمام کی کھڑکی کی پاس بیٹھا کسی خیال میں کھویا ہوا تھا اور بس اسی طرح کھڑکی پر سر رکھے رکھے مر گیا۔ مجھے اس کی موت پر رنج ہوا تھا یہاں تک کہ میں نے دو چار آنسو بھی بہا ڈالے تھے۔ بڑی اچھی طبیعت کا آدمی تھا وہ۔ میرا کان پکڑتا اور اپنی زبان میں نہ جانے کیا پھس سے میرے کان میں کہتا۔ اس کے الفاظ میری سمجھ میں تو نہیں آتے تھے لیکن مجھے اچھے لگتے تھے۔ اس دنیا میں انسانیت اور نیکی کون سے بازار میں بکتی ہے بھلا؟ ایک دفعہ اس نے مجھے اپنی زبان سکھانی شروع کی تھی لیکن میری ماں نے منع کر دیا بلکہ وہ مجھے پادری صاحب کے پاس لے گئیں اور انہوں نے مجھے پٹوایا بھی اور اس افسر کی شکایت بھی پولیس سے کر دی۔ لوگ اس زمانے میں بڑے سخت ہوا کرتے تھے بھیا۔ جو کچھ ہم نے بھگتا وہ تم کیا بھگتو گے۔ تمہارا بھگتان تو دوسرے بھگت چکے ہیں! اب مجھے ہی دیکھو۔ اف، میں نے کیا کیا بھگتا...''

رات کا اندھیرا بڑھتا جاتا۔ میرے نانا ابا بھی جیسے رات کے ساتھ ساتھ پھیلتے جاتے اور ان کی آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح چمکتیں۔ وہ آہستہ آہستہ، احتیاط کے ساتھ، بدبدا کے اپنی داستان کہتے جاتے۔ لیکن جب وہ اپنے متعلق بات کرتے تو جوش سے بھر جاتے اور خوب اتراتے۔ جب وہ اپنے بارے میں بات کرتے تو مجھے اچھا نہ لگتا۔ مجھے ان کے بار بار کی نصیحت بری لگتی:

''یاد رکھنا اسے! اسے بھولنا مت!''

انہوں نے مجھے ایسی بہت سی باتیں بتائی تھیں جو میں بھول ہی جاتا تو اچھا ہوتا۔ ان باتوں کے متعلق نانا ابا نے مجھے یاد رکھنے کی نصیحت نہیں کی تھی، لیکن وہ باتیں پھانس کی طرح میرے دماغ میں چبھی رہیں۔ میں نے تو دیکھ ہی لیا تھا کہ سوالات کرنے سے وہ چڑتے تھے، اس لئے میں جان بوجھ کر سوال کیا کرتا:

''کون لوگ بہتر ہوتے ہیں۔ روسی یا فرانسیسی؟''

''کون کہہ سکتا ہے؟ میں نے فرانسیسیوں کو ان کے دیس میں تو دیکھا نہیں۔'' پھر جھنجھلا کے کہتے ''ہاں، مگر اپنے بل میں تو چوہا بھی ٹھیک ہی طرح سے رہتا ہے۔''

''بعض ہوتے ہیں، بعض نہیں بھی ہوتے۔ جب تک یہ لوگ رعیت اور آسامی تک تھے تب تک ٹھیک تھے، جیسے مڑا ہوا لوھا ہوتا ہے نا۔ اب پاؤں کی زنجیریں تو ٹوٹ گئی ہیں لیکن کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ میاں لوگ جو ہیں وہ ہوتے تو ہیں بڑے سنگ دل مگر ان کو عقل کسان سے زیادہ ہوتی ہے۔ پتہ نہیں، ہر ایک کے بارے میں یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ہاں جب کوئی امیر آدمی شریف ہوتا ہے اور بعض حد سے زیادہ احمق بھی ہوتے ہیں، بورے کی طرح جو دل چاہے بھر دو۔ لیکن ہم لوگوں میں سے تو زیادہ تر کے بھیجے خالی ہوتے ہیں۔ پہلی نظر میں اوپر سے دیکھو تو انسان جیسے لگتے ہیں لیکن قریب جا کر دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ کیڑوں نے سارا گودا کھا لیا ہے۔ کچھ نہیں بچا۔ بس صرف خول ہے۔ ہم لوگوں کو اصل میں ذرا پڑھنے لکھنے کی ضرورت ہے جس سے ہماری عقل ذرا تیز ہو۔ لیکن بس یہی ہے کہ آخر عقل تیز ہو تو کس بل پر...''

''کیا روسی مضبوط ہوتے ہیں؟''

''ہاں۔ بعض ہوتے ہیں۔ لیکن صرف مضبوط سے کچھ نہیں ہوتا، اصل چیز سمجھ داری ہے۔ مضبوط ہونے کو تو گھوڑا بڑے سے بڑے پہلوان سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔''

''لیکن فرانسیسی ہم لوگوں سے لڑے کیوں؟''

''دیکھو بھئی۔ اب جنگ جو ہے تو وہ تو ہے زار کا معاملہ۔ ہم جیسے سیدھے سادے غریب انسانوں کو یہ سب سمجھنے کی کیا ضرورت ہے کہ کیوں!''

لیکن جب میں نے نانا ابا سے پوچھا کہ بونا پارٹ کون تھا اور انہوں نے مجھے جو جواب دیا کبھی نہیں بھولوں گا:

''وہ ایک بہادر آدمی تھا جو ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا تاکہ سب لوگ برابری کی زندگی بسر کریں۔ بس نہ حاکم ہوں، نہ افسر ہوں۔ سب ایسے ہی رہیں۔ برابر سے! سب کے نام الگ الگ ہوں مگر حقوق سب کے برابر ہوں۔ اور سب کا ایک ہی مذہب ہو۔ یہ البتہ ذرا بے وقوفی کی بات ہے۔ صرف کیڑے مکوڑے ایک سے برابر ہوتے ہیں۔ سامن مچھلی چھوٹی مچھلیوں کی دوست نہیں ہوتی اور شارک مچھلی کی چھوٹی ہیرنگ مچھلیوں سے کبھی نہیں بنتی۔ ویسے ہمارے اپنے بھی ایک سے ایک بونا پارٹ تھے۔

مثلاً استیپان رازین اور ایمیلیان پوگاچیوف۔لیکن ان لوگوں کے بارے میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا...''

کبھی کبھی وہ اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگتے جیسے انہوں نے پہلے کبھی مجھ کو دیکھا ہی نہ ہو۔ مجھے اس وقت بڑی کوفت ہوتی۔

لیکن وہ میرے والد کا ذکر یا میری ماں کا ذکر کبھی نہیں کرتے۔

کبھی کبھی نانی اماں بھی ان باتوں میں شامل ہو جاتیں۔خاموشی سے وہ ایک کونے میں بیٹھ جاتیں اور کچھ نہ بولتیں۔پھر یکا یک اپنی نرم محبت بھری آواز میں بول اٹھتیں:

''وروارا کے ابا، یاد ہے وہ زمانہ کتنا اچھا تھا جب ہم تم مل کر موروم گئے تھے؟ کنواری مریم کی زیارت کرنے اور دعا مانگنے۔کون سا سن تھا؟''

''ٹھیک سے تو یاد نہیں۔مگر جب ہیضہ پھیلا تھا اس سے کچھ پہلے ہی کی بات ہے۔اسی سال تو حکومت نے اولنچانوں کی تلاش میں جنگل چھان مارا تھا۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ کس قدر ان سے خوفزدہ تھے۔''

''ہوں۔''

میں نے فوراً سوال کر دیا کہ اولنچان لوگ کون تھے اور وہ جنگلوں میں کیوں چھپے تھے۔نانا ابا نے رک رک کر جواب دیا:

''اولنچان بس کسان تھے، آسامی تھے جو فیکٹریوں سے بھاگ نکلے تھے۔''

''تو وہ لوگ پکڑے کیسے گئے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کیسے؟ بس ایسے ہی جیسے لڑکے کھیلتے ہیں۔کچھ بھاگتے ہیں۔کچھ ان کو پکڑتے ہیں۔اور ایک مرتبہ جو پکڑا جاتا ہے پھر اس کو ''چاٹ'' ملتی ہے، چابکوں اور لاٹھیوں سے۔ناک پھٹ پھٹ جاتی تھی اور ان کے ماتھے پر داغ لگا دیا جاتا تھا جس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ سزا یافتہ ہیں۔''

''مگر کیوں؟''

''کون جانے۔یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔اور یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ غلطی پر کون تھا۔وہ جو بھاگتے تھے یا جو پکڑتے تھے۔''

نانی پھر بیچ میں بول پڑتیں ''یاد ہے وروارا کے ابا، وہ بڑی آگ جو لگی تھی اس کے بعد...''

''کون سی والی بڑی آگ؟'' نانا ابا نے ٹھیک ٹھیک معلوم کرنے کیلئے ذرا سختی سے پوچھا۔

اپنی یادوں میں کھوئے ہوئے وہ میرے وجود سے بے خبر ہو گئے۔ ان کی آواز آہستہ آہستہ آتی رہی اور کچھ ایسے ترنم کے ساتھ جس سے کبھی کبھی لگتا جیسے وہ کوئی گیت گا رہے ہوں۔ ایک درد بھرا گیت جس میں آگ لگنے کا اور بیماریوں کا، انسانوں کے زدوکوب کا، اتفاقی موت کا اور دھوکہ بازیوں کا، مذہبی جنون اور بدمزاج چڑچڑے امیروں کا ذکر تھا۔

''آہ، ہم نے کیا کچھ دیکھا! ہم پر کیا کچھ گذر گئی!'' نانا آہستہ آہستہ کہتے۔

''لیکن ایسی بری بھی نہیں گذری'' نانی اماں کہتیں۔ ''یاد کرو وہ موسم بہار کتنا اچھا تھا جس سال وروارا پیدا ہوئی!''

''سن 48 کا ذکر ہے۔ جس سال ہنگری پر حملہ ہوا تھا ہم نے وروارا کا بپتسمہ کیا تھا۔ اسی دن تو وہ اس کے دینی باپ تیخون کو پکڑ لے گئے تھے۔''

''اور پھر کبھی اسے واپس آنا نصیب نہ ہوا'' نانی اماں نے آہ بھر کے کہا۔

''وہ کیا واپس آتا! اور اسی دن سے خدا کی برکت ہمارے گھر سے اس طرح اڑ گئی جیسے چھلنی سے پانی گر جاتا ہے۔ آہ، وروارا...''

''بس کرو وروارا کے ابا۔''

''کیوں، بس کیوں کروں؟'' انہوں نے غصے میں بھر کے جواب دیا۔ ''اب تم کچھ ہی کہو مگر ہماری اولاد نالائق نکلی۔ ہم اور تم تو سمجھے تھے کہ ہم ایک مضبوط ٹوکرے میں سامان اکٹھا کر رہے ہیں لیکن خدا نے یہی مناسب سمجھا کہ ہمارے ہاتھ میں ایک چھلنی پکڑا دے...''

''وہ اس طرح چیخنے لگے جیسے ان کو کسی نے داغ دیا ہو اور اٹھ کر کمرے بھر میں دوڑتے ہوئے آہیں بھرنے اور اپنی اولاد کو کوسنے پیٹنے لگے۔ ساتھ ہی وہ نانی اماں کو مکے دکھاتے جاتے۔

''اور یہ سب تمہارے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ چڑیل! تم...تمہارے لاڈ پیار سے یہ سب برباد ہوئے۔''

اور پھر ان کی تلخی یہاں تک بڑی کہ وہ مقدس شبیہوں والے کونے میں پہونچ گئے اور وہاں کھڑے ہو کر اپنے کھنگر سینے کو پیٹ پیٹ کر رونے لگے:

''آہ خدا، اے خدا! آخر میں نے کسی سے کیا زیادہ گناہ کیا ہے؟''

ان کی نمناک آنکھیں غم و غصے سے چمک رہی تھیں۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔

نانی اماں اندھیرے میں خاموش بیٹھی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتی رہیں۔ آخر کار اٹھ کر نانا ابا کے نزدیک گئیں۔

''کیوں اپنی جان دئے رہے ہو آخر'' انہوں نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ ''خدا اپنی مصلحت خوب جانتا ہے۔ اوروں کی اولادیں بھی ہماری اولاد سے کچھ بہتر نہیں ہیں۔ ہر جگہ یہی حال ہے۔ لڑائی، جھگڑا ٹنٹا، فساد، ماں باپ کو اپنے گناہ اپنے ہی آنسوؤں سے دھونے پڑتے ہیں۔ تم ہی ایک اکیلے نہیں ہو۔''

کبھی کبھی تو نانا کو ان کی باتوں سے تسلی ہو جاتی۔ تھکے ہمارے وہ بستر میں سڑک جاتے اور میں اور نانی اماں اپنی دوچھتی میں پناہ لیتے۔

لیکن ایک بار وہ نانا ابا کو سلجھانے چلیں تو زن سے گھوم کر ایک زور کا مکا انہوں نے نانی اماں کے منہ پر دھر دیا۔ نانی اماں لڑکھڑائیں اور اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ جب ذرا ہوش و حواس ٹھیک ہوئے وہ نہایت مطمئن اور جمی جمائی آواز میں بولیں:

''بے وقوف...''

اور یہ کہہ کر نانا کے قدموں کے پاس خون تھوک دیا۔ نانا نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے بھی اوپر اٹھا لئے اور دو مرتبہ زور زور سے چیخے:

''نکل جا ورنہ میں تیری جان لے لوں گا!''

نانی اماں دروازے کی طرف جاتے ہوئے پھر بولیں ''بے وقوف''۔ نانا ابا ان پر ٹوٹے لیکن وہ آہستہ سے چوکھٹ پار کر گئیں اور دروازہ دھڑام سے نانا ابا کے منہ پر لگا۔

''کھوسٹ بڑھیا'' نانا ابا پھنکارے۔ ان کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ تھا۔ دروازے کے پاکھے کو پکڑے ہوئے وہ اسے ناخنوں سے کھرچ رہے تھے۔

میں تندور پر بیٹھا تھا، مردے سے بدتر، اور مجھے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ نانا ابا نے نانی کو میری موجودگی میں مارا تھا اور مجھے اس بات سے اس قدر نفرت پیدا ہو رہی تھی کہ اس نفرت

کے بوجھ سے میرا وجود کچلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کی اس حرکت سے ان کے کردار کا ایک ایسا رخ اجاگر ہوا جس کے لئے کوئی سبب یا علت پیش نہیں کی جا سکتی اور جس سے میرا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ اب تک وہ وہیں کھڑے تھے دروازے کے پاکھے کو پکڑے لٹکے ہوئے۔ ان کا وجود سکڑ سا گیا تھا اور اس پر ایسی سفید چھائی جا رہی تھی جیسے راکھ یا بھبھوت مل دیا گیا ہو۔ یکا یک وہ بیچوں بیچ کمرے میں پہونچے، گھٹنوں کے بل گر پڑے اور رینگتے ہوئے آگے بڑھے اپنے ہاتھوں کا سہارا لئے۔ پھر سیدھے کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھوں سے ماتم کرنے لگے: ''اے خدا۔ اے خدا۔''

میں جلدی سے تندور سے پھسلا اور باہر بھاگا۔ اوپر میری نانی ادھر ادھر ٹہلتی ہوئی کلیاں کرتی جا رہی تھیں۔

''درد ہو رہا ہے؟''

وہ کونے میں گئیں اور بالٹی میں کلی کرتے ہوئے سکون کے ساتھ بولیں:

''سب ٹھیک ہے۔ دانت میرے سب سلامت ہیں۔ بس ہونٹ ذرا سا کٹ گیا ہے۔''

''نانا ابا نے ایسا کیوں کیا؟''

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولیں:

''بس غصہ آ گیا۔ اور کیا؟ کیا کریں وہ بھی۔ بوڑھے آدمی ہیں اور پھر اتنی مصیبتیں... تم چھوڑو یہ سب۔ جاؤ سوؤ۔''

میں نے ان سے کچھ اور پوچھا لیکن وہ غیر متوقع سختی سے بولیں:

''سنا نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں؟ جاؤ بستر پر۔ عجب بے کہا لڑکا ہے۔''

وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئیں اور اپنا ہونٹ چوس چوس کے بار بار رومال سے پونچھتی رہیں۔ میں کپڑے بدلتا جاتا تھا۔ اور کنکھیوں سے ان کو دیکھتا جاتا تھا۔ ان کے سر کے بالکل اوپر رات کے تاریک آسمان کے ایک چوکھونٹے ٹکڑے میں ستارے چھٹکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ باہر بھی تمام سناٹا تھا۔ اندر بھی تمام تاریکی تھی۔

جب میں بستر پر لیٹ گیا تو وہ میرے پاس آئیں اور آہستہ آہستہ میری پیشانی سہلانے لگیں۔

''سو بیٹا۔ تجھے چین کی نیند آئے۔ تو میرے لئے کیوں دکھی ہو میرا کبوتر و بوتر۔ اس میں بہت کچھ

میری ہی غلطی ہے۔سورہ!''

انہوں نے مجھے بوسہ دیا اور باہر چلی گئیں۔مجھ پر ایک ایسی اداسی چھا گئی کہ دم گھٹنے لگا۔میں اپنے چوڑے، نرم اور گرم گرم بستر سے اٹھ بیٹھا اور کھڑکی سے نیچے جھانک کر سونی گلی کو بڑی دیر تک تکتا رہا۔ ناقابل برداشت درد سے میرا دل جیسے سن ہو گیا تھا۔

زندگی پھر ایک خواب پریشان بن گئی۔

ایک روز شام کو چائے کے بعد اور نانا ابا مناجات پڑھ رہے تھے اور نانی اماں برتن دھو رہی تھیں۔ یاکوف ماموں دندناتے بھاگتے کمرے میں گھس آئے۔ان کی حالت بگڑی ہوئی تھی اور ایسا ہانپ رہے تھے جیسے گھوڑوں کے ساتھ دوڑنے والے سائیس۔انہوں نے اپنی ٹوپی زور سے کونے میں پھینکی اور بغیر سلام دعا کے عجب وحشیانہ طریقے سے اشارے کر کر کے کہنے لگے:

''ابا، میخائل بپھر پڑا ہے۔اس نے میرے یہاں کھانا کھایا اور پھر خوب خوب پی۔یہاں تک کہ اس کا دماغ چل گیا۔برتن توڑ ڈالے اور ایک گاہک کا ایک اونی لباس پھاڑ ڈالا۔مجھ کو اور مستری جی کو گالیاں دیں، وہ یہاں بھی آ رہا ہے۔قسم کھا رہا تھا کہ آپ کو پکڑے گا۔کہتا تھا''ابا کی داڑھی کا ایک ایک بال اکھاڑ لوں گا''اور چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا''میں اسے جان سے مار ڈالوں گا''۔ذرا ہشیار رہے گا۔''

نانا ابا میز پر جھکے، پھر آہستہ آہستہ اٹھ کھڑے ہوئے، سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ ناک سے مل گیا تھا اور ان کا پورا چہرہ خم کھائی کلہاڑی کی طرح لگتا تھا۔

''سنتی ہو وروارا کی ماں؟''انہوں نے اپنی چین چین کرتی ہوئی آواز میں کہا۔''اب کیا کہتی ہو؟ کیوں؟ اپنے باپ کو جان سے مار ڈالنے کے لئے آ رہا ہے! یہ ہے تمہارا بیٹا۔اچھا بھائی! ابا وقت آ گیا، وقت آ گیا لوگو۔''

انہوں نے اپنے کندھے سیدھے کر لئے اور کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔پھر دروازے کے نزدیک گئے اور اس کی بھاری کنڈی چڑھا دی۔یاکوف ماموں کی طرف مڑتے ہوئے وہ بولے:

''تو تم دونوں اب تک وروارا کے جہیز پر قبضہ کرنے کا ارادہ کئے ہوئے ہو۔لیکن تمہیں یہ ملے گا۔ یہ!''اور انہوں نے یاکوف ماموں کی ناک کے نیچے ہاتھ لے جا کر ٹھینگا دکھایا۔

یاکوف ماموں پیچھے کو اچھلے اور خفگی کے لہجے میں بولے:

''تو آپ مجھ پر کیوں ٹوٹے پڑتے ہیں ابا؟''

''تم؟ ارے میں تمہیں بھی خوب جانتا ہوں!''

نانی اماں جلدی جلدی پرچ پیالیاں الماری میں بند کرنی شروع کیں مگر بولیں کچھ نہیں۔

''میں تو آپ کو بچانے آیا۔''

نانا طنز سے ہنسے:

''اچھا اگر آپ میری بات کا یقین نہیں کرتے تو...''

''یقین؟ تمہارا؟'' نانا ابا چیخے۔ اور زور سے زمین پر پاؤں پٹخا۔ ''مجھے ایک بلی کا یقین آ سکتا ہے، چوہے کا یقین آ سکتا ہے، کنگارو کا یقین آ سکتا ہے۔ لیکن تمہارا نہیں! تم ہی نے اس کو شراب پلائی ہوگی، تم ہی نے اس کو بھڑکایا ہوگا! میں خوب جانتا ہوں۔ چلو اب اس کو پیٹو! کرلو فیصلہ۔ وہ زندہ رہے کہ میں...''

نانی اماں مجھ سے دھیرے سے بولیں:

''اوپر دوڑ جا اور کھڑکی سے دیکھتے رہ۔ جیسے ہی میخائل نظر آئیں فوراً آ کے بتانا! جلدی جا، جلدی۔''

میں اوپر چڑھا اور کھڑکی پر جم کے بیٹھ گیا۔ دل میں تھوڑا سا تو خوف محسوس ہو رہا تھا کہ اب دیکھو ماموں غصے میں بھرے ہوئے آتے ہیں تو کرتے ہیں اور تھوڑا سا فخر کہ ان پر نگاہ رکھنے کی اہم ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے۔ چوڑی گلی مٹی سے بھری ہوئی تھی اور کہیں کہیں سے گرد غبار سے پتھروں کے گول سرے نکلے ہوئے تھے۔ بائیں طرف کو گلی دور تک بڑھتی چلی گئی تھی اور نالے سے گذرتی ہوئی استروژنیا چوک تک پہونچتی تھی۔ اس چوک کی نرم چکنی مٹی میں پرانے جیل خانے کی بھوری عمارت کھڑی تھی جس کے چار اونچے اونچے برج تھے۔ اس بھاری بھرکم عمارت سے ایک عجیب قسم کی اداس خوبصورتی پھوٹتی تھی۔ داہنی طرف کو ہمارے مکان سے تین مکان چھوڑ کر یہ گلی سیدھا چوک میں نکلتی تھی اور اس کے کنارے کنارے قیدیوں کی زرد زرد بارکیں تھیں اور وہ برج دیدے پھاڑے رہتا۔ اس مینار پر ایک چوکیدار اس طرح گول گول گھوما کرتا تھا جیسے زنجیر میں بندھا ہوا کتا۔ بہت سے جوہڑ بھی تھے جن میں سے ایک میں سبز کائی پڑی ہوئی تھی اور اسی کے داہنی طرف دیوکوف تالاب تھا۔ اور یہی وہ جگہ تھی جہاں میری نانی اماں کہتی تھیں کہ میرے ماموں میرے باپ کو جاڑے میں ڈبو کر مارنا چاہتے تھے۔ ہماری کھڑکی کے بالکل

سامنے ایک پتلی سی گلی کٹتی تھی جس میں پچرنگے گھروں کی قطاریں تھیں۔ یہ گلی ایک گرجے پر ختم ہوتی تھی جو ''تین ولیوں کا گرجا'' کہلاتا تھا، بھاری سی، بھدی سی عمارت جو زمین پر دبکی ہوئی سی لگتی تھی۔ اگر کھڑکی سے سیدھی نظر دوڑاؤ تو سبز باغوں کے بیچ میں یہ سرخ سرخ چھتیں الٹی ہوئی کشتیوں کی طرح تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ہماری گلی کے مکانات طویل جاڑوں کی ہواؤں کے مارے ہوئے، خزاں کی بے شمار برساتیں کاٹے گرد آلود ایک دوسرے سے سٹے ہوئے اس طرح کھڑے تھے جیسے کسی گرجے کے برآمدے میں فقیروں اور بھیک منگوں کی بھیڑ۔ ان کی کھڑکیاں باہر کو نکلتی ہوئی پھٹے دیدوں کی طرح جھانکتی معلوم ہوتیں جیسے ان کو بھی میری طرح کسی کا یوں ہی انتظار تھا۔ جو لوگ نظر آتے وہ اتنا آہستہ آہستہ سوچتے ہوئے چلتے جیسے تندور پر رینگتے ہوئے تل چٹے۔ کھڑکی کی نزدیک ایک گرم بھپکا سا اٹھنے لگا جس سے دم گھٹنے لگا۔ بھپکے کے ساتھ ساتھ سموسوں کی بو تھی جن سے گاجر اور بہار والی پیاز بھری جاتی ہے۔ آج تک مجھ سے یہ بو برداشت نہیں ہوتی۔

سامنے جو منظر تھا وہ اور بھی دم نکالے دیتا تھا۔ ایک عجیب طرح کا ناقابل برداشت بوجھ دل پر بڑھتا جاتا تھا جیسے سینے میں پگھلا ہوا سیسہ بھر گیا ہو جو اس طرح میری پسلیوں اور سینے سے ٹکرا رہا ہے کہ میں بلبلے کی طرح ادھر ادھر تیر رہا ہوں اور اس چھوٹے سے کمرے میں میرا وجود سما نہیں رہا ہو، اس چھوٹے کمرے میں جس کی چھت تابوت کی طرح چھاتی پر رکھی ہو۔

یکا یک مجھے دکھائی دیا کہ پتلی گلی میں جو میٹالے رنگ کا مکان اس کی آڑ سے میخائل ماموں کھڑے جھانک رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا ٹوپا آنکھوں پر جھکا لیا تھا جس سے ان کے دونوں کان دونوں طرف نکل آئے تھے۔ ایک اٹنگا سا کتھئی کوٹ پہنے تھے اور گھٹنوں تک کے جوتے جو دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ اپنی چار خانہ دار پتلون میں ڈالے ہوئے تھے اور دوسرے سے وہ اپنی داڑھی پکڑے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی صورت تو نہیں دکھائی دے رہی تھی مگر وہ اس طرح کھڑے تھے جیسے ابھی جست بھر کر اچھلینگے اور سیاہ بالوں سے بھرے ہوئے چنگل نانا ابا کے مکان کے کلیجے میں گڑو دیں گے۔ مجھے چاہئے تھا فوراً نیچے بھاگتا اور سب کو خبر کر دیتا کہ میخائل ماموں آ گئے ہیں لیکن میں کھڑکی سے الگ ہی نہ ہو سکا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے اس طرح دبے پاؤں گلی پار کی جیسے انہیں خطرہ ہو کہ کہیں ان کے جوتوں

میں مٹی نہ لگ جائے۔ اور پھر نیچے شراب خانے سے میں نے دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ اور گلاسوں کی جھنکار سنی۔ میں ایک دم نیچے بھاگا اور اپنے نانا ابا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟'' انہوں نے غرائی ہوئی آواز میں بغیر دروازہ کھولے ہوئے پوچھا۔ ''تم؟ اچھا! کیا کہتے ہو؟ شراب خانے میں گیا ہے؟ اچھی بات ہے۔ تم جہاں سے آئے ہو وہاں جاؤ واپس!''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''کیا کیا جائے! کوئی چارہ نہیں۔''

میں واپس ہوا۔ رات کا اندھیرا بڑھیا جا رہا تھا۔ گلی میں گرد غبار اور زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کھڑکیوں پر چکنی چکنی زرد زرد روشنیاں نمودار ہوگئی تھیں، گلی کے سامنے والے مکان سے تاروں والے کسی باجے کے بجنے کی دردناک دلربا آواز آ رہی تھی۔ شراب خانے میں کوئی گا رہا تھا۔ جب بھی دروازہ کھلتا تو مجھے ایک تھکی ہوئی شکستہ آواز سنائی دیتی جو مجھے معلوم تھا کہ نکی توشکا کی ہے۔ ایک بوڑھا ڈھیل فقیر جس کی بائیں آنکھ بالکل مچی ہوئی تھی اور داہنی آنکھ جلتے ہوئے انگارے کی طرح سرخ تھی۔ دروازہ پھٹ سے بند ہو جاتا اور اس کی گاتی ہوئی صدا اس طرح کٹ جاتی جیسے کسی نے کلہاڑی ماردی ہو۔

میری نانی اماں کو اس فقیر پر بڑا رشک آیا کرتا تھا جب بھی وہ اس کی آواز سنتیں۔

''ہائے یہ کتنا خوش نصیب ہے کہ اس کو اتنے بہت سے اچھے اچھے گانے یاد ہیں'' وہ کہتیں۔

کبھی کبھی وہ اس کو اپنے احاطے میں بلا لیتیں، وہ اپنی چھڑی پر جھک کر برآمدے میں بیٹھ جاتا، گانے لگتا، شعر پڑھنے لگتا۔ میری نانی اماں اس کے قریب ہی بیٹھ جاتیں اور کبھی کبھی بیچ میں سوال پوچھ کر اس کو ٹوکتیں:

''کیا تمہارا مطلب ہے کہ پاک اور مقدس کنواری بی بی ریازان میں بھی آتی تھیں؟''

''ہاں ہاں، وہ تو تمام جگہوں پر آتی تھیں، تمام علاقوں میں'' وہ بڑے یقین اور اعتماد سے جواب دیتا۔

پھر ایسا لگنے لگا جیسے گلی رفتہ رفتہ تھکتی جا رہی ہے۔ ایک ان دیکھی تھکن اس پر چھاتی جا رہی ہے اور یہ تھکن مجھ پر بھی طاری ہونے لگی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کاش نانی اماں آ جائیں! نانا ابا ہی آ جائیں۔ میرے والد آخر کسی قسم کے آدمی تھے کہ میرے ماموؤں اور نانا کو ان سے اتنی نفرت تھی اور

گریگوری اور نانی اماں اور ایوگینیا بوا ان کی اتنی تعریفیں کرتیں تھیں؟ اور میری اماں کہاں ہیں، کہاں ہیں؟

ادھر مجھے اپنی ماں کی بہت زیادہ یاد آنے لگی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ نانی اماں کے تمام قصوں اور وارداتوں کی ہیروئن ہوں۔ اور اس واقعہ نے کہ وہ اس خاندان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھیں ان کو میری نظروں میں اور بھی بلند کر دیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا کہ وہ کسی سرائے وغیرہ میں ڈاکوؤں کے کسی گروہ کے ساتھ رہتی ہونگی اور وہ لوگ امیروں کو لوٹتے ہوں گے اور مال غنیمت غریبوں میں تقسیم کرتے ہوں گے۔ یا شاید جنگل میں کسی کھوہ میں رہتی ہوں، نیک دل ڈاکوؤں کے کسی گروہ کے ساتھ، جن کے لئے وہ کھانا پکاتی ہوں گی اور روپیوں کی حفاظت کرتی ہوں گی۔ یہ بھی خیال آتا تھا کہ وہ دنیا میں ماری ماری پھر کے ''ڈاکو شہزادی'' اینگا لیچیوا کی طرح ساری دنیا کی دولت تلاش کرتی پھرتی ہوں گی۔ ان کے ساتھ کنواری مریم ہوں گی اور ان سے کہتی رہتی ہوں گی:

زمین کا سونا چاندی لوٹنا
اے لالچی تجھے زیب لوٹنا
اے ہوس کی پتلی تیرے لئے یہ کب مناسب ہے

کہ زمین کے خزانوں کے نیچے تو اپنی بیحیائی کو چھپائے اور میری ماں ''ڈاکو شہزادی'' کے لفظوں میں جواب دیتیں:

اے پاکباز کنواری مجھے بخش دے
اور میری گنہ گار روح پر رحم کر
کہ میں یہ لوٹ کھسوٹ اپنے لئے نہیں کرتی

بلکہ اپنے دل کے ٹکڑے اپنے بیٹے کی خاطر! اور کنواری مریم جو میری نانی اماں کی طرح نیک دل ہوں گی ان کو معاف کر دیتی ہوں گی اور کہتی ہوں گی کہ:

اے بدبخت عورت اے وریوشکا
اے ناقابل اصلاح تاتاری
اگر مجبوری ہے تو جا اپنے راستے پر
اپنا راستہ طے کر اور اپنے دن سیاہ کر

لیکن اس روسی سرزمین کے لوگوں کے ہاتھ نہ لگا
کسی جنگلی راستے پر کسی موردوین کو کوڑے لگا
یا میدانوں کی تاریکیوں میں کسی کالمک کو قتل کر دے!

میں ان داستانوں کی یاد میں اتنا کھو گیا تھا کہ جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں خواب سے یکا یک جھنجھوڑ کر اٹھا دیا گیا کیونکہ نیچے کمرے سے اور احاطے سے دھڑا دھڑ کی اور چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نیچے جو جھانکا تو دیکھا کہ نانا ابا اور یاکوف ماموں اور عجوبہ سا آدمی میلیان جو شراب خانے کا ملازم تھا، میخائل ماموں کو باہر گلی میں دھکیل رہے ہیں۔ وہ لڑتے ہوئے بار بار اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ لوگ ان کو لاتیں مار رہے تھے اور ان کے بازوؤں، پیٹھ اور کندھوں پر خوب پٹائی ہو رہی تھی۔ آخر وہ بھاگے اور گرد کے بادل میں کہیں غائب ہو گئے۔ پھاٹک زور سے بند کر دیا گیا اور اس میں کنڈی چڑھا کر تالا ڈال دیا گیا۔ ان کی چیتھڑے چیتھڑے ٹوپی احاطے کے جنگلے پر سے باہر پھینک دی گئی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔

ذرا دیر تو میخائل ماموں اسی طرح پٹے کٹے پڑے رہے، پھر انہوں نے رستے پر سے ایک روڑا اٹھایا اور زور سے پھاٹک کی طرف پھینکا۔ بھد کی آواز آئی جیسے کسی نے بڑے کنڈال پر پتھر کھینچ مارا ہو۔ شراب کی دوکان کے اندر سے کالی کالی صورتیں رینگتی ہوئی نکل آئیں اور اپنے بازو گھما گھما کر چیخنے لگیں۔ گھروں کی کھڑکیاں کھل گئیں اور ان میں سے سر جھانکتے دکھائی دینے لگے۔ گلی میں پھر چیخوں اور قہقہوں سے جان پڑ گئی۔ سارا سماں پریوں کی ایک داستان سا معلوم ہوتا تھا۔ بے حد دلچسپ لیکن ناخوشگوار اور خوفناک۔

یکا یک سب قصہ ختم ہو گیا۔ ہر شخص چلا گیا اور تمام سناٹا چھا گیا۔

پھر نانی اماں دروازے کے پاس بکس پر بیٹھی تھیں، دوہری، بے حس و حرکت جیسے سانس تک نہ آتی جاتی ہو۔ میں ان کے سامنے کھڑا، ان کے نرم گرم اور بھیگے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ لیکن وہ جیسے اس بات سے بالکل بے خبر بیٹھی تھیں اور بیٹھی تھیں اور بیٹھی بیٹھی صرف بڑبڑائے جا رہی تھیں:

''آہ، اے رحیم و کریم خدا! جب عقل بٹ رہی تھی تو کیا اتنی کافی نہ تھی کہ مجھ کو اور میرے بچوں کو نہیں دی تو نے... ارے پروردگار مدد کر...''

جہاں تک مجھے خیال ہے نانا ابا اس مکان میں جو پولیوایا گلی میں تھا ایک سال سے زیادہ نہیں

ٹھہرے۔ایک موسم بہار سے دوسرے موسم بہار تک۔لیکن اتنے ہی کم عرصے میں ہمارا گھر بدنام ہو گیا۔ تقریباً ہر اتوار کو لونڈے ادھر ادھر سے اکٹھے ہو جاتے اور ہمارے دروازے پر یلغار کرتے ہوئے چیخ چیخ کر اعلان کرتے جاتے:

''کاشیرینوں کے یہاں پھر لڑائی ہو رہی ہے!''

میخائل ماموں عام طور پر اتوار کی شام کو آتے اور ساری رات رہتے جیسے کوئی محاصرہ کئے ہو اور مکان والے سب ہوشیار اور چوکنا رہیں۔کبھی کبھی وہ اپنے ساتھ دو تین مددگار بھی لاتے، بانکے اور بگڑے دل لوگ جو کونا وینو کی دوکان میں کام کرتے تھے۔نالے سے ہو کر وہ لوگ باغ پر چڑھ آتے اور وہاں ان کا شراب کے نشے میں بدمست دماغ خوب خوب چالیں نکالتا، رس بھری کی جھاڑیاں نوچ ڈالتے۔ایک دن حمام میں گھس پڑے اور جو جو چیز بھی توڑی جا سکتی تھی توڑ دی۔تندور کی اینٹ سے اینٹ بجادی، فرش کے پتھر اکھاڑ پھینکے، دروازہ کے پٹ اور چوکھٹ اکھیڑ دی۔

نانا ابا کھڑکی میں سر جھکائے خاموش کھڑے ان لوگوں کے توڑ پھوڑ کی آوازیں سنتے رہے۔نانی اماں دوڑ کر احاطے میں گئیں جہاں وہ اندھیرے میں گم ہو گیں۔ان کی منت کرنے کی آوازیں آتی رہیں:

''میخائل، سوچو تو ذرا کیا کر رہے ہو، میخائل!''

جواب میں گندی اور بیہودہ روسی گالیوں کی ایک لہر سنائی دی غالباً جن کے معنی پر ان جانوروں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔

ایسے موقع پر نانی اماں کے پیچھے پیچھے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔لیکن ان کے بغیر ڈر بھی بے حد لگتا تھا۔میں نانا ابا کے کمرے میں داخل ہوا۔

''دور ہو یہاں سے، بدبخت!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں مجھ پر کڑکے۔

میں چھپر پر بھاگا اور باغ کے اندھیرے میں جھانک کے اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ نانی اماں کہیں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں اور ان کو پکارتا ہوا زور زور سے رونے لگا۔مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ نانی اماں کو مار نہ ڈالیں۔وہ تو نہیں آئیں لیکن میری آواز سن کر میرے ماموں نے نشہ کے عالم میں میری ماں کو چند گندی گندی گالیاں دے ڈالیں۔

ایسی ہی ایک شام تھی۔نانا ابا بیمار تھے۔وہ بستر پر لیٹے لیٹے سر کو تکیہ پر ادھر ادھر جھٹکتے ہوئے بڑے

دردناک انداز میں روتے جا رہے تھے:

''کیا میں اسی دن کے لئے زندہ رہا تھا، میں نے گناہ کئے تھے، روپیہ جمع کیا تھا؟ ہائے اگر ڈوب مرنے کی بات نہ ہوتی تو ابھی پولیس کو بلوا کر کوتوال کے سامنے بند ہوا دیتا۔ ہائے کیا بے عزتی ہے! یہ آج تک کبھی ہوا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو پولیس کے حوالہ کریں؟ اور ہم ہیں کہ یہاں مجبور پڑے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔ آہ، بڑھاپا۔''

یکا یک انہوں نے اپنی ٹانگیں پلنگ کی پٹی پر زور سے پھینکیں اور لڑکھڑاتے ہوئے کھڑکی کے پاس پہونچے۔

''بتی دو مجھے'' نانا ابا نے ہانپتے ہوئے حکم دیا۔ نانی اماں نے شمع روشن کر کے ان کے ہاتھ میں پکڑا دی اور وہ اسی طرح اسے لے کر چلے جیسے وہ بندوق ہو۔ کھڑکی سے وہ تمسخر آمیز آواز میں چلائے:

''تھو...و...و، میخائل، جیسے رات کا چور، جیسے خارش زدہ کتا!''

فوراً کھڑکی کا اوپری شیشہ ایک چھناکے کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ایک ڈھیلا نانی اماں کے پاس میز پر آ کر گرا۔

''بچا!'' میرے نانا زور سے چلائے اور پھر زوروں سے ہنسنے نہ ہوں یا رونے لگے۔

نانی اماں نے ان کو اس طرح گود میں بھر کر اٹھا لیا جیسے وہ نہ ہوں میں ہوں اور پلنگ پر لٹاتے ہوئے خوف زدہ آواز میں بولیں:

''ارے یسوع مسیح کا واسطہ! کیا غضب کرتے ہو۔ اگر کچھ ہو جائے تو اس کو سائبیریا بھیج دیا جائے گا۔ اب اس وقت تو وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے، وہ کیا سمجھ سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ کا ہی ہوگا!''

نانا نے پیر پٹخے اور خشک بھاری آواز میں کہا:

''قتل کرے تو کرنے دو...''

باہر سے ڈکرانے اور پاؤں پٹکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے میز پر پڑا ہوا ڈھیلا اٹھایا اور کھڑکی کی طرف لپکا۔ لیکن نانی اماں نے مجھے کھینچ لیا اور کونے میں دھکیلتے ہوئے پھن پھنائیں:

''پاگل لونڈا...''

ایک اور موقع پر میخائل ماموں پیچھے برآمدے پر سے ہو کر چڑھ آئے اور اندرونی دروازے پر زور

زور سے لاٹھی مارنے لگے۔ نانا ابا گلیارے میں تیار کھڑے تھے۔ ان کی مدد کے لئے دو کرایہ دار ہاتھوں میں لاٹھیاں سنبھال کھڑے تھے اور شراب خانے کے مالک کی چوڑی چکلی بیوی بیلن لئے تیار کھڑی تھی۔ نانا ابا کے پیچھے نانی اماں گھس رہی تھیں۔

''مجھے جانے دو۔ مجھے اس کے پاس پہونچنے دو! میں اس سے ایک بات کولوں۔''

نانا ابا کندھے پر سے لٹھ تانے ایک پاؤں اس طرح آگے کو بڑھائے کھڑے تھے جیسے اس تصویر ''ریچھ کا شکار'' میں کسان کھڑا تھا۔ جب نانی اماں ان کے پاس پہونچ کر آگے بڑھنے لگیں تو انہوں نے خاموشی کے ساتھ اپنی کہنی اور پاؤں اڑا کے ان کو روک دیا۔ اب چاروں کے چاروں انتظار میں کھڑے تھے دیوار گیری میں لگے ہوئے چراغ کی ہلتی ہوئی لو کی روشنی باری باری سے ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دوچھتی کے زینے سے یہ سارا تماشا دیکھا اور نہ جانے کیوں جی چاہا کہ جا کر نانی اماں کو یہاں لے آؤں۔

باہر سے میخائل ماموں زور زور سے دروازہ پیٹ رہے تھے۔ نیچے کا قبضہ ٹوٹ ہی چکا تھا اور جھنجھنا رہا تھا۔ اب دروازہ صرف اوپر والے قبضے سے لٹک رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ بس اب گیا، اب گیا، نانا ابا جھنجھناتی ہوئی آواز میں اپنے ساتھیوں سے بولے:

''دیکھو، ہاتھ اور پاؤں میں مارنا۔ سر پر نہ لگنے پائے! خیال رکھنا۔''

دروازے سے بالکل ملی ہوئی ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ بس اتنی بڑی کہ اس میں کا شیشہ میخائل ماموں توڑ ہی چکے تھے اور اب ٹوٹے ہوئے شیشے کی جھالر سے گھری ہوئی وہ اس طرح جھانکتی ہوئی لگتی تھی جیسے بغیر ڈھیلے کی آنکھ۔

نانی اماں کھڑکی کی طرف دوڑیں اور اس میں سے ہاتھ نکال کر اور ہلا ہلا کر میخائل ماموں کو اشارہ کر کے چیخنے لگیں:

''یشا! یسوع مسیح کے واسطے چلے جاؤ! نہیں تو یہ لوگ تمہیں زندگی بھر کے لئے لنجا کر دیں گے۔ چلے جاؤ، جاؤ، جاؤ!''

انہوں نے اپنی لاٹھی زور سے نانی اماں کے باہر نکلے ہوئے ہاتھ پر ماری۔ میں نے دیکھا کہ کوئی بھاری سی چیز بجلی کی طرح کھڑکی کی طرف آئی اور نانی اماں کے ہاتھ پر پڑی اور اس کے فوراً ہی بعد نانی

اماں فرش پر ڈھیر ہوگئیں۔ گرتے گرتے بھی خاموش ہونے سے پہلے انہوں نے زور سے ایک بار آواز دی:

''میشا، بھاگ جاؤ...''

''آہ امی!'' نانا ابا بڑی دردناک آواز میں زور سے رونے لگے۔

اتنے میں دروازہ جواب دے گیا اور تاریکی میں سے میخائل ماموں جست بھر کے اندر آ گئے۔ مگر پھر اس طرح باہر پھینک دئے گئے جیسے کوڑے کا ڈھیر ہوں۔

شراب خانے کے مالک کی بیوی نانی اماں کو اندر نانا کے کمرے میں لے گئی۔ نانا پیچھے پیچھے داخل ہوئے اور ان کے پاس جا کر غمگین آواز میں بولے:

''کیا ہڈی ٹوٹ گئی؟''

نانی اماں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا:

''ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے کہ ٹوٹ گئی۔ لیکن تم لوگوں نے اس کا کیا حشر کیا، اس کا؟''

نانا ابا غصے میں چیخ کر بولے:

''اپنے ہوش میں آ عورت! مجھے کیا سمجھی ہے؟ جانور؟ اس کو باندھ لیا گیا ہے۔ وہاں پڑا ہے سرائے میں۔ میں نے بس ایک بالٹی پانی بھر کے اس پر ڈالا۔ کیا بھوت سوار تھا اس پر۔ نہ جانے کمبخت کو کہاں سے مل جاتی ہے؟''

نانی اماں کراہنے لگیں۔

''میں نے ہڈی بٹھانے والی کو بلوایا ہے۔ ذرا اتنی دیر اور برداشت کرو'' نانا نے کہا اور ان کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئے۔ ''ارے یہ لوگ ہم دونوں کو مار ڈالیں گے۔ وقت سے پہلے قبر میں اتار دیں گے!''

''سب دے دوان کو۔''

''اور وارا کا کیا ہوگا؟''

بڑی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ نانی اماں غمناک، مدہم اور منت بھری آواز میں نانا ابا اونچی اور غصہ بھری آواز میں۔

پھر ایک کبڑی بڑھیا وارد ہوئی۔ اس کا دھانہ ایک کان سے دوسرے کان تک تھا، نیچے کا جبڑا کانپ

رہا تھا، مچھلی کی طرح اس کا منہ لٹکا ہوا تھا اور اوپر کے ہونٹ کو نوک دار ناک نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ آنکھیں دکھائی ہی نہیں دیتی تھیں۔ مشکل سے وہ اپنی ٹانگیں ہلا سکتی تھی فرش پر۔ بیساکھی کے سہارے اچک اچک کر چل رہی تھی اور جب چلتی تھی تو اس کی گٹھری جھنا جھن بجتی تھی۔

مجھے ایسا لگا کہ یہ موت ہے جو میری نانی اماں کو پکڑ کر لے جانے کے لئے آئی ہے۔ اور میں اس بڑھیا پر ٹوٹ پڑا۔

''نکل یہاں سے۔ دور ہو یہاں سے!'' میں نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلانا شروع کر دیا۔

میرے نانا نے مجھے دبوچ لیا اور بری طرح سے دوچھتی کی طرف لے گئے۔

بہت ہی جلد مجھ پر یہ حقیقت کھلنے لگی کہ میرے نانا ابا کا خدا اور ہے اور نانی اماں کا خدا اور۔

نانی اماں صبح کو اٹھ کر دیر تک پلنگ پر بیٹھی اپنے حیرت انگیز بالوں میں کنگھی کیا کرتیں۔ زور زور سے کنگھی کرنے سے سیاہ بالوں کی لٹوں کی لٹیں نچتی چلتی آتیں اور وہ سر گھما گھما کے، دانت پیس پیس کے منہ میں بالوں کو کوستی جاتیں کہ کہیں میری نیند نہ کھل جائے:

''تمہیں بلا لے جائے، تمہیں طاعون ہو اور آگ لگے تمہیں! پھٹکار ہو تم پر۔''

جب کسی نہ کسی طرح بال سلجھ جاتے تو چوٹی کرتیں اور جھنجھلا کے پانی پھینکتی ہوئی منہ ہاتھ دھوتیں۔ سو کے اٹھنے کے بعد نیند کی سلوٹیں ہنوز ان کے چہرے پر پڑی رہتیں اور پوری طرح جھنجھلاہٹ کے بل بھی ان کے چہرے سے دھلنے نہ پاتے کہ وہ کونے میں لگی ہوئی مقدس شبیہوں کے سامنے دوزانو جا بیٹھتیں، اور صبح کی دعا کے لئے وضو کرتیں جس سے ان کے چہرے پر تازگی آ جاتی۔

''مقدس کنواری، اس آنے والے دن پر اپنی رحمتیں نازل کر!''

جھکتے جھکتے بالکل فرش سے جا لگتیں، پھر آہستہ آہستہ اٹھتیں اور پھر جو شیلے انداز میں دھیمے دھیمے کہتی جاتیں...''

''اے مسرت کا سرچشمہ! تو ایسی حسین ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ جیسے پھولوں سے لدا ہوا سیب کا درخت!...''

روز صبح کو وہ کنواری کی تعریف و توصیف کے لئے نئے نئے الفاظ ڈھونڈھ نکالتیں اور اسی لئے مجھ

کو روز ان کی دعاؤں کی طرف غور سے توجہ دینی ہوتی تھی۔

''آہ میرے دل کے ٹکڑے، کتنی مقدس، کتنی پاک ہے تو! میری روح کا نور، میرے گھر کی محافظ، آسمان کی مہر تاباں۔ ایسی نورانی، ایسی سنہری۔ اے پروردگار کو جنم دینے والی انمول ہستی! ہم سب کو برائی کے حملے سے بچا! بلاوجہ کی بدنامی سے محفوظ رکھ اور مجھ کو بے سبب آفت سے پناہ دے!''

ان کے سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں محبت بھری مسکراہٹ تیرتی رہتی اور جیسے جیسے وہ اپنے بھدے بھاری ہاتھ سے سینے پر صلیب کا نشان بناتی جاتیں ویسے ویسے ان پر جوانی کا نکھار بڑھتا جاتا۔

''میرے محبوب یسوع مسیح، اے خدا کے بیٹے۔ مجھ گنہگار پر رحم کر، تجھے اپنی ماں کا واسطہ...''

ان کی دعاؤں پر ہمیشہ مسرت اور خوشی کا پرتو چھایا رہتا تھا۔ جیسے کوئی معصوم اور سادہ لوح دل خوشی سے نعرے لگا رہا ہو۔

صبح کے وقت وہ عبادت پر زیادہ وقت صرف نہیں کرتی تھیں کیونکہ اب نانا اب نوکر نہیں رکھ سکتے تھے، نانی اماں کو خود ہی سماوار گرم کرنا پڑتا تھا اور اگر نانا ابا کو ناشتہ میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو پھر نانی اماں کو مسلسل برا بھلا اور سخت سست سننا پڑتا تھا۔

کبھی کبھی نانا ابا اول وقت اٹھ جاتے تو اوپر کی کوٹھری میں چلے آتے۔ نانی اماں اس وقت عبادت کرتی ہوتیں اور وہ خاموش کھڑے رہتے۔ حقارت کی مسکراہٹ ان کے سیاہ لبوں کے کونوں سے جھانکتی رہتی۔ بعد کو ناشتے کی میز پر وہ کہتے:

''میں نے تمہیں کتنی بار عبادت کرنا سکھایا ہے، خر دماغ، لیکن تم وہی اپنے پرانے ڈھرے پر چلی جاتی ہو۔ باز نہیں آتیں۔ بڑ بڑ بڑ بڑ۔ بے دینوں کی طرح! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا یہ سب کیسے برداشت کر لیتا ہے!''

''وہ سب سمجھتا ہے'' نانی اماں بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیتیں۔ ''اس سے جو کچھ بھی کہو، جس طرح بھی کہو، وہ سب سمجھتا ہے...''

''تم تو پاگل ہو! ھو...و...و، کیا لوگ ہیں!''

نانی اماں کا خدا نانی اماں کے ساتھ ہر وقت رہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جانوروں سے بھی اس کا تعارف اور اس کا ذکر کرتی رہتیں۔ مجھے برابر نظر آتا رہتا تھا کہ عام جاندار۔ انسان ہو یا جانور، کتے،

چڑیاں، شہد کی مکھیاں اور یہاں تک کہ پیڑ پودے بھی اس خدا کے سامنے بڑے مزے میں جھک جاتے تھے۔ وہ اس عالم خاکی کی ہر چیز کو یکساں طور پر عزیز تھا۔

ہمارے احاطے میں ایک بلا رہتا تھا جو شراب خانے کے مالک کی بیوی نے پال رکھا تھا۔ بڑا خوبصورت بھورے رنگ کا جسم، چمکتی ہوئی بھوری آنکھیں لیکن زمانہ بھر کا چور اور چٹورا۔ احاطے میں سب لوگ اسے بہت چاہتے۔ اس نے ایک دن ایک مینا پکڑ لی۔ نانی اماں نے زخمی چڑیا کو اس سے چھڑایا او راس کو بڑے غصے میں پھٹکارا:

''ارے تجھے خدا کا خوف نہیں ہے۔ یہی تو مشکل ہے۔ ظالم جلاد کہیں کا!''

شراب خانے کے مالک کی بیوی اور دربان نانی اماں کی اس بات پر ان کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ زور سے بگڑیں:

''تو تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ جانوروں کو خدا کا علم نہیں۔ حقیر سے حقیر جانور بھی اپنے خالق کو جانتا ہے جیسے تم لوگ جانتے ہو۔ سنگ دل!''

جب وہ موٹے شراپ پر ساز کستیں اور وہ سست رہتا تو منہ ہی منہ میں کہتیں:

''بندہ خدا، کیوں اتنا مسمسا رہا ہے؟ اچھا ہاں، اب میں سمجھی۔ تجھ پر بڑھاپا آ رہا ہے۔ ہے نا؟''

گھوڑا ایک لمبی سی آہ بھر کر سر جھٹکتا۔

لیکن نانی اماں نانا ابا کی طرح بار بار خدا کا نام نہیں لیتی تھیں۔ نانی اماں کا خدا میری سمجھ میں بھی آتا تھا اور اس سے مجھے خوف بھی محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اس کی موجودگی میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ شرم آتی تھی اور اسی شرم کی وجہ سے میں نے اپنی نانی اماں سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ایسے رحیم اور مہربان پروردگار سے کوئی بات چھپانا ناممکن تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے میرے دل میں ایسی حرکت کا رجحان کبھی پیدا نہیں ہوا۔

ایک دن شراب خانے کے مالک کی بیوی اور میرے نانا کا جھگڑا ہوا اور اس نے لگے ہاتھوں میری نانی اماں کو بھی آڑے ہاتھوں لے لیا بلکہ ان کو ایک گاجر بھی کھینچ کر ماری۔

نانی اماں نے بڑے اطمینان سے بس اتنا ہی کہا ''تم بھی احمق ہو، بیگم صاحبہ''۔ لیکن مجھے نانی اماں کا خیال کر کے بہت کوفت ہوئی اور میں نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔

تھوڑے دیر تک تو میں سوچتا رہا کہ اس موٹی، لال بالوں اور دوہری ٹھڈی والی تھل تھل پل پل بڑھیا سے کیونکر بدلہ لیا جائے جس کی آنکھیں موٹاپے کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

پڑوس کی ان آپس کی لڑائیوں کے سلسلے میں کئی طریقے بدلہ لینے کے لئے رائج تھے۔ مثلاً میں نے دیکھا تھا کہ انتقال کے لئے بلیوں کی دمیں کاٹ دی جاتی تھیں، مثلاً میں نے دیکھا تھا کہ انتقام کے لئے بلیوں کی دمیں کاٹ دی جاتی تھیں، کتوں کو زہر کھلا دیا جاتا تھا، مرغیاں مار ڈالی جاتی تھیں یا رات کے وقت دشمن کے تہہ خانے میں گھس کر نمکین کھیروں کے کنڈالوں اور اچار کے گھڑوں میں مٹی کا تیل ڈال دیا جاتا تھا، یا بند شرابوں کی مہر توڑ کر ڈاٹیں کھول دی جاتی تھیں۔ لیکن ان تمام طریقوں سے میرا اطمینان نہ ہوا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی زیادہ دلیرانا اور سخت قسم کا بدلہ لیا جائے۔

چنانچہ میں نے یہ طریقہ سوچا: جب شراب بیچنے والے کی بیوی تہہ خانے میں داخل ہوئی تو میں نے آگے سے کنڈی چڑھا دی اور اس میں تالا ڈال دیا۔ پھر میں تہہ خانے پر چڑھ کر مارے خوشی کے خوب ناچا اور تالے کی کنجی چھت پر پھینک دی۔ پھر دوڑا ہوا باورچی خانے میں پہنچا جہاں نانی اماں کھانا پکا رہی تھیں۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھ پر یہ وجدانی کیفیت کیوں طاری ہے۔ پھر جب ان کو معلوم ہوا تو انہوں نے جہاں جہاں چپت لگا سکتی تھیں خوب خوب لگائیں۔ پھر مجھے کھینچتی ہوئی احاطے میں لے گئیں اور کنجی لانے کے لئے مجھے چھت پر چڑھوایا۔

ان کے ردعمل سے میرا دل غم سے کچل گیا۔ نہایت خاموشی کے ساتھ میں نے کنجی لائی اور پھر دوڑ کے احاطے کے ایک کونے میں دبک گیا جہاں سے میں جہاں سے میں دیکھتا رہا۔ نانی اماں نے قیدی کو چھڑایا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ادھر ہی آئیں جدھر میں تھا۔ دونوں بڑے مزے میں ہنس رہی تھیں۔

''ٹھہر جا، دیکھ ابھی اور مرمت کروں گی تیری'' شراب خانے کے مالک کی بیوی نے مجھے مکا دکھاتے ہوئے کہا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ آنکھیں حسب دستور موٹاپے کی وجہ سے نظر ہی نہیں آ رہی تھیں۔ نانی اماں نے میری گردن ناپی اور باورچی خانے میں لے گئیں۔

''کیوں کی یہ حرکت؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اس نے تمہارے اوپر گاجر نہیں پھینکی تھی؟''

''آہاہا۔ تو تو نے میرے واسطے یہ سب کیا، ایں؟ میں تجھے بتاتی ہوں۔ ذرا سی جان اور۔ ٹھہر،

دیکھ ابھی تجھے تندور کے نیچے چوہوں کے ساتھ بند کرتی ہوں، پھر تیری کھوپڑی میں کچھ عقل آئے گی! بڑا بہادر بن کے آیا ہے۔ سورما کہیں کا! کیا تیرے نانا سے کہہ دوں تو ابھی چمڑی ادھیڑ کے دھر دیں۔ اوپر چل، وہاں دو چھتی میں بیٹھ کے کتابوں سے جی لگا۔ چل!''

اس کے بعد انہوں نے دن بھر مجھ سے بات نہیں کی لیکن شام کو عبادت سے پہلے وہ میرے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئیں اور مجھ سے ایسی باتیں کہیں جو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا:

''سن بیٹے، کبوتر و بوتر! بس اتنا یاد رکھنا کہ بڑوں کے معاملے میں کبھی دخل نہ دینا! بڑوں کو ہزار طرح کی ہوس ہوتی ہے، نہ جانے کیا کیا مشقت بھگتنی پڑتی ہے۔ اس لئے وہ لوگ بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن تم ایسے نہیں ہونا، کم از کم ابھی تو نہیں ہو۔ اس لئے تم بس کھیلنے کھانے سے کام رکھا کرو، یہاں تک کہ تمہیں جو زندگی میں کرنا ہے وہ خدا تمہارے دل میں ڈال دے اور جس راستے پر تمہیں جانا ہے اس رستے پر تمہیں لگا دے۔ سمجھ گئے نا؟ اور رہا یہ کہ کسی نے قصور کیا سو اس سے تم کو کیا مطلب۔ خدا خود ہی انصاف کرے گا۔ خود ہی سزا دے گا۔ یہ کام اس کا ہے، ہم لوگوں کا نہیں!''

پھر وہ ایک منٹ چپ رہیں، نسوار لی اور پھر دہنی آنکھ نیچے کر کے بولیں:

''کبھی کبھی تو خود خدا کے لئے بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ قصور کس کا ہے۔''

''کیوں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا وہ سب کچھ نہیں دیکھتا اور نہیں جانتا؟'' اور انہوں نے غمگین آواز میں جواب دیا:

''اگر اسے معلوم ہوتا تو دنیا میں بہت سے کام ایسے ہیں جو لوگ کبھی نہ کرتے۔ وہ تو اوپر جنت میں بیٹھا رہتا ہے اور ہم گنہگاروں کو جو نیچے ہیں دیکھتا رہتا ہے اور کبھی کبھی وہ آنسوؤں سے رونے لگتا ہے پھوٹ پھوٹ کر ''آہ میرے انسانو، میرے انسانو۔ میرے اپنے، میرے محبوب انسانو! آہ میرا دل تمہارے لئے کیسا کچھ خون ہوتا ہے!''

وہ خود رونے لگی تھیں اور آنسو پونچھنے کا خیال کئے بغیر وہ اسی طرح مقدس شبیہوں والے کونے میں چلی گئیں اور عبادت شروع کر دی۔

اس وقت سے ان کا خدا مجھے اور بھی زیادہ محبوب ہو گیا اور بھی زیادہ میری سمجھ میں آنے لگا۔

نانا ابا بھی سبق پڑھاتے وقت مجھ کو یہی سکھاتے تھے کہ خدا سب کچھ جانتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے،

جگہ موجود ہے اور ہر مصیبت میں انسان کی مدد کرتا ہے۔ لیکن ان کے دعا مانگنے کا انداز بالکل دوسرا تھا۔

نانا ابا مقدس شبیہوں کے سامنے جانے سے پہلے بڑے اہتمام سے ہاتھ منہ دھوتے، کپڑے بدلتے اور اپنے سرخ بالوں اور داڑھی میں کنگھی کرتے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ قمیص ٹھیک کرتے، سیاہ گلو بند، جو وہ صدری کے نیچے پہنا کرتے تھے، لپیٹتے اور پھر دبے پاؤں وہ مقدس شبیہوں کی طرف بڑھتے۔ لکڑی کے تختوں کے فرش میں ایک خاص جگہ پر ایک گرہ پڑی ہوئی تھی جو گھوڑے کی آنکھ کی طرح لگتی۔ نانا ابا ٹھیک اسی جگہ پر آ کر رکتے، ان کے دونوں ہاتھ اس طرح اکڑے ہوئے رہتے جیسے سپاہیوں کے ہوتے ہیں۔ لمبے دبلے، سر جھکائے وہ ایک منٹ خاموش رہتے، پھر بڑے موثر انداز میں کہتے:

''باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر!''

مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان الفاظ کے بعد پھر کمرے پر ایک خاص قسم کا سناٹا چھا جاتا تھا یہاں تک کہ مکھیاں بھی ذرا ادب سے بھنبھنانے لگتی تھیں۔

اب نانا ابا پیچھے کو سر جھکاتے بھوؤں کے بال کھڑے ہو جاتے، سنہری داڑھی فرش کے متوازی ہو جاتی۔ وہ اپنی دعائیں بڑے نپے تلے انداز و آواز میں پڑھتے تھے جیسے سبق دھرا رہے ہوں۔ ایک لفظ کو زور دے دے کر کہتے:

''روز محشر نزدیک ہے جسے کا علم کسی کو نہیں، ہر انسان کے اعمال کو ظاہر کرنے کے لئے...''

اپنے سینے پر وہ ہلکے ہلکے ہاتھ مارتے جاتے اور اپنا مدعا بیان کرتے جاتے:

''میں تیرا صرف تیرا ہی گنہگار ہوں معبود۔ میرے گناہوں سے چشم پوشی کر، منہ پھیر لے...''

''ایمان'' دعا کا اعلان کرتے وقت وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے جاتے، ساتھ ہی ساتھ ان کا دائیں پاؤں تال دیتا جاتا۔ صاف ستھرے، چکنے بنے ہوئے اپنی بات وہ اس طرح مقدس شبیہوں کے سامنے کہتے جیسے ان کو حکم دے رہے ہوں۔ ان کا پورا جسم ان شبیہوں کی طرف جھک جاتا اور زیادہ لمبا یا زیادہ دبلا اور زیادہ سخت ہوتا ہوا نظر آتا۔

''تو جس نے مسیح اعظم کو پیدا کیا، میرے دل کو بھی برائیوں سے پاک کر دے، میری روح کی فریاد سن اور مجھ پر رحم کر، اے پروردگار کی ماں!''

پھر وہ چپکے چپکے رونے لگتے، ان کی سبز آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے:

''میرے ایمان کو میرے اعمال سے جانچنا پروردگار اور مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالنا جو میری قوت برداشت سے باہر ہو!''

بار بار وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے۔ تیزی سے کانپتے ہاتھوں سے بکرے کی طرح سر آگے کو بڑھا کر ہلاتے جاتے اور رونی اور بھنبھناتی آواز نکلتی جاتی۔ بعد کو جب میری عمر بڑھی اور مجھے یہودیوں کی ایک عبادت گاہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تب مجھے پتہ چلا کہ نانا ابا یہودیوں کی ایک عبادت گاہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تب مجھے پتہ چلا کہ نانا ابا یہودیوں کی طرح عبادت کرتے تھے۔

سماوار دیر سے میز پر رکھا سنسنا کر ابلتا رہتا، کمرے میں پنیر بھرے ہوئے گیہوں کے سموسوں کی گرم خوشبو پھیلتی جاتی اور مارے بھوک کے میرے پیٹ میں چوہے قلا بازیاں کھاتے رہتے۔ نانی اماں دروازے کی چوکھٹ سے لگی فرش پر نظریں گاڑے کھڑے آہیں بھرتی اور تیوریاں چڑھاتی رہتیں۔ سورج خوشی خوشی کھڑکی میں سے جھانکتا، درختوں پر شبنم موتیوں کی طرح دمکتی، صبح کی ہوا اپنے ساتھ رس بھریوں اور پکتے ہوئے سیبوں کی مہک لا لا کر بکھیرتی۔ لیکن نانا ابا اپنی عبادت میں محو اسی طرح ہلتے اور بسورتے رہتے:

''میری ہوس کی آگ کو بجھا معبود، کیونکہ میں بد بخت ہوں، میری طبیعت چھوٹی اور نیچی ہے!''

مجھے ان کی صبح شام کی دعائیں زبانی یاد تھیں اور میں بڑے غور سے ان کو صرف یہ دیکھنے کیلئے سنا کرتا تھا کہ وہ غلطی تو نہیں کرتے یا کچھ چھوڑ تو نہیں جاتے۔ ایسے موقع آتے تو بہت ہی کم تھے لیکن جب آتے تھے تو مجھے ایک شرارت بھری خوشی، ایک احساس فتح ہوتا تھا۔

جب نانا ابا دعائیں ختم کر چکتے تب میری اور نانی اماں کی طرف مخاطب ہوتے:

''آداب عرض ہے!''

ہم دونوں جھکتے اور آخر کار میز پر بیٹھنے کی نوبت آتی۔

''آپ وہ لفظ چھوڑ گئے نانا۔ وہ ''کافی!'' میں نانا ابا کی طرف مڑ کر کہتا۔

''جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو نا؟ یقین ہے؟'' وہ مشکوک انداز میں پوچھتے۔

''جی نہیں۔ آپ کو کہنا چاہئے تھا ''اور خدا کرے میرا ایمان اتنا کافی ہو کہ...'' لیکن آپ ''کافی''

لفظ چھوڑ گئے۔''

''جی نہیں۔ آپ کو کہنا چاہئے تھا ''اور خدا کرے میرا ایمان اتنا کافی ہو کہ...'' لیکن آپ ''کافی'' لفظ چھوڑ گئے۔''

''ہوں'' وہ چور سے بن کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہتے۔ کسی نہ کسی دن وہ بھی اس بات کا بدلہ نکال لیا کرتے لیکن فی الحال تو میں ان کی گھبراہٹ سے لطف لے لیتا تھا۔

''ورواراکے اب، خدا تمہاری دعائیں سنتے سنتے اکتا تو گیا ہوگا۔ ہمیشہ وہی ایک بات کہتے رہتے ہو۔''

''کیا...آ...؟'' نانا ابا دھمکی دینے والے انداز میں بولے ''یہ تم کیا بڑبڑ کر رہی ہو؟''

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم اپنے خالق کے سامنے اپنے دل سے نکلی ہوئی ایک بات بھی نہیں کہتے۔''

وہ غصے کے مارے کانپتے ہوئے، لال بھبھوکا ہو کر کرسی پر سے اٹھے اور ایک طشتری کھینچ کر نانی اماں کو ماری۔

''نکل جا یہاں سے، چڑیل کہیں کی!'' اور اس طرح چیخنے لگے جیسے کوئی شیشے کو آری سے کاٹ رہا ہو۔

جب کبھی کبھی وہ خدا کے دستِ قدرت کی بات کرتے تو ہمیشہ اس کی قہاری پر زور دیتے۔ مثلاً ایک بار لوگوں نے گناہ کئے تھے تو ان کو سیلاب میں ڈبو دیا گیا، ایک بار ان کے شہر جلا کر تباہ و برباد کر دئے گئے، لوگوں کو قحط اور طاعون کو ذریعہ سزا دی گئی۔ نانا ابا کی نظر میں خدا ایک اپنی تلوار تھا، ایک چابک تھا جو ہر وقت گنہگاروں کے سر پر گرنے کو تیار رہتی تھی۔ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے میز کو بجا بجا کر وہ مجھے ہمیشہ خبردار کرتے رہتے تھے کہ جو شخص بھی خدا کے قانونوں کو توڑے گا، ان کے برخلاف کرے گا اس کا حشر اسی طرح کا ہوگا۔

لیکن مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ خدا بھی اس قدر ظالم ہو سکتا ہے۔ مجھے شک ہوتا تھا کہ نانا ابا نے مجھے خدا کے بجائے اپنے آپ سے ڈرانے کے لئے یہ سب باتیں ایجاد کی ہیں۔ میں ان سے صاف صاف بھی پوچھ لیتا:

''تو یہ سب باتیں آپ مجھے اس لئے بتا رہے ہیں کہ میں آپ کا حکم مانوں؟''

''بالکل!'' وہ اسی شان اور جوش سے کہتے۔ ''مانو گے کیوں نہیں؟ یہ بھی خوب رہی۔''

''اور نانی اماں؟''

''ارے اس احمق کی باتوں میں نہ آنا'' وہ سختی سے کہتے۔ ''وہ تو ساری زندگی ایسی ہی رہی ہے۔ جاہل اور سڑی۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ ایسی اہم باتوں کے بارے میں تم کو کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اچھا میری بات کا جواب دو۔ فرشتوں میں کتنے درجے ہوتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا اور پھر سوال کر دیا:

''اونچے درجے کا آدمی۔ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟''

نانا ابا غراتے ''تجھے تو بس دینا بھر جاننے کی پڑی رہتی ہے۔''

آنکھیں جھکا لیں اور ہونٹ چبانے لگے، بھر ذرا سوچ کر رک رک کر بولے:

''ان باتوں سے خدا کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب انسانوں کا کیا دھرا ہے۔ اونچے درجے کے لوگ ہوتے ہیں جیسے سرکاری افسر لوگ۔ اور افسران کو کہتے ہیں قانون جن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ افسر لوگ قانون کو چبا کے نگل جاتے ہیں۔''

''قانوں کیا ہوتا ہے؟''

''قانون؟ یہ ہے کہ... یعنی کہ قانون وہ ہوتا ہے جو کہ لوگ اپنی عادتیں ڈالنے کے لئے اختیار کرتے ہیں'' بڑے میاں نے جواب دیا۔ ان کی تیز آنکھیں بڑے مزے میں چمک رہی تھیں۔ ''لوگ ساتھ رہتے ہیں اور آپس میں کچھ باتیں طے کر لیتے ہیں، یعنی کہ جیسے اب فلاح کام کرنے کا اچھا طریقہ کون سا ہے، پھر وہ اسے دستور بنا لیتے ہیں، قاعدہ بنا لیتے ہیں اور پھر اسی کو قانون کہتے ہیں! جیسے کچھ لڑکے کوئی کھیل کھیلنے کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں اور پھر طے کرتے ہیں کہ کیوں کر کھیلا جائے اور جو کچھ وہ طے کرتے ہیں بس وہی قانون ہوتا ہے۔''

''اور افسر لوگ؟''

''ان کی حیثیت ایسی ہوتی ہے جیسے بڑے لڑکوں کی جو آ کر کھیل بگاڑتے اور قانون توڑتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''یہ تمہارے سمجھنے والی نہیں ہے!'' انہوں نے ابرو پر بل ڈال کر کہا۔ ''خدا انسانوں کی ہر بات دیکھتا رہتا ہے۔ انسان کچھ چاہتے ہیں لیکن خدا کی مرضی کچھ اور ہوتی ہے! خدا ایک ذرا پھونک مار دے اور سب چیزیں دھول کی اڑ جاتی ہیں۔''

مجھے افسروں سے دلچسپی ہونے کی کئی وجہیں تھیں۔ سوا پنی بات پر اڑا رہا:

''نانا ابا، وہ گانا بھی تو ہے جو یا کوف ماموں گایا کرتے ہیں:

پاک فرشتہ۔ اللہ کے بندے

حکومت کے افسر۔ شیطان کے بندے!''

نانا ابا نے آنکھیں بند کر لیں، داڑھی ہتھیلی پر لپیٹی اور منہ میں ٹھونس لی۔ ان کے گالوں کی تھرتھراہٹ سے مجھے پتہ چل گیا کہ وہ اندر ہنس رہے ہیں۔

''تم اور یاکوف دونوں کو تو بورے میں بھر کے دریا میں ڈبو دے!'' انہوں نے کہا۔ ''اس کو کوئی حق نہیں ہے کہ اس طرح کے گیت گائے اور تم کو بھی نہ چاہئے کہ یہ واہیات گانے سنو! یہ سب کافروں اور بے دینوں کے بتائے ہوئے گیت ہیں، بے ہودہ مذاق!''

انہوں نے ایک منٹ مجھے غور سے دیکھا، پھر ٹھنڈی سانس بھر کے کہا:

''تھو...و...و، کیا لوگ ہیں!..''

ویسے نانا ابا کے تصور میں تو خدا سب سے بلند اور سب کے لئے ایک مصیبت کا باعث تھا۔ لیکن نانی اماں کی طرح وہ بھی یہی مانتے تھے کہ ہمارے معاملات میں خدا کا اور بے شمار اولیاؤں کا ہاتھ تھا۔ نانی اماں صرف چند اولیاؤں کو مانتی تھیں جن میں ہاتھ تھا۔ نانی اماں صرف چند اولیاؤں کو مانتی تھیں جن میں نکولائی، یوری، فرول اور لاور تھے جو بے حد نیک اور اچھے انسان تھے، گاؤں گاؤں، شہر شہر گھوم کرتے تھے، لوگوں کی مدد کرتے تھے اور انسانوں کے ساتھ انسانیت سے پیش آتے تھے۔ لیکن دوسری طرف نانا ابا کے جو اولیا تھے وہ ایسے شہید تھے جنہوں نے بتوں کو توڑا تھا اور روم کے قیصروں کا مقابلہ ڈٹ کر کیا تھا اور اس کے عوض میں ان کو ایذائیں پہونچائی گئی تھیں، جلایا گیا تھا اور زندہ کھال کھینچی گئی تھی۔

کبھی کبھی میرے نانا غمگین آواز میں کہتے:

''کاش خدا اتنا سامان کر دیتا کہ میں اس گھر کو پانچ سو روبل کے منافع پر بھی بیچ سکتا تو پھر میں ولی

نکولائی کی فاتحہ کرواتا!''

نانی اماں ہنس کر مجھ سے کہتیں:

''بڈھا بیوقوف۔ جیسے نکولائی کو ان کا گھر بکوانے سے بہتر اور کوئی کام کرنے کو تھوڑا ہی ہے!''

کئی سال تک مسلسل میں اپنے نانا ابا کی سالانہ مذہبی جنتری اکٹھا کرلیا کرتا تھا۔ اس جنتری پر کسی کسی تاریخ پر کوئی کوئی نشانات لگے ہوئے تھے۔ سینٹ ایوکیم اور سینٹ آنا کی تاریخوں کے آگے لکھا تھا ''ان کی عنایت، رحم وکرم سے ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات ملی۔''

مجھے یاد ہے کہ وہ کیا ''مصیبت'' تھی۔ اپنے ناکارہ بیٹوں کی مدد کرنے کے سلسلے میں نانا ابا نے لوگوں کی قیمتی چیزیں اپنے پاس گیروی رکھ کے سود پر قرض دینا شروع کیا تھا کسی نے اس کی اطلاع پولیس میں کردی اور ایک رات پولیس ہمارے گھر کی تلاشی لینے آئی۔ بڑا ہنگامہ ہوا لیکن خیر پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ نانا ابا رات بھر دعائیں پڑھتے اور صبح کو انہوں نے میرے سامنے یہ الفاظ جنتری پر لکھے۔

پھر رات کے کھانے تک وہ میرے ساتھ مناجات پڑھتے رہے، اور ایفریم سیرین کی پوری جلد دھراتے رہے۔ کھانے کے بعد پھر نماز پڑھتے رہے اور رات کے سناٹے میں ان کی آواز گونجتی رہی:

''تو جو چاہے دے، جو چاہے لے۔ بروں سے ہم کو پناہ دے... ہم کو ہوس سے لالچ سے محفوظ رکھ... بروں سے ہم کو پناہ دے... ایسا کر کہ میرے آنسو میرے گناہوں کو دھو دیں...''

مگر میری نانی اماں اکثر کہتیں:

''آہ، آج میں کس قدر تھک گئی ہوں! لگتا ہے بغیر نماز پڑھے ہی بستر پر پڑ جاؤ گی۔''

نانا ابا مجھے اپنے ساتھ گرجے لے جایا کرتے۔ سنیچر کے دن رات کی نماز میں اور اتوار کو بھی جو دیر تک دعائیں ہوتی رہتی تھیں اس میں۔

گرجے میں بھی مجھے محسوس ہو جاتا تھا کہ کون کس خدا کی عبادت کر رہا ہے۔ بڑے پادری صاحب اور چھوٹے پادری صاحب تو نانا ابا کے خدا کی عبادت کرتے تھے لیکن ان کے ساتھ جو سنگیت منڈلی رہتی تھی وہ نانی اماں کے خدا سے مخاطب رہتی تھی۔

یقیناً میں نے اس تفریق کی بڑی بھدی سی تصویر کھینچی ہے جو میرے طفلانہ ذہن میں ان دونو خداؤں کے متعلق تھی۔ ایک ایسی تفریق جو مجھے اب تک یاد ہے کہ میرے ذہن میں سخت روحانی الجھاؤ کا

سبب بنی رہتی تھی۔ میں نانا ابا کے خدا سے ڈرتا بھی تھا، اس سے نفرت بھی کرتا تھا۔ یہ ایسا خدا تھا جو کسی سے محبت نہیں کرتا تھا اور ہر ایک پر کڑی نظر رکھتا تھا، جس کی بنیادی دلچسپی صرف اس بات میں تھی کہ وہ انسان کے کسی کمینہ پن یا کسی برائی یا بے ہودگی کے بے نقاب کر دے۔ ظاہر ہے کہ اسے انسان پر بھروسہ نہ تھا، اس کی خواہش ہمیشہ یہ رہتی تھی کہ لوگوں کو شرمندہ کرے۔ سزا دینے میں اس کو لطف آتا تھا۔

اس زمانے میں میرے ذہن پر خدا کی ذات سب سے زیادہ چھائی ہوئی تھی اور وہی واحد حسن تھا جو مجھے زندگی میں دکھائی دیتا تھا۔ باقی تمام تاثرات سے مجھے نفرت اور رنج ہوتا تھا کیونکہ ان میں ظلم اور گندگی بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ خدا۔ نانی اماں کا خدا۔ جو تمام جانداروں کا رفیق اور دوست تھا، میرے ماحول میں سب سے زیادہ حسین اور بہترین چیز تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نانا ابا کو خدا کی یہ اچھائی کیوں نہیں دکھائی دیتی۔

مجھے باہر گلی میں کھیلنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ میں بہت جوش سے بھر جایا کرتا تھا۔ وہاں کھیلنے سے مجھ پر جو تاثرات ہوتے تھے وہ نشے کی طرح میرے دماغ پر چڑھ جاتے تھے اور میں ہمیشہ کسی نہ کسی لڑائی یا جھگڑے کی جڑ بن جاتا تھا۔ کسی سے میری دوستی بھی نہیں ہوتی تھی اور پاس پڑوس کے زیادہ تر بچے میرے خلاف رہتے تھے۔ مجھے اس بات سے چڑ تھی کہ مجھے کاشیرین کہا جائے۔ اور جب ان لوگوں کو یہ پتہ چل گیا تو وہ ایک دوسرے سے چلا چلا کر یہ نام لیتے رہتے تھے:

''وہ آیا کاشیرین کا نواسہ، کنجوس کاشیرین کا نواسہ، دیکھو، دیکھو!''

''مارو، گراؤ!''

اور بس پھر لڑائی شروع ہو جاتی۔

میں اپنی عمر کے حساب سے زیادہ مضبوط تھا اور لڑنے میں دلیر۔ میرے دشمن بھی اس بات کو مانتے تھے اور مجھ پر اکیلے حملہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ اس لئے میں اکثر ان کے ہاتھوں پٹتا اور خون بہتی ہوئی ناک، کٹے ہوئے ہونٹ اور نچے ہوئے کپڑوں سمیت گھر آتا۔

نانی اماں مجھے دیکھ کر خوف سے گھبرا جاتیں:

''کیا؟ تو نے لڑنا شروع کر دیا، ننھا پلا! اچھا ٹھہر میں تجھے بتاتی ہوں۔ کہاں سے شروع کروں؟''

وہ میرا منہ دھلاتیں، چوٹ پر کوئی تانبے کا سکہ یا جڑی بوٹی یا عرق لگاتی جاتیں اور کہتی جاتیں:

''آخر تو کیوں اس طرح لڑتا ہے؟ گھر پر تو تو ایسا نیک بنا رہتا ہے لیکن گلی میں جا کر تجھ پر کیوں شیطانی سوار ہو جاتی ہے؟ ڈوب مر! ٹھیر تیرے نانا سے کہتی ہوں تیرا باہر نکلنا بند کریں۔''

نانا ابا کی نگاہ میرے زخموں اور گومڑوں پر ضرور پڑتی لیکن وہ ان باتوں پر سچ مچ خفا نہ ہوتے، بس بڑبڑا کر رہ جاتے:

''کیوں بے، پھر تمغے لگا لایا؟ کیا بہادر سپاہی ہے! لیکن اب اگر میں نے تجھے گلی میں دیکھا تو پھر نہ کہنا۔ این؟ سنتا ہے؟''

جب گلی میں سناٹا چھایا رہتا تب تک تو مجھے باہر جانے کی کوئی خواہش پیدا نہ ہوتی لیکن جب میں بچوں کی مسرت بھری آوازیں اور چیخیں سنتا تو نانا کی نصیحت بھول کر باہر گلی میں دوڑ جاتا۔ مجھے چوٹیں کھانے سے تو کوئی ڈر نہیں لگتا تھا لیکن لڑکوں کے ظالمانہ مذاق کا میں کبھی عادی نہیں ہو سکتا تھا۔ ظالمانہ حرکتوں کو میں برابر دیکھتا تھا اور خوب پہچانتا تھا۔ ظلم وستم کی حرکتیں دیکھ کر میں غصے سے پاگل ہو اٹھتا تھا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ مرغوں اور کتوں کو آپس میں لڑائیں، بلیوں کو پکڑ پکڑ کر طرح طرح کی ایذائیں دیں، یہودیوں کی بکریاں ادھر ادھر ہنکا دیں، نشے میں دھت فقیروں اور بچارے اللہ میاں کی گائے ایگوشا کو چھیڑیں:

''ایگوشا۔ موت کا ہرکارہ!''

ایگوشا لمبا اور پتلا دبلا، مریل مریل سا میلا کچیلا آدمی تھا۔ اس کے ہڈی ہڈی سوکھے چہرے پر داڑھی کانٹوں کی طرح نکلی رہتی تھی۔ وہ سڑک پر چلتا تو بھیڑ کی کھال کے کوٹ میں چھپا ہوا اس کا خمیدہ جسم کچھ عجیب طرح سے جھومتا اور ہلتا۔ اس کی آنکھیں زمین پر گڑی رہتیں۔ اس کا سیاہ چہرہ اور غم زدہ آنکھیں دیکھ کر میرے دل میں حیرانی، رعب اور احترام کا جذبہ پیدا ہوتا۔ مجھے لگتا کہ یہ آدمی کوئی بڑا مقدس فرض پورا کر رہا ہے اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرنی چاہئے۔

لیکن چھوکرے اس کے پیچھے بھاگتے اور اس کی کبڑی پیٹھ پر پتھراؤ کرتے۔ کچھ دیر تو وہ کوئی دھیان نہ دیتا جیسے اسے ذرا چوٹ نہ لگ رہی ہو۔ پھر یکایک وہ رک جاتا اور سر پیچھے تان کر چاروں طرف نظر دوڑاتا اور بڑے جھٹکے سے ہاتھ سر پر لے جاتا اور اپنی جھبری ٹوپی برابر کرنے لگتا جیسے کسی نے نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا ہو۔

چھوکرے چلاتے ''ایگوشا۔ موت کا ہرکارہ! ایگوشا کہاں چلے؟ ذرا اپنی جیب دیکھو۔ اس میں موت بیٹھی ہے!''

وہ اپنی جیب کو دبوچ لیتا، جھکتا، پتھر یا مٹی کا ڈھیلا اٹھاتا اور بڑے بے ہنگم پن سے اپنا لمبا بازو ہوا میں لہراتے ہوئے زیرلب کوستا۔ اس کی زبان سے وہی تین گالیاں نکلتیں۔ لڑکوں کی زبان اس معاملے میں ذرا زیادہ منجھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ لنگڑاتا لنگڑاتا ان لوگوں کے پیچھے بھاگتا۔ لمبا کوٹ پاؤں میں اٹک جاتا، وہ گھٹنوں کے بل گر پڑتا اور اپنے آپ کو چکنے بازوؤں پر سنبھالتا جو آستینوں سے لکڑیوں کی طرح نکلے ہوئے نظر آتے۔ پھر لڑکے اس پر پتھراؤ کرتے، جو اور ذرا ہمت ور ہوتے وہ دوڑ کر اس کے نزدیک تک پہونچ جاتے اور اس کے سر پر مٹھیاں بھر بھر کے دھول جھونک کے بھاگ کھڑے ہوتے۔

لیکن ہماری گلی کا غالباً سب سے دردناک منظر ہمارے پرانے مستری گریگوری ایوانووچ پیش کرتے تھے۔ وہ بالکل اندھے ہو چکے تھے اور شہر میں مارے مارے پھرتے اور بھیک مانگ کر دن گذارتے تھے۔ وہ سر اٹھائے خاموشی اور وقار کے ساتھ پیچھے پیچھے چلتے۔ اور آگے آگے ایک چھوٹی سی بڑھیا ہوتی تھی جس کے سب بال سفید تھے۔ وہ ہر کھڑکی کے سامنے رکتی اور باریک سی، معصوم سی آواز میں کہتی:

''یسوع مسیح کے واسطے ایک غریب اندھے کی مدد کرو لوگو...''

مستری گریگوری کچھ نہ بولتے۔ ان کی سیاہ شیشوں والی عینک بس سامنے کھڑکی کو یا دیوار کو یا جس سے بھی ملاقات ہوتی ان کی صورت تکتی رہتی۔ رنگ سے رنگے ہوئے ہاتھ خاموشی اور سکون کے ساتھ داڑھی پر پھیرتے رہتے لیکن ان کے ہونٹ ہمیشہ بھنچے ہوئے رہتے۔ میں ان کو دیکھتا تو اکثر تھا لیکن ان سخت لبوں سے آواز کبھی نہیں سنائی دیتی تھی۔ یہی خاموشی سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ میں کبھی ان کے نزدیک نہیں جاتا تھا۔ ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ لیکن جب کبھی میں ان کو دور سے دیکھتا تو دوڑا دوڑا گھر جاتا اور نانی اماں کو اطلاع دیتا:

''ہائے!'' وہ زور سے غمناک اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہتیں۔ ''اچھا۔ دوڑ یہ دے آ!''

میں سختی سے انکار کر دیتا۔ پھر وہ خود پھاٹک سے لگل جاتیں اور وہاں کھڑی مستری جی سے دیر تک باتیں کیا کرتیں۔ وہ مسکراتے، داڑھی ہلنے لگتی لیکن کبھی کبھار ایک آدھ لفظ منہ سے نکلتے۔

کبھی کبھی نانی اماں ان کو باورچی خانے میں لے آتیں اور کھانا کھلاتیں۔ایک مرتبہ انہوں نے نانی سے پوچھا کہ میں کہاں ہوں۔نانی اماں نے مجھ کو آواز دی لیکن میں بھاگ کر لکڑیوں کے گٹھوں کے پیچھے چھپ گیا۔میری ہمت نہ پڑی کہ ان سے ملاقات کروں۔ان کا سامنا کرتے مجھے بہت شرم آتی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ نانی اماں کو بھی ان سے شرم آتی تھی۔صرف ایک بار مستری جی کے متعلق میری انکی بات چیت ہوئی تھی۔وہ ان کو پھاٹک تک پہنچا کر واپس آرہی تھیں۔روتی ہوئی، احاطے سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی، سر جھکا ہوا تھا۔میں ان کے پاس پہنچا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''تم ان کو دیکھ کر ہمیشہ کیوں بھاگ کھڑے ہوتے ہو؟''انہوں نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا۔''وہ تم کو اتنا چاہتے ہیں اور ایسے بھلے آدمی ہیں۔''

''نانا ابا ان کو کیوں کھانا نہیں دیتے؟''میں پوچھا۔

نانا ابا؟''

وہ رک گئیں اور مجھے اپنے سینے سے لگا کر پیغمبرانہ پیشین گوئی کے ساتھ کہنے لگیں:

''میری بات یاد رکھنا۔خدا ہم لوگوں کو اس بات کی سزا دے گا، بہت بڑی سزا دے گا!''

اور وہ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔تقریباً دس ہی سال بعد جب نانی اماں کا انتقال ہو گیا تو میرے سڑی نانا ابا شہر کی گلی گلی میں بھیک مانگتے نظر آنے لگے، روٹی کے لئے گھر گھر ہاتھ پھیلانے لگے۔

''خدا کے پیارو، کوئی روٹی کا ٹکڑا دو! تھو...و...، کیا لوگ ہیں!''

ان کے پرانے وجود میں سے صرف یہ حصہ ''تھو...و...و، کیا لوگ ہیں!''ان کے پاس باقی رہ گیا تھا۔

ایگوشا اور مستری گریگوری کے علاوہ ایک بڑھیا گھٹیا عورت وارونیخا تھی جس کی ایک جھلک ہی مجھے گلی سے بھگا دینے کے لئے کافی ہوتی تھی۔وہ ہر اتوار کو ہماری گلی میں وارد ہو جاتی۔بڑی سی، بھدی سی، اجڑی بچڑی، نشے میں دھت۔وہ عجیب طریقے سے چلتی تھی جیسے نہ تو اس کے پاؤں چل رہے ہوں، نہ زمین سے چھو رہے ہوں بلکہ طوفانی بادل کی طرح تیر رہے ہوں۔ساتھ ساتھ وہ اونچی تیز آواز میں گندے گیت گاتی بھی تھی۔گلی کے لوگ اس کو دیکھتے ہی بھاگتے تھے اور دیواروں کی آڑ یا دوکانوں یا ٹٹیوں کے پیچھے چھپ جاتے تھے۔معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گلی میں جھاڑو دیتی چل رہی ہو۔اس کا چہرہ نیلا اور پھولا

ہوا تھا، باہر نکلی ہوئی بھوری آنکھیں بڑے خوفناک اور مضحکہ خیز طریقے سے گول گول گھومتی تھیں اور کبھی کبھی وہ چیخ چیخ کر روتی تھی:

''میرے بچے کہاں گئے؟ میرے بچے کہاں ہیں؟''

میں نے اپنی نانی اماں سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

پہلے تو وہ ٹال گئیں ''تم کیا کرو گے پوچھ کر؟'' لیکن پھر انہوں نے مختصر الفاظ میں مجھے بتایا کہ اس عورت کا شوہر پہلے ایک افسر تھا جس کا نام وارونوف تھا۔ لیکن بڑا عہدہ حاصل کرنے کی خاطر اس نے اس عورت کو اپنے افسر اعلے کے ہاتھ بیچ دیا جس نے اسے دو سال تک اپنے پاس رکھا۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے دونوں بچے۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ مر چکے تھے اور شوہر سرکاری روپیہ جوئے میں ہار کر جیل جا چکا تھا۔ صدمے سے اس کا دماغ قابو میں نہیں رہا اور اس نے شراب پینی اور آوارگی کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ اب یہ نوبت پہونچ گئی تھی کہ ہر اتوار کو شام کے وقت پولیس اس کو گلیوں سے پکڑ کر لے جاتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گھر جیسا بھی تھا بہر حال گلی سے بہتر تھا۔ خاص طور پر دن کے کھانے کے بعد بہت اچھا لگتا تھا جب نانا ابا یا کوف ماموں سے ملنے چلے جاتے تھے۔ نانی اماں کھڑکی کے نزدیک بیٹھ جاتیں، مجھ کو کہانیاں سناتیں اور میرے ابا مرحوم کا ذکر کرتیں۔

نانی اماں نے مینا کا ایک پر کاٹ دیا تھا (جو بلی کے پنجوں سے بچ گئی تھی) اور بڑی ہوشیاری سے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے بجائے ایک چھوٹی سی لکڑی باندھ دی تھی۔ اب وہ بالکل ٹھیک تھی اور نانی اماں اس کو بات کرنا سکھایا کرتی تھیں۔ کھڑکی کے پاس وہ گھنٹہ بھر کھڑی رہتیں اور وہ الفاظ رٹا کرتیں جو وہ مینا کو بولنا سکھاتی تھیں۔

''اچھا لے، اب کہو، مینا کو دلیا دو!''

مینا مسخرے کی طرح اپنی گول گول آنکھیں نانی اماں کی طرف مٹکاتی، اپنا لکڑی کا پاؤں پنجرے پر مارتی، گردن لمبی کرتی اور کوئل کی طرح کوکتی، کبھی کتے کی طرح بھونکتی، کبھی بلی کی طرح میاؤں کرتی مگر انسانی آوازیں نکالنے میں اس کو سخت جانفشانی کرنی پڑتی۔

''بس بس، بکواس بہت ہوئی'' نانی اماں بڑی سنجیدگی سے کہتیں۔ ''چلو کہو، مینا کو دلیا دو!''

اگر وہ پردار بندر یا کچھ بھی آواز نکال دیتی جو میری نانی اماں سے تھوڑی سی بھی ملتی جلتی ہوتی تو نانی اماں خوشی سے اچھل پڑتیں اور اپنی انگلی پر ذرا سا دلیا رکھ کر اسے کھلاتیں،

''شریر میں تجھے خوب جانتی ہوں۔ بہروپیا، کوئی بات تجھ سے بعید نہیں۔''

اور انہوں نے سچ مچ اس کو بولنا سکھا دیا۔ کچھ عرصے بعد وہ بڑے صاف طور سے دلیا مانگنے لگی اور جہاں نانی اماں کو دیکھتی بس اس طرح چلاتی کہ بالکل لگتا پکار رہی ہے ''ھلو، ھلو''۔

پہلے تو مینا نانا ابا کے کمرے میں ٹنگی رہتی تھی لیکن جب اس نے نانا ابا کی نقل کرنی شروع کر دی تو وہاں سے نکال دی گئی اور ہماری دوچھتی میں پہونچ گئی۔ نانا ابا بڑے زور زور سے نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور مینا اپنی زرد چونچ پنجرے کی سلاخوں سے نکالتی اور زور زور سے کہتی:

''چو چو۔ چو چو۔ چو چو چو!''

اس سے نانا ابا چڑتے تھے۔ ایک دن وہ نماز چھوڑ چھاڑ اپنے پیر پٹخ پٹخ کر غصے سے چلانے لگے:

''لے جاؤ اس شیطان کو یہاں سے، نہیں تو میں اس کی جان لے لوں گا!''

ہمارے گھر میں دلچسپی کے بہت سے سامان تھے، دل لگنے کو بہت کچھ تھا لیکن کبھی کبھی میرے دل میں ایک گہری سی ہوک اٹھتی تھی اور میرے وجود پر چھا جاتی تھی جیسے مجھ پر کوئی بھاری بوجھ ہو، جیسے میں کسی سیاہ تاریک گھڑے میں بالکل نیچے پڑا ہوں جہاں نہ مجھے کچھ سوجھتا ہو نہ سنائی دیتا ہو نہ محسوس ہوتا ہو، جیسے میری آنکھوں کی روشنی ختم ہو چکی ہو اور میں نیم مردہ ہوں...

8

اچانک میرے نانا نے یہ مکان شراب خانے کے مالک کے ہاتھ بیچ دی اور خود کنا تنایا گلی میں دوسرا مکان خرید لیا۔ یہ گلی صاف ستھری اور خاموش تھی، راستہ کچا تھا جس پر گھنی گھاس اگی ہوئی تھی۔ اسی میں سے ہو کر میدانوں کو راستہ جاتا تھا اور دونوں طرف چھوٹے چھوٹے شوخ رنگوں سے رنگے ہوئے مکانات تھے۔

یہ نیا مکان پرانے والے سے زیادہ اچھا اور دل خوش کن تھا۔ سامنے کا حصہ گہرے اور پرسکون سرخ رنگ کا تھا جس میں سے نیچے کی منزل کی تین نیلے رنگ کی چھجے دار کھڑکیاں اور دوچھتی کی جالی دار کھڑکی

باہر کو نکلی ہوئی اور بائیں طرف دو گھنے درختوں کی شاخیں اور پتیاں چھت پر جھکی ہوئی تھیں۔ احاطے اور باغ میں عجیب عجیب قسم کے کونے کھدرے تھے جیسے وہ خاص آنکھ مچولی کھیلنے کے مقصد ہی سے بنائے گئے ہوں۔ باغ بہت پیارا تھا، بہت بڑا تو نہیں لیکن چاروں طرف بیلوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا۔ ایک طرف کو حمام تھا۔ چھوٹا سا، ستھرا سا، جیسے کوئی کھلونا ہو۔ دوسرے کونے میں ایک چوڑا کافی گہرا گڈھا تھا جس میں جھاڑ جھنکاڑ اگ آئے تھے اور اس میں سے پرانے حمام کی بچی کھچی جلی جھاسی باقیات دکھائی دیتی تھیں۔ بائیں طرف کو باغ کی حد کرنل اوفسیا نیکوف کے اصطبل سے ملتی تھی اور داہنی طرف کو ہیٹلنگ کے شاگرد پیشے کی کوٹھریوں سے۔ حد کا آخری حصہ پیتروونا گوالن کے مکان اور احاطے سے ملتا تھا۔ پیتروونا خوب موٹی تازی تھی، سرخ چہرہ، ہر وقت شور مچایا کرتی اور اس کا وجود گھنٹی کی طرح بجا کرتا۔ اس کا چھوٹا سا مکان بہت پرانا اور اندھیرا تھا۔ اس کی چولیں ہل چکی تھیں، بہت سا حصہ زمین میں دھنس گیا تھا اور چاروں طرف کائی لگی نالے بن گئے تھے۔ دو کھڑکیاں میدانوں کی طرف کھلتی تھیں جن میں گہرے نالے بن گئے تھے۔ اور پھر ان کے آگے دور جنگل کی نیلی نیلی پر چھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ سپاہی سارا سارا دن ان میدانوں میں قواعد کیا کرتے اور خزاں کے سورج کی تپتی دھوپ میں ان کی سنگینیں بجلی کی طرح تڑپا کرتیں۔

ہمارے گھر میں اس طرح کے لوگ بھرے تھے جیسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ سامنے کے کمرے میں ایک فوجی رہتا تھا۔ وہ تاتاری تھا اور اس کی گول مٹول ناٹی بیوی دن بھی ہنسی اور چلاتی رہتی اور صبح سے شام تک ایک چھتارا بجایا کرتی جس پر شوخ نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔

وہ اکثر اپنی اونچی، کھنکھناتی ہوئی آواز میں یہ گیت گایا کرتی: ''جب نفرت تو محبت کیوں ہو۔''

اکیلے عشق میں مزا کیا!

عشق کو ڈھونڈو کوئی دوسرا!

ڈھونڈو کوئی، ڈھونڈو کوئی!

عشق کا پھل انتظار میں ہے،

انتظار میں،

ہائے کتنا میٹھا ہے مزا عشق کا!

اس کا شوہر جوگیند کی طرح گول مول تھا، کھڑکی کے پاس بیٹھا پائپ پیا کرتا ہر بار کش لیتے وقت اس کے نیلے نیلے گال پھول جاتے، مسکراتی ناچتی ہوئی بھوری آنکھیں گول گول گھومنے لگتیں اور وہ اس طرح کھانستا کہ بھونکنے کی سی آواز نکلتی:

ایک لمبا سا اداس تاتاری چپراسی والٹی اور دو ٹھیلے والے اس شاگرد پیشے کی کوٹھری میں رہتے تھے جو گدام اور اصطبل کے اوپر تھی۔ ان میں سے ایک کو لوگ چچا پیوتر کہتے تھے۔ چھوٹا سا قد، سفید بال۔ اور دوسرا اس کا گونگا اور بہرا بھتیجا استیو پا تھا۔ استیو پا خوب چکنا مکنا رہا کرتا تھا اور اس کا چہرہ پیتل کی منجھی ہوئی تھالی کی طرح لگتا تھا۔ یہ سب لوگ میرے لئے بالکل نئے تھے اور نئی دلچسپیوں کا سامان نظر آتے تھے۔

لیکن میرے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہستی ''بہت خوب'' کی تھی۔ ان کا کمرہ باورچی خانے کی پشت پر تھا اور وہ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ ان کا کمرہ لمبا سا تھا۔ اس میں دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک کھڑکی باغ میں کھلتی تھی اور دوسری احاطے میں۔

وہ دبلے پتلے ذرا جھکے ہوئے آدمی تھے۔ ان کی سیاہ داڑھی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی اور داڑھی کی سیاہی کی وجہ سے چہرے کی زردی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں شفقت تھی، عینک لگاتے تھے، عام طور پر خاموش رہتے تھے اور دخل در معقولات نہیں کرتے تھے۔ جب ان کو اطلاع دی جاتی تھی کہ کھانا تیار ہے یا چائے تیار ہے تو ہمیشہ کہتے تھے:

''بہت خوب۔''

نانی اماں نے ان کا نام ''بہت خوب'' رکھ دیا تھا۔ اور پیٹھ پیچھے ان کو یہی کہتی تھیں، بلکہ سامنے بھی کہہ دیتی تھیں۔

''جاؤ ''بہت خوب'' سے کہو چائے پی لیں آ کے!'' یا ''آپ اور لیجئے نا ''بہت خوب'' صاحب! آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے۔''

ان کے کمرے میں بہت سے لکڑی کے بکس ٹھسے ہوئے تھے اور غیر مذہبی کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر۔ طرح طرح کے رنگوں کے عرق سے بھری ہوئی بوتلیں، سیسے، لوہے اور تانبے کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ سرخ رنگ کی چمڑے کی جیکٹ اور بھورے رنگ کا چارخانے دار پتلون پہنے رہتے تھے۔ کپڑوں پر ہمیشہ پالش کے چھینٹے نظر آتے اور ایک عجیب قسم کی بدبو ان میں سے ہمیشہ آیا

کرتی۔صبح سے شام تک وہ کھڑے سیسہ پگھلایا کرتے، تانبے کے ٹکڑے جوڑا کرتے، اپنے چھوٹے سے کانٹے میں کچھ نہ کچھ تولا کرتے، خوں خوں کرتے جاتے، کبھی انگلی جلا لیتے اور پھر اس پر جلدی جلدی پھونکیں مارتے ہوئے دیوار پر ٹنگے ہوئے نقشہ کی طرف ٹھوکر کھاتے ہوئے جاتے، عینک پونچھتے اور اتنے غور سے اس کو پڑھتے کہ سفید لمبی، قلم نما ناک خاکے سے بالکل جا لگتی۔کبھی کبھی کھوئے بالکل خاموش بیچوں بیچ کمرے میں یا کھڑکی کے پاس کھڑے ہو جاتے اور آنکھیں بند کئے دیر تک اسی طرح کھڑے رہتے۔ خاموش بے حس وحرکت، سر اٹھائے۔

میں احاطے میں سے ہو کر برآمدے کی چھت پر چڑھ جاتا اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے میز پر رکھے ہوئے چراغ کی نیلی لو مجھے نظر آنے لگتی اور اس پر ان کے جھکے ہوئے جسم کا تاریک سایہ۔وہ ایک پرانی سی نوٹ بک میں کچھ لکھتے دکھائی دیتے اور ان کی عینک کے شیشے سرد برف کے آسمانی رنگ کے ٹکڑوں کی طرح چمکا کرتے۔

اس شخص کے ساحرانہ انداز کا مجھ پر اتنا اثر ہوتا کہ میں گھنٹوں چھت پر چپکا رہتا اور دل میں کچھ معلوم کرنے کی سخت چبھن محسوس ہوتی۔

کبھی کبھی وہ چوکھٹے میں لگی ہوئی تصویر کی طرح کھڑکی میں کھڑے ہو جاتے، پیچھے ہاتھ باندھے چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہتے لیکن وہ مجھے کبھی نہ دیکھتے۔اس سے مجھے کوفت ہوتی۔ایک دم اچھل کر وہ میز کے نزدیک پہونچ جاتے اور وہاں اپنی چیزوں اور کاغذات کو جلدی جلدی الٹ پلٹ کر کے کچھ ڈھونڈنے لگتے۔

اگر وہ امیر ہوتے اور اچھے کپڑے پہنا کرتے تو غالباً مجھے ان سے ڈر لگتا، لیکن وہ غریب تھے۔ بھوری جیکٹ میں سے ان کا میلا، مڑا چڑا کالر باہر جھانکتا رہتا، پتلون میں پیوند اور دھبے تھے، ننگے پاؤں میں پہنے ہوئے جوتے کبھی کے گھس پٹ کے بیکار ہو چکے تھے۔اور غریبوں میں نہ ڈرنے والی کوئی بات ہوتی، نہ اس سے کسی قسم کا خطرہ ہوتا ہے۔اس بات کا یقین مجھے اس مہربانی سے ہوا تھا جو نانی اماں غریبوں پر کیا کرتی تھیں اور اس حقارت سے ہوا تھا جس کا نانا ابا غریبوں کے لئے اظہار کیا کرتے تھے۔

ہمارے گھر میں ''بہت خوب'' کو کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ہر شخص ان کا مذاق اور تمسخر سے ذکر کرتا تھا۔ فوجی کی چھبیلی بیوی ان کو ''قلم کی ناک'' کہتی تھی، چچا پیوتر ان کو عطار اور جادوگر کہتے تھے اور نانا ابا کہتے تھے

کہ وہ عمل سفلی کرتے تھے۔

''یہ کیا کرتے ہیں؟'' میں نے اپنی نانی سے پوچھا مگر انہوں نے جلدی سے جواب دیا:

''تم سے واسطہ۔ کسی وقت اپنی زبان بند بھی رکھا کرو۔''

ایک دن میں اپنی پوری ہمت سے کام لے کر ان کی کھڑکی کے پاس گیا اور بمشکل اپنے اشتیاق کو دبا کر پوچھا:

''آپ کیا کر رہے ہیں؟''

وہ چونک پڑے اور عینک کے پیچھے سے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنا جھلسا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا:

''آؤ۔ اندر آ جاؤ۔''

انہوں نے جو مجھے دروازے کے بجائے کھڑکی سے اندر آنے کو کہا تو ان کی عزت میری نظروں میں بڑھ گئی۔ وہ ایک بکس پر بیٹھ گئے، مجھ کو اپنے سامنے بٹھایا، ادھر ادھر گھمایا اور آخر کار پوچھا:

''کہاں سے ٹپک پڑے بھئی تم؟''

یہ سوال بڑا عجیب تھا کیونکہ میں دن میں چار بار ان کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھتا تھا!

''میں یہاں نواسہ کہلاتا ہوں۔''

''اچھا۔ ہاں'' انہوں نے کہا اور پھر اپنی ایک جھلسی ہوئی انگلی کو کھوئے انداز میں غور سے دیکھنے لگے۔

میں نے سوچا کہ معاملہ ذرا اور صاف کر دوں:

''لیکن میں کاشیرین نہیں ہوں۔ میں پیشکوف خاندان سے ہوں۔''

''پیشکوف؟'' انہوں نے غلط جگہ زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب۔''

پھر انہوں نے مجھے ایک طرف دھکیلا، اٹھے اور میز کی طرف گئے۔

''اچھا بیٹھ جاؤ۔ اور دیکھو شور نہ کرنا۔''

میں بڑی دیر تک وہاں بیٹھا دیکھتا رہا کہ وہ کس طرح تانبے کے ٹکڑے کو چمٹے میں پکڑ کر اس کا برادہ بنا رہے ہیں۔ جب کافی برادہ بن گیا تو انہوں نے اس سنہری سنہری ریت کو بٹور کر ایک موٹے سے

پیالے میں رکھ دیا۔ پھر انہوں نے ایک برتن میں نمک کی طرح سفید سفید کوئی سفوف نکالا اور اس کو برادے پر ڈال کے اس پر کوئی سیاہ سیال چیز ڈال دی۔ پیالہ میں بھرا ہوا مادہ شائیں سے ابل پڑا اور اس میں سے ایسی تیز بو نکلی کہ میں زور زور سے کھانسنے لگا۔ جادوگر نے ذرا اکڑ کے پوچھا:

''کیوں، بری ہے بو؟''

''ہاں۔''

''آہاہاہا! پھر تو ٹھیک ہے بھائی۔ ٹھیک، بہت ٹھیک ہے، بہت اچھا ہے!''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں اترانے کی کیا بات تھی۔

''اگر یہ بری چیز ہے تو پھر کیسے ٹھیک ہے، کیسے اچھا ہے؟''

انہوں نے اپنی آنکھیں جھپکائیں ''ارے ایسے نہ کہو۔ ہمیشہ یہ بات ٹھیک تھوڑا ہی ہو سکتی ہے، بھائی۔ اچھا تم کو گلی ڈنڈا پسند ہے؟''

''ہاں، گلی ڈنڈا۔''

''ہاں، گلی ڈنڈا۔''

''ہاں ہاں، پسند ہے۔''

''اچھا تمہارے لئے ایک گلی بنا دوں؟ خوب ہاتھ صاف کرنا اس پر۔''

''ہاں، یہ بات ٹھیک ہے۔''

''چلو تو ہو جائے گلی ڈنڈا ذرا۔''

وہ دھواں نکلتا ہوا پیالہ ہاتھ میں لئے میرے قریب آئے۔

''میں گلی کو چکنا کروں گا تمہارے لئے۔ مگر تم وعدہ کرو کہ اب یہاں پھر نہیں آؤ گے'' انہوں نے ایک آنکھ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے اس بات سے بہت کوفت ہوئی۔ جل کے اور تن کے بولا:

''میں گلی کو چکنا کروں گا تمہارے لئے۔ مگر تم وعدہ کرو کہ اب یہاں پھر نہیں آؤ گے'' انہوں نے ایک آنکھ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے اس بات سے بہت کوفت ہوئی۔ جل کے اور تن کے بولا:

''میں ویسے بھی اب نہیں آؤں گا۔''

اور باغ کی طرف چلا گیا۔ وہاں نانا ابا سیب کی جڑوں میں کھاد ڈال رہے تھے۔ خزاں اپنے پورے جوبن پر تھی اور درختوں کے پتے گر رہے تھے۔

نانا ابا قینچی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے:

''لو۔ رس بھری کی جھاڑیوں تو چھانٹو ذرا۔''

''یہ ''بہت خوب'' کیا بناتے رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''گندگی پھیلاتا رہتا ہے اور کیا'' وہ غصیلی آواز میں بولے۔ ''سارا کمرہ خراب کر دیا ہے۔ فرش تو جلا ہی ڈالا ہے۔ دیوار کے کاغذ پر دھبے ڈال دئے ہیں، ایک جگہ سے نوچ بھی دیا ہے۔ اس کو چلتا کرنا پڑے گا۔''

میں نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے'' اور پھر رس بھری کی جھاڑیاں چھانٹنے لگا۔

لیکن بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ میں نے یہ کہنے میں جلد بازی سے کام لیا تھا۔

جس شام پانی برستا اور نانا ابا کہیں باہر گئے ہوئے ہوتے تو نانی اماں محفل جماتیں، گھر والے، چپراسی، طرار پیتر وونا اور کبھی کبھی تو وہ رنگین مزاج عورت بھی آ جاتی تھی جو وہیں رہتی تھی۔ ایسے میں ''بہت خوب'' ہمیشہ تندور کے پاس کونے میں بیٹھتے تھے۔ خاموش، بے حس و حرکت۔ گونگے بہرے استیوپا اور تاتاری والٹی میں تاش چلتا۔ والٹی استیوپا کی ناک پر پتے مارتا اور کہتا:

''شیطان کہیں کے۔ پھوس شیطان!''

چچا پیوتر ایک بڑی سی ڈبل روٹی اور ایک مرتبان بھر کے رس بھری کا مربہ لاتے۔ روٹی کی قاشیں تراشتے، اس پر مربہ کی موٹی سی تہ جماتے اور اپنی ہتھیلی پر رکھ رکھ کر مہمانوں کے سامنے پیش کرتے۔

''لیجئے جناب۔ مہربانی کر کے آپ لوگ خود لیتے جایئے صاحب! تکلف نہ کیجئے'' وہ جھک جھک کر کہتے۔ جب بھی کوئی قاش اٹھا لیتا تو وہ اپنی سنولائی ہوئی ہتھیلی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اور مربہ کا جو بھی ایک آدھ قطرہ لگا ہوتا اس کو چاٹ لیتے۔

پیتر وونا چیری کی شراب لاتی اور رنگین مزاج عورت میوہ اور مٹھائی مہیا کرتی۔ اور پھر دعوت شروع ہو جاتی۔ یہ نانی اماں کا بڑا ہی محبوب مشغلہ تھا۔

''بہت خوب'' نے مجھے اپنے کمرے سے دور رکھنے کے سلسلے میں جو رشوت دی تھی اس کے کچھ دن بعد نانی اماں نے اس طرح کی پارٹی کی۔ خزاں کی بارش کی مدہم پھوار پڑ رہی تھی، ہوا تیزی سے چل رہی تھی اور درخت آہیں بھر رہے تھے، لگتا تھا کہ وہ گھر کی دیواروں کو ناخنوں سے کھرچ رہے ہیں۔ باورچی خانے میں بڑی آرام دہ گرمی تھی، لوگ ایک دوسرے سے سٹے بیٹھے تھے اور آج غیر معمولی طور پر خاموش اور مودب تھے اور نانی اماں بھی آج اپنی کہانیاں غیر معمولی المناکی اور دلچسپی کے ساتھ بیان کر رہی تھیں۔

وہ تندور پر بیٹھی تھیں، سیڑھی پر پاؤں رکھے، آگے کو لوگوں کی طرف جھکی ہوئی۔ ٹین کے چراغ سے نکلتی ہوئی روشنی سے لوگوں کے چہرے چمک رہے تھے۔ جب کبھی وہ جوش میں ہوتی تھیں تو ہمیشہ تندور پر ایک اونچی جگہ پر بیٹھتی تھیں۔ لوگوں کو سمجھاتے ہوئے وہ کہنے لگیں:

''اونچی جگہ بیٹھ کر اپنی بات سمجھانا زیادہ آسان ہے۔ اس لئے میں یہاں اوپر بیٹھ کر بات کرتی ہوں۔''

میں ان کے بعد والی سیڑھی پر بیٹھا تھا، قریب قریب ''بہت خوب'' کے سر کے اوپر۔ نانی اماں ''ایوان جنگجو اور میرون درویش'' کی دلچسپ کہانی کہہ رہی تھیں۔ خوبصورت کہانی آہنگ اور روانی کے ساتھ جاری تھی:

کسی زمانے میں گوردین نامی ایک سپہ سالار تھا
بے ایمان اس کی روح سیاہ تھی اور اس کا دل تھا چٹان۔
سچ سے اس کو نفرت تھی، برائی سے محبت تھی
اور برائی کی کھوہ میں بل بنانے کی اسے عادت تھی۔
یہ گوردین جس شخص سے سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا
وہ میرون درویش کی شخصیت تھی۔
میرون امن اور عشق کا دلدادہ تھا
حق اور انصاف کا شیدا تھا۔
اب گوردین سپہ سالار نے
اپنے وفادار سپاہی ایوانشکا کو بلایا اور کہا کہ

''جا تو میرون بزرگ کے سامنے
اور اس ضعیف کو ختم کر دے،
اس کے غرور کو بھسم کر دے!
اس کا سر قلم کرنا،
کٹے سر کو داڑھی پکڑ کر اٹھانا اور میرے پاس لانا اور میرے کتوں کی ضیافت کا سامان کرنا!''
چنانچہ ایوان فرمانبرداری سے چلا
اور راستے میں سوچتا رہا
''میں پشیمان ہوں، یہ عمل خود نہیں کر رہا ہوں بلکہ دوسرے کا حکم بجالا رہا ہوں
اور خداوند تعالی کی مرضی پوری کر رہا ہوں۔'' جب درویش کے پاس پہونچا
تلوار کو کوٹ کے اندر چھپایا،
جھک کر درویش کی خدمت میں آداب بجالایا بولا:
''اے درویش بزرگ تیرا حال کیا ہے اور خدا نے اپنی رحمت کا کونسا حصہ تجھ کو بخش دیا ہے؟''
عالم بزرگ درویش میرون مسکرایا اور حکمت کے ساتھ ایوان دلیر کو یوں مخاطب کیا:
''حق سے بڑھ کر کیا ہے، کیوں تو نے دھوکہ کیا ہے جب کہ خداوند یسو مسیح نے تمام باتوں کو دیکھ لیا
ہے اور خیر و شر دونوں کو اپنے قانون میں رکھا ہے اور تیرا بد ارادہ اس پر واضح ہے۔''
ایوانشکا پشیمان ہوا
لیکن گوردین کے انتقام سے ہراسان ہوا،
چمڑے کی نیام سے تلوار کھینچ لی، دلیری سے اپنے دامن سے اس کی دھار صاف کی۔
کہا ''میں تجھے یہ تلوار دکھانا نہ چاہتا تھا۔ مگر اب تو آخر بار درگارہ خداوندی میں دعا مانگ لے، ہر
انسان کے لئے، اپنے لئے اور میرے لئے تا کہ اس کے بعد میں تیرا سر پاک قلم کر سکوں۔''
بزرگ درویش دوزانو ہو گیا۔
اس کے گھٹنوں کے پاس شاہ بلوط کا ایک پودا تھا،
جو بزرگ کے سامنے سر جھکا رہا تھا۔

اور بزرگ درویش مسکراتا تھا

اور آہستگی سے کلام کرتا تھا:

''اے ایوان ذرا اپنے دل میں تو سوچ

کہ تجھے کب تک میرا انتظار کرنا پڑے گا۔ انسان کی روح کے لئے جو دعائیں کی جاتی ہیں وہ بڑی طویل ہیں،

اچھا ہوتا کہ تو میری زندگی پہلے ہی ختم کر دیتا اور خاتمہ کر کے اپنی راہ جلد لیتا۔''

یہاں پر ایوان کی پیشانی پر بل پڑ گیا

اور غرور و تمکنت سے بولا:

''جیسا کہا گیا ہے ویسا ہی کیا جائے گا، تو دعا مانگ، چاہے مجھ کو ایک عمر کیوں نہ انتظار کرنا پڑے۔''

پھر درویش رات آنے تک دعا مانگتا رہا،

رات سے لے کر پو پھٹنے تک دعا مانگتا رہا، نور کے تڑکے سے لے کر اندھیرا پھیلنے تک دعا مانگتا رہا، موسم گرما سے لے کر خزاں کے آنے تک دعا مانگتا رہا۔

ایک سال کے بعد دوسرا، اس کے بعد دوسرا اور اس کے بعد دوسرا سال آتا رہا، اور بزرگ درویش دعا مانگتا رہا۔

شاہ بلوط پودے سے پیڑ بن کر آسمان سے بات کرنے لگا اور اس کے بھی بیج جھڑ جھڑ کر اور درخت اگ آئے، درویش کے چاروں طرف جنگل کھڑا ہو گیا۔ پھر بھی اس کی دعائیں عرش کی طرف پرواز کرتی رہیں۔

اور آج تک دور جنگل میں وہ درویش بزرگ ان تھک دعائیں کر رہا ہے

انسانوں کے لئے خدا کی رحمتیں اور کریمی طلب کر رہا ہے، پاک بی بی مریم سے انسانوں کو مسکراہٹ بخش دینے کی درخواست کر رہا ہے۔ اور اس کے نزدیک ایوان جنگ جو پڑا ہے تلوار اور نیام خاک اور زنگ سے آلودہ ہے، زرہ بکتر اور خود کو زنگ کھا گیا ہے، کپڑے گل چکے ہیں

گرمی سے جھلس چکا ہے، کیڑے لگ گئے ہیں۔

بھیڑیوں کو اس کے بھیانک وجود سے نفرت ہے،

ریچھوں کو اس کے وجود سے حقارت ہے،
طوفان اس کے پاس سے نہیں گذرتے،
برف اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکتا ہے، نہ ہاتھ اٹھا سکتا ہے، نہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اور یہی اس انسان کی سزا ہے جس نے کان برائی کی رغبت پر دھرا ہو،
جس نے دوسروں کے کہنے پر اپنے ضمیر کو بیچا ہو۔
اور بزرگ درویش کی دعائیں
ہم گنہ گار انسانوں کے حق میں
آج بھی عرش تک پہونچتی ہیں،
آج بھی اس طرح پرواز کرتی ہیں
جیسے چشمہ کی دھاریں آخر کار سمندر میں جا کر گرتی ہیں۔

میں غور کر رہا تھا کہ داستان کے شروع ہوتے ہی ''بہت خوب'' نہ جانے کس وجہ سے بہت پریشان سے تھے، کبھی عینک اتارتے، کبھی لگاتے، کبھی مثنوی کے اشعار کے ترنم پر عینک گھمانے لگتے، سر ہلاتے، آنکھوں پر انگلیاں رکھتے اور پیشانی اور گالوں پر سے پسینہ پونچھتے۔ اگر کوئی ذرا سا ہلتا یا کھانستا یا فرش پر جوتے رگڑتا تو وہ آہستہ سے مگر بے تابی سے کہتے:

''ش ش ش!''

جب نانی اماں ختم کر چکیں تو وہ دونوں ہاتھ پھیلا کے بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور گول گول گھومتے ہوئے خود ہی خود بدبدانے لگے:

''واہ وا! بہت ہی عمدہ! ارے اس کو تو لکھ لینا چاہئے۔ کسی طرح بھی لکھ لینا چاہئے! کس قدر سچ ہے، کس قدر حقیقت!''

اور اب مجھے یہ بھی صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور بہہ بہہ کر ان کے گالوں پر سے ڈھلک رہے تھے۔ یہ بڑی ہی عجیب بات تھی، بڑا اثر ہوا دل پر۔ وہ باورچی خانے میں پھدک رہے تھے اور بار بار عینک لگانے کی کوشش کر رہے تھے جس کی کمانی ان کے کانوں پر بیٹھ ہی نہیں رہی تھی۔ چچا پیوتر ہنسنے لگے۔ لیکن باقی سب لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جائے اس لئے بے تکی

خاموشی رہی۔ نانی اماں جلدی سے بولیں:

''ہاں ہاں۔ تو پھر لکھونا، اس میں کیا کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے۔ میں ایسے بہت سے قصے جانتی ہوں۔''

''نہیں نہیں۔ بس یہ والی! اس میں کیسی روسی روح ہے'' وہ بڑے جوش میں زور سے بولے۔ یکا یک وہ بیچوں بیچ کمرے میں کھڑے ہو گئے اور داہنا ہاتھ ہلا ہلا کر زوروں سے بات کرنے لگے، بایاں ہاتھ کانپ رہا تھا اور اسی میں انہوں نے عینک پکڑ رکھی تھی۔ وہ بڑے جوش سے بڑی دیر تک بولتے رہے۔ لفظوں پر زور دینے کے لئے وہ بار بار آواز بلند کرتے اور پیر پٹکتے۔

''آہ! اپنے ضمیر کو کسی اور کے حوالہ کر دینا کس قدر غلط ہے، کس قدر غلط!'' وہ بار بار کہتے۔

پھر یکا یک وہ چپ ہو گئے۔ انہوں نے سب پر نظر ڈالی اور چپ چاپ، سر جھائے مجرم کی طرح نکل گئے۔ لوگ بے تکے پن سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ہنسے۔ نانی تندور پر دور ہٹ گئیں جدھر سایہ گہرا تھا اور زور زور سے ٹھنڈی سانس لینے لگیں۔

پیتر وونا نے اپنے موٹے موٹے سرخ لبوں پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا:

''یہ اس کو ہو کیا گیا ہے؟''

''کچھ بھی تو نہیں'' چچا پیوتر نے جواب دیا۔ ''یہ تو یہی کیا کرتا ہے۔''

نانی اماں تندور سے اتر پڑیں اور سماوار گرم کرنے لگیں۔

''یہ سفید پوش لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سودائی!'' چچا پیوتر نے بڑے اطمینان سے اپنی رائے دی۔ والٹی نے لقمہ دیا:

''کنوارے رہنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔''

سب ہنسنے لگے۔ چچا پیوتر بولے:

''دیکھو ذرا رو رہا ہے۔ اب کسی کی عادت دال کھانے کی ہو تو پلاؤ کب ہضم ہو۔''

باورچی خانے کے ماحول پر اداسی چھا گئی۔ میرے دل میں بھی غم کی چبھن سی ہونے لگی۔ ''بہت خوب'' کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا تھا اور مجھے ان پر ترس بھی آیا تھا۔ ان کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں مجھے بھولتی نہیں تھیں۔

پھر وہ رات بھر گھر سے غائب رہے اور دوسرے دن بھی کھانے کے وقت کے بعد آئے۔ ان پر

گھبراہٹ طاری تھی اور کچھ عجب ملی دلی سی حالت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اب تمام باتوں سے توبہ کر آئے ہیں۔ وہ نانی اماں سے اس طرح مخاطب ہوئے جیسے کوئی چھوٹا سا قصوروار بچہ ہو:

''کیا آپ خفا ہیں؟''

''میں کیوں خفا ہوتی۔''

''وہ میں نے کل جو بکواس کی تھی؟''

''تو تم نے کسی کا کچھ بگاڑا تو نہیں۔''

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے نانی اماں ان سے کچھ ڈرتی ہیں۔ انہوں نے ان سے آنکھیں بھی چار نہیں کیں اور اتنی مدہم آواز میں بول رہی تھیں جو بالکل ہی غیر فطری لگ رہی تھی۔

پھر وہ رات بھر گھر سے غائب رہے اور دوسرے دن بھی کھانے کے وقت کے بعد آئے۔ ان پر گھبراہٹ طاری تھی اور کچھ عجب ملی دلی سی حالت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اب تمام باتوں سے توبہ کر آئے ہیں۔ وہ نانی اماں سے اس طرح مخاطب ہوئے جیسے کوئی چھوٹا سا قصوروار بچہ ہو:

''کیا آپ خفا ہیں؟''

''میں کیوں خفا ہوتی۔''

''وہ میں نے کل جو بکواسکی تھی؟''

''تو تم نے کسی کا کچھ بگاڑا تو نہیں۔''

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے نانی اماں ان سے کچھ ڈرتی ہیں۔ انہوں نے ان سے آنکھیں بھی چار نہیں کیں اور اتنی مدہم آواز میں بول رہی تھیں جو بالکل ہی غیر فطری لگ رہی تھی۔

''بہت خوب'' نانی اماں کے پاس بالکل پہونچ گئے اور بڑی سادگی سے بولے:

''دیکھئے، بات یہ ہے کہ میں بالکل تنہا ہوں، دنیا میں میرا کوئی نہیں! اور جب انسان مدتوں تک کسی سے بات ہی نہ کرے تو پھر ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب اس کی روح ساری زنجیریں توڑ کر آزاد ہو جاتی ہے۔ پھر تو وہ چٹانوں اور درختوں سے بھی باتیں کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔''

نانی اماں ان سے ذرا الگ کھسکتی ہوئی بولیں:

''تم شادی کیوں نہیں کر لیتے ہو؟''

''آہ!'' وہ ہاتھ سے منع کرتے ہوئے زور سے بولے اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے باہر چلے گئے۔

نانی اماں ان کو باہر جاتے دیکھتی رہیں، پھر ایک چٹکی نسوار لی اور مڑ کر مجھ سے بولیں:

''دیکھ! تو اس کے آس پاس مت پھٹکیو۔ نہ جانے کس طرح کا آدمی ہے۔''

لیکن جب انہوں کہا ''میں بالکل تنہا ہوں'' تو مجھے پھر ان میں کشش محسوس ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ کس طرح بدل گیا ہے اور اس بات نے میرے ذہن پر اثر کیا۔ ان کی بات میرے دل کو لگ رہی تھی اور میں ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

پہلے ان کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔ کمرہ خالی تھا اور عجیب وغریب چیزیں بکھریں پڑی تھیں۔ چیزیں جو اپنے مالک کی طرح ہی عجیب اور بے کار سی لگتی تھیں۔ میں باغ میں گیا۔ تلاش کرتے کرتے وہ مجھے گڑھے میں ملے۔ ایک جلی ہوئی شہتیر پر بے ڈھنگے پن سے بیٹھے تھے، گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے، دونوں ہاتھ گردن کی پیچھے کر کے باندھے ہوئے۔ شہتیر تمام خاک آلود تھی اور اس کی ایک نوک گھاس پھوس، کانٹوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ یقیناً وہاں بیٹھنے سے ان کو تکلیف ہو رہی تھی اور اس بات سے میں اور بھی ان کی طرف کھنچ گیا۔

کچھ دیر تو وہ الو جیسی اندھی آنکھوں سے خلا میں گھورتے رہے جیسے مجھے انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔ پھر ایک دم سے ذرا خفگی کے انداز میں بولے:

''مجھے بلانے آئے ہو؟''

''نہیں۔''

''نہیں۔''

''تو پھر کیا ہے؟''

''کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔''

انہوں نے اپنی عینک اتاری اور اسے ایک رومال سے جس پر سرخ اور سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے، پونچھتے ہوئے بولے:

''اچھا تو پھر آؤ، اتر آؤ!''

جب میں ان کے برابر میں جا کر بیٹھ گیا تو انہوں نے مجھے کھینچ کر گلے لگا لیا۔

''آؤ بیٹھو۔ بس ہم لوگ بیٹھیں گے۔ کہیں گے کچھ نہیں۔ ٹھیک ہے؟ اس طرح۔ تم ہو بڑے ضدی لڑکے؟''

''بہت خوب!''

ہم لوگ بغیر بات چیت کئے بیٹھے رہے۔ وہ شام بڑی خاموش اور لجیلی تھی۔ آغاز خزاں کی اداس شام جب پھول آنکھوں کے سامنے مرجھاتے نظر آتے ہیں، جب زمین سے گرمی کی نرم خوشبوئیں اٹھ جاتی ہیں اور صرف سیلن کی نمناک اور ٹھنڈی مہک رہ جاتی ہے۔ ہوا عجیب طرح شفاف ہو جاتی ہے، کوے آسمان کی شفق میں ڈوبتے جاتے ہیں اور اداس خیالات کے بادل ذہن میں امڈنے لگتے ہیں۔ ہر چیز پر ایک سناٹا اور بے زبانی کا عالم طاری تھا۔ مدہم سے مدہم آواز۔ پرندے کے پروں کی سرسراہٹ، کسی پتے کے ٹوٹ کے گرنے کی آہٹ سے بھی وہ گونج ہوتی تھی کہ انسان چونک پڑے اور چاروں طرف طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر سناٹے میں ڈوب جائے جیسے سناٹے نے پوری دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔

ایسے ہی لمحات میں وہ خیالات پیدا ہوتے ہیں جو پاکیزہ تو ہوتے ہیں مگر اتنے نازک، ایسے شفاف جیسے مکڑی کا جالا، جنہیں الفاظ کے تاروں میں باندھا نہیں جا سکتا، جو شہاب ثاقب کی طرح چمک اٹھتے ہیں اور پھر ڈوب جاتے ہیں، جو کسی روح میں غم کے بیج بوتے ہیں، کبھی اس کو گلے لگا کر تسکین دیتے ہیں اور کبھی اس کو چھیڑ دیتے ہیں جس سے روح ابل ابل کر صاف ہوتی جاتی ہے اور مستقل پیچ وخم اختیار کرتی ہے۔ ایسے ہی لمحات میں کردار ڈھلتے ہیں۔

اپنے ساتھی کے گرم جسم سے لپٹا ہوا میں بھی اس کے ساتھ سیب کی ٹہنیوں کی سیاہ جالیوں کے پار جھانکتا اور دیکھتا رہا کہ سرخ سرخ آسمان کے پس منظر میں فاختائیں ہوا میں تیر رہی ہیں، ہدہد گاجروں کے ٹھونٹوں میں چونچ مار رہے ہیں، بھورے بھورے بادلوں کے چیتھڑے اور ان کے زرد زرد گالے کھیتوں کے اس پار سے اس پار گذر رہے ہیں اور ان کے نیچے سے کوؤں کی قطاریں اپنے گھونسلوں کی سمت بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ تمام سماں خوب تھا۔ ذہن پر حد درجہ چھا جانے والا۔

کبھی کبھی میرا ساتھی ایک آہ بھرتا اور کہتا:

''کیوں بھائی ہے نا شاندار؟ سردی تو نہیں لگ رہی ہے؟ ایں؟''

جب آسمان سیاہی چھا گئی اور تمام چیزیں رات میں گھل مل گئیں تو انہوں نے کہا:

''ہم سمجھتے ہیں اتنا کافی ہے۔ ہے نا؟ آؤ چلیں۔''

جب ہم لوگ باغ کے پھاٹک پر پہنچے تو وہ رک گئے۔

''یہ جو تمہاری نانی ہیں نا بڑی عجیب وغریب عورت ہیں'' انہوں نے کہا۔ ''آہ، کیا دنیا ہے!''

پھر وہ آنکھیں بند کر کے مسکرانے لگے اور بہت آہستہ سے مگر بہت صاف آواز میں بولے:

اور یہی اس انسان کی سزا ہر جس نے کان برائی کی رغبت پر دھرا ہو،

جس نے دوسروں کے کہنے پر اپنے ضمیر کو بیچا ہو۔

''یہ یاد رکھو بھائی ضرور!''

پھر مجھے آگے کو دھکیلتے ہوئے پوچھا:

''تم کو لکھنا آتا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو سیکھو۔ اور جب سیکھ جاؤ تو جو کچھ تمہاری نانی سناتی ہیں نا لکھ لینا۔ یہ سب بہت ضروری ہے۔''

اس کے بعد میں اور وہ پکے دوست بن گئے۔ اور اس کے بعد جب میرا جی چاہتا تو ''بہت خوب'' کے یہاں پہنچ جاتا۔ چیتھڑوں سے بھرے ہوئے ایک بکس پر بیٹھ جاتا اور ان کو بے روک ٹوک کے دیکھتا رہتا۔ وہ یا تو سیسے کا برادہ پگھاتے رہتے یا تانبہ گرم کرتے رہتے۔ جب وہ خوب دھک جاتا تو ایک نہائی پر رکھ کر چھوٹی چھوٹی پلیٹیں بناتے۔ پھر وہ ایک ریتی اور ریگ مال اور طرح طرح کی ریتیوں سے خوب گھسائی کرتے۔ ان میں سے ایک ریتی ایسی باریک تھی جیسے بال۔ وہ تمام چیزیں ننھی ننھی ترازوؤں میں تولتے۔ سفید پیالوں میں عرقوں کو ملاتے اور کمرہ بدبودار دھویں سے بھر جاتا۔ پھر ایک بڑی سی کتاب میں کچھ ادھر ادھر دیکھتے، کچھ بدبداتے اور اپنے سرخ ہونٹ کاٹتے یا آہستہ سے گاتے:

آہ اے گل شاراں

''یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟''

''ایک چیز۔''

کیسی چیز؟''

''اب دیکھو بھئی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کسی طرح تم کو سمجھاؤں جو تمہاری سمجھ میں ٹھیک سے آ جائے۔''

''نانا ابا کہتے ہیں کہ آپ شاید جعلی روپیہ بناتے ہیں....''

نانا ابا؟ ہوں! یہ سب یوں ہی ہے۔ روپیہ بھی کوئی ایسی چیز ہے بھائی کہ جس کی خاطر تکلیف اٹھائی جائے!''

''مگر آپ یہ بتائیے کیا روپیہ کے بغیر آپ روٹی خرید سکتے ہیں؟''

''ہاں روٹی تو اس کے بغیر نہیں خریدی جا سکتی۔''

''اور نہ گوشت...''

''ہاں گوشت بھی نہیں۔''

وہ چپکے چپکے ہنسنے لگے جو مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور اس طرح میرے کان اینٹھے جیسے میں کوئی پلہ ہوں۔

''بھئی تم سے ہم نہیں جیت سکتے۔ تم تو بس بولتی بند کر دیتے ہو ہمیشہ۔ رہنے دو، اب بات ہی نہیں کرتے...''

کبھی کبھی وہ کام روک دیتے اور میرے قریب آ کر کھڑکی کے نزدیک بیٹھ جاتے جہاں ہم دونوں دیکھتے رہتے کہ سیب کے درختوں سے پتے گر رہے ہیں یا گھاس سے بھرے ہوئے احاطے میں پھوار پڑ رہی ہے۔ ''بہت خوب'' باتیں کم کرتے تھے لیکن جو بات کہتے تھے وہ پتے کی۔ کبھی کبھی وہ مجھے کسی خاص چیز کی طرف آنکھ مار کر ایک نظر ڈال کر اشارہ کر دیتے۔

مثلاً مجھ کو اپنے احاطے میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی لیکن ان کے اس طرح کے متعدد اشاروں سے اور کبھی کبھی کہے ہوئے الفاظ سے یہ ہوا کہ اب میں جس چیز کو بھی دیکھتا اس کے خاص خاص پہلو میرے لئے اہمیت اختیار کر کے ذہن پر نقش ہو جاتے۔ ایک مرتبہ ایک بلی احاطے کے اس پار سے اس پار دوڑ رہی تھی۔ رستے میں پانی کا چہلا تھا۔ وہ رکی اور اس میں اپنی پرچھائیں دیکھ کر اس پر حملہ کرنے کے لئے پنجہ اٹھایا۔ ''بہت خوب'' آہستہ سے بولے:

''افوہ۔ بلیاں بھی کس قدر مغرور اور خودسر ہوتی ہیں۔''

سنہری مائل سرخ رنگ کا مرغا ممائی ایک بار اڑا اور جنگلہ پر جا بیٹھا اور پر پھڑ پھڑائے، گرتے گرتے بچا، جھنجھلایا اور آگے کو گردن بڑھا کر زور سے ککڑوں کوں ککڑوں کوں کرنے لگا۔

''دیکھو اپنے کو اہم سمجھ رہا ہے، جنرل ٹھیرانا۔ مگر کچھ زیادہ عقل نہیں پائی ہے بیچارے نے۔''

والٹی کیچڑ میں چل رہے تھے، گڑبڑا گڑبڑا کر کچھ عجیب طرح گھوڑوں کی طرح بھاری قدم اٹھا رہے تھے۔ بار بار اپنا چوڑا پھولا ہوا منہ اٹھا اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے اور آنکھیں میچ لیتے، خزاں کے سورج کی ایک کرن ٹھیک ان کے سینے پر پڑ کر جیکٹ میں لگے ہوئے پیتل کے بٹن کو چمکا رہی تھی۔ تاتاری رکا اور بٹن کو اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں سے چونے لگا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی سینے پر تمغہ لگائے چلے آ رہے ہیں۔''

مجھے جلدی ہی یہ احساس ہو گیا کہ ''بہت خوب'' سے مجھے بہت محبت ہو گئی ہے۔ اب وہ میرے تمام غموں اور خوشیوں کا ایک ضروری عنصر بن گئے تھے۔ وہ خود تو فطرتاً خاموش تھے لیکن جو کچھ میرے جی میں ہوتی وہ مجھے کہنے سے کبھی نہ روکتے۔ اس کے برخلاف نانا ابا میری بات کاٹ دیا کرتے تھے:

''بس، بند کرا اپنی ٹرٹر! دماغ میں ہوا ہی بھر گئی ہے۔''

نانی اماں اپنی فکروں میں خود ہی ایسی گھری رہتی تھیں کہ وہ دوسروں کی بات کیا سنتیں، کیا سمجھتیں۔ لیکن ''بہت خوب'' ہمیشہ میری بات غور سے سنتے اور اکثر مسکرا کر کہتے:

''یہ تو سچ نہیں بھئی۔ یہ تو تم نے گڑھا ہے۔''

ان کے چھوٹے چھوٹے فقرے بہت ہی فی البدیہہ اور برمحل ہوتے تھے جیسے ان کو معلوم ہو کہ میرے دل و دماغ پر کیا گذر رہی ہے۔ الفاظ لبوں پر آتے بھی نہ تھے کہ ان کو صحیح اور غلط کا پتہ چل جاتا تھا۔ اور اس بات کو سمجھتے ہی وہ بس چند الفاظ میں خاتمہ کر دیتے تھے، تیز الفاظ جو بڑے پیار سے کہے جاتے تھے:

''بھئی تم جھوٹ بول رہے ہو!''

کبھی کبھی میں ان کی اس ساحرانہ طاقت کو آزمانے کے لئے جھوٹ کہانیاں گڑھتا اور سچ بنا کر بیان کرتا۔ لیکن ایک منٹ سننے کے بعد وہ لامحالہ طور پر ہلاتے اور کہتے:

''بھئی تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''ارے مجھے خوب معلوم ہے۔''

نانی اماں اکثر مجھے سنینا یا چوک لے جایا کرتی تھیں جہاں پانی کا نل تھا۔ وہاں سے وہ پانی لایا کرتی تھیں۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ وہاں شہر کے پانچ آدمی ایک کسان کو پیٹ رہے ہیں۔ انہوں نے اس کو زمین پر گرادیا تھا اور کتوں کی طرح اس سے لپٹے ہوئے تھے۔ نانی اماں نے بہنگی سے بالٹیاں نکال کر الگ کیں اور بہنگی کا ڈنڈا لے کر لپکیں اور مجھ کو انہوں نے آواز دی:

''بھاگ بھاگ!''

اور خود ان شہریوں پر ٹوٹ پڑیں۔ لیکن مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ لہٰذا میں ان کے پیچھے دوڑا اور دشمن پر پتھر برسانے لگا۔ نانی اماں نے بڑی جرأت کے سات بہنگی کے ڈنڈے سے ان کو کو نچنا اور سر اور کندھوں پر مارنا شروع کیا۔ اور لوگ بھی لڑائی میں شریک ہو گئے اور شہریوں کو مار کے بھگا دیا گیا۔ آج تک اور منظر کو یاد کر کے مجھے کپکپی ہونے لگتی ہے کہ کس طرح وہ غریب کسان اپنی گندی انگلیوں سے اپنی پھٹی ہوئی ناک دبائے تھا اور کھانستا روتا جا رہا تھا اور خون اس کی آنگلیوں پر سے بہہ بہہ کر میری نانی کے چہرے اور سینے پر لگ گیا تھا۔ وہ خود بھی زور زور سے چیخ اور کانپ رہی تھیں۔

جب ہم لوگ گھر پہونچے تو میں دوڑ کر ''بہت خوب'' کے پاس پہونچا اور ان کو سب حال بتانے لگا۔ انہوں نے اپنا کام روک دیا اور ہاتھ میں ایک ریتی تلوار کی طرح تولے ہوئے کھڑے رہے۔ عینک کے نیچے سے وہ بڑے غور اور سختی کے ساتھ مجھے تکتے رہے، پھر ایک دم سے غیر معمولی جوش کے ساتھ بولے:

''کمال ہے! ایسا ہی ہوا تھا، بہت اچھے، بہت اچھے!''

میں اس واقعہ سے اور جو کچھ میں نے دیکھا تھا اس سے اتنا زیادہ متاثر تھا کہ میں نے غور ہی نہیں کیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن اپنی کہانی جاری رکھی۔ انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ادھر ادھر ٹہلنے لگے:

''بس اتنا کافی ہے، کافی ہے! تم کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے!

میں بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ شروع میں تو مجھے ان کے اس طرح روک دینے سے کوفت ہوتی

لیکن جب میں نے معاملہ پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہونچ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے مجھے اس وقت روکا جبکہ میں درحقیقت سب کچھ کہہ چکا تھا۔

''ایسی باتیں سوچ سوچ کر اپنے دماغ کو پریشان نہ کیا کرو'' وہ بولے۔''ایسی باتیں یاد نہیں رکھتے، بھول جانے کی کوشش کرو!''

بعض وقت وہ غیر متوقع طور پر ایسی باتیں کہہ دیتے تھے جو مجھے زندگی بھر یاد رہیں۔ نروایا کوچہ کا ایک لڑکا تھا۔ کلیوشنیکوف جوان لڑکوں میں تھا جن سے میری مستقل جنگ چھڑی رہتی تھی۔ وہ بھاری بھرکم تھا اور سر بڑا۔ میں اور وہ ایک دوسرے کے مدمقابل تھے، نہ مجھ سے وہ جیت سکتا تھا نہ میں اس سے۔

''بہت خوب'' کو جب میں نے اپنی اس مشکل سے آگاہ کیا تو انہوں نے غور سے سن کر جواب دیا:

''انہہ بیکار! ایسی وقت کس کام کی! یہ بھی کوئی طاقت ہے! اصلی مضبوطی تو یہ ہے کہ پھرتی ہو۔ جتنی پھرتی ہوگی اتنا ہی انسان مضبوط ہے۔ سمجھو؟''

چنانچہ اگلے اتوار کو میں نے اپنی مکابازی میں زیادہ پھرتی استعمال کی اور کلیوشنیکوف کو خوب چاٹ دی۔ اس بات سے میرے دل میں ''بہت خوب'' کی رائے کی عظمت اور بھی بڑھ گئی۔

''ہر چیز کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔ سمجھے؟ یہ بہت مشکل کام ہے۔ کچھ حاصل کرنا۔ ہے کام مشکل!''

ان کی اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں مجھے یاد رہتی تھیں اگرچہ اس وقت میں ان کا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھتا تھا۔ غالباً وہ باتیں مجھے اس لئے یاد رہ جاتی تھیں کہ ان میں ایک عجیب قسم کی پریشان کن سی پراسراریت ہوتی تھی اور ساتھ ہی سادگی بھی۔ پتھر اٹھانے میں، یا روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں لینے میں، یا کوئی پیالہ یا ہتھوڑی سنبھالنے میں آخر ایسی بات ہی کیا تھی۔

ہمارے گھر کے لوگوں کو رفتہ رفتہ ''بہت خوب'' سے اور زیادہ نفرت ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ان رنگین مزاج خاتون کی پالتو بلی جو ہر ایک کے پاس چلی جاتی تھی ''بہت خوب'' کے گھٹنوں پر بیٹھنے سے انکار کر دیتی تھی۔ وہ اس کو پیار سے بلاتے لیکن وہ کبھی نہ جاتی۔ میں نے اس بات کے لئے اس کو مارا بھی اور اس کے کان بھی کھینچے یہاں تک کہ ان سے خوف نہ کھانے کے لئے اس کو بہلانے میں کھسیا کھسیا کے رو تک پڑا لیکن وہ راہ پر نہ آئی۔

''میرے کپڑوں سے تیزاب کی بو آتی ہے اس لئے یہ میرے پاس نہیں آتی'' وہ بولے۔لیکن مجھے معلوم تھا کہ گھر کے سب لوگوں کا، نانی اماں سمیت، کچھ اور ہی رویہ تھا۔ وہ سب کے سب ''بہت خوب'' کے خلاف تھے اور مجھے یہ بات بہت ہی غلط اور تکلیف دہ محسوس ہوتی تھی۔

نانی اماں غصے میں بھر کر پوچھتیں:

''تو اس کے آس پاس کیوں منڈلایا کرتا ہے اے؟ ذرا ہوشیار رہنا۔ ورنہ تجھے بھی مداری پنا سکھا دے گا۔''

سرخ بالوں والے نانا ابا کو تو جب کبھی پتہ چلتا کہ میں ''بہت خوب'' کے یہاں گیا ہوں تو مجھے بڑی بے دردی کے ساتھ بیدوں سے مارتے۔ظاہر ہے کہ میں نے ''بہت خوب'' کو تو نہیں بتایا کہ مجھے ان سے ملنے کو منع کیا جاتا ہے لیکن لوگوں کے جو خیالات ان کے متعلق تھے وہ میں البتہ ان کو بتا دیا کرتا تھا۔

''نانی اماں آپ سے ڈرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ آپ عمل سفلی کرتے ہیں۔ نانا ابا بھی یہی کہتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ آپ خدا سے منحرف ہیں اور لوگوں کا آپ تعلقات رکھنا خطرناک ہے۔''

انہوں نے اپنا سر ہلایا جیسے مکھی اڑا رہے ہوں، پھیکے چہرے پر مسکراہٹ سے سرخی آ گئی جس کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا، سر چکرانے لگا۔

''میں یہ سب کچھ سمجھتا ہوں بھئی۔ بڑی بری بات ہے۔ ہے نا؟'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں ہاں۔''

''بہت بری بات ہے۔''

آخر کار لوگ ان کا نکال کر ہی رہے۔

ایک دن صبح ناشتے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ سامان باندھ رہے ہیں۔ وہ زمین پر بیٹھے تھے اور اپنی چیزیں ایک بکس میں رکھتے ہوئے گنگناتے جا رہے تھے ''آہ اے گل شاراں''۔

''اچھا بھئی، الوادع۔ ہم تو جا رہے ہیں۔''

''کیوں؟''

جواب دینے سے پہلے انہوں نے ایک منٹ مجھے غور سے دیکھا۔

''کیوں؟''

جواب دینے سے پہلے انہوں نے ایک منٹ مجھے غور سے دیکھا۔

''کیا تمہیں نہیں معلوم؟ یہ کمرہ تمہاری ماں کے لئے درکار ہے۔''

''کون کہتا ہے؟''

''تمہارے نانا ابا۔''

''وہ جھوٹ بولتے ہیں۔''

''بہت خوب'' نے مجھے گلے لگا لیا اور جب میں ان کے نزدیک فرش پر بیٹھ گیا تو آہستہ سے بولے:

''خفا نہ ہونا۔ میں سمجھا کہ تم کو سب کچھ معلوم ہے اور تم نے مجھ سے کہا ہی نہیں۔ بھائی، میں نے سوچا، یہ بات ٹھیک نہیں...''

میرے دل پر سخت چوٹ لگی۔

پھر وہ مسکرا کے بہت ہی مدہم آواز میں بولے:

''سنو۔ تم کو یاد ہے نا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے نہ ملا کرو؟''

میں نے اقرار کرتے ہوئے سر ہلایا۔

''تم کو اس وقت میری بات سے تکلیف پہونچی تھی؟ ہے نا؟''

''ہاں۔''

میرا یہ منشا ہرگز نہ تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ اگر تم مجھ سے دوستی کرو گے تو تم پر سختی کی جائے گی۔''

وہ اس طرح بات کر رہے تھے جیسے میرے ہم عمر ہوں اور مجھے ان کے الفاظ نے بڑی مسرت بخشی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جو بات وہ مجھ سے کہہ رہے تھے وہ مجھے بہت پہلے سے معلوم تھی۔

''یہ تو مجھے بہت پہلے سے معلوم تھا!'' میں نے کہا۔

''بھئی واہ، خوب۔ تو دیکھ لو بھائی، یہ معاملہ ہے۔ ہوں!''

میرے دل میں ناقابل برداشت درد اٹھ رہا تھا۔

''لیکن لوگ آپ کو کیوں پسند نہیں کرتے؟''

انہوں نے مجھے بھینچ کر گلے لگا لیا اور زور زور سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولے:

''کیونکہ میں ان کی طرح جو نہیں ہوں۔ سمجھے؟ ساری بات یہی ہے۔ میں ان کی طرح نہیں

ہوں۔''

''دیکھو غصہ نہ کرنا'' وہ آہستہ سے بولے۔ پھر میرے کان میں دھیمے سے کہنے لگے ''اور آنسو بھی نہ بہانا۔''

لیکن خود ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جو عینک کے دھندلاتے ہوئے شیشوں سے گذر کر گالوں پر ڈھلک رہے تھے۔

اس کے بعد ہم دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ ہاں کبھی کبھار ہمارے منہ سے ایک آدھ بات نکل جاتی۔

اس شام سب سے بڑی محبت سے رخصت ہو کر اور مجھے خوب گلے لگا کر وہ چلے گئے۔ میں پھاٹک سے باہر نکلا۔ جیسے ہی گھوڑا گاڑی کے پہیے برف کی نالیوں پر آ کر ٹکے وہ پھرتی سے اس پر چڑھ گئے۔ ان کے جانے کے ساتھ ہی نانی اماں نے گندے کمرے کو صاف کرنا شروع کر دیا اور میں جان بوجھ کر ایک کونے سے دوسرے کونے میں بھاگتا پھرنے لگا کہ ان کی صفائی میں اڑچن لگاؤں۔ وہ ایک بار مجھ سے ٹکرائیں:

''ارے ہٹ!''

''آپ لوگوں نے ان کو کیوں نکال دیا؟''

''تجھ سے ان باتوں سے واسطہ؟''

''تم سب احمق ہو۔ سب! آوے کا آوا'' میں نے کہا۔ وہ ایک بھیگے چیتھڑے سے مجھ کو بھگانے بھگانے لگیں:

''ارے تو کیا تو بالکل ہی پاگل ہو گیا ہے! ہیں کیوں؟''

''تمہارے سوا سب پاگل ہیں'' میں نے کہا۔ لیکن وہ اس بات سے خوش نہیں ہوئیں۔

کھانے کی میز پر نانا ابا پھر بولے:

''افوہ۔ چلو اچھا ہوا جو وہ چلو گیا! میں تو جب اس کو دیکھتا تھا تو کلیجے میں چھری سی لگتی تھی، کسی نہ کسی طرح تو نکالنا ہی تھا اسے!''

مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے ایک چمچہ توڑ ڈالا اور پھر اس بات پر میری خوب مرمت ہوئی۔

اس طرح میری وہ دوستی ختم ہوئی جوان بے شمار انسانوں میں سے ایک سے تھی جو اپنے وطن میں اجنبی ہیں، وہ انسان جو مادر وطن کے بہترین فرزند ہیں۔

9

اگر میں اپنے بچپن کو تشبیہ دینا چاہوں تو شہد کے چھتے سے تشبیہ دینا چاہئے جس میں بہت سے عام اور معمولی انسانوں نے اپنے معلومات اور تجربات کا شہد نچوڑا اور ہر ایک نے میرے کردار کے ارتقا اور نشوونما کے سرمایہ میں اضافہ کیا۔ اکثر یہ شہد بھی ہوتا تھا اور تلخ بھی لیکن چونکہ وہ معلومات کا ہی حصہ ہوتا تھا اس لئے ہوتا تھا شہد ہی۔

''بہت خوب'' کے چلے جانے کے بعد میں نے چچا پیوتر سے دوستی کی پینگیں بڑھانی شروع کیں۔ وہ نانا ابا کی طرح سوکھے ہوئے تھے اور ان ہی کی طرح صاف ستھرے رہتے تھے۔ نانا سے بھی ٹھگنے قد کے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی لڑکے نے مذاقاً بڑے بوڑھوں جیسا لباس پہن رکھا ہے۔ ان کا چہرہ چمڑے کے باریک تاروں سے بنے ہوئے پنجرے کی طرح لگتا تھا جس میں سے جھانکت ہوئی ان کی جھلملاتی ہوئی آنکھیں دو ننھی ننھی چہچہاتی ہوئی چڑیوں کی طرح لگتی تھیں۔ ان کے سفید بال گھونگریالے تھے، داڑھی چھلے دار تھی۔ وہ پائپ پیا کرتے تھے جس میں سے ان کے بالوں کے رنگ کا دھواں نکلا کرتا تھا۔ یہ دھواں پیچ کھاتا ہوا ان کے سر پر صدقے واری ہوا کرتا۔ ان کی باتیں لچھے دار ہوتیں، دھوئیں کی طرح، اور محاوروں سے سجی ہوئی۔ ان کی آواز بھنبھناتی ہوئی تھی جو ویسے تو نرم اور محبت بھری لگتی تھی لیکن مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ لوگوں کا مذاق اڑا رہے ہوں:

''شروع میں میں جن بیگم صاحبہ کے یہاں ملازم تھا ان کا نام تاتیان تھا، باپ کے نام کی وجہ سے الیکسئی ونا تھا۔ وہ کہتیں ''لوھاری کا کام سیکھ لے''۔ لیکن لوہاری بس شروع کی ہی تھی کہ کہنے لگیں ''باغ میں مالی کو کام میں مدد دیا کرو''۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ ایک ٹھکا نہ نہیں تو کچھ نہیں۔ ایک بار وہ کہنے لگیں کہ ''پیوتر تم مچھلی پکڑنا کیوں نہ سیکھ لو''۔ میں نے کہا ''چلو یہی ٹھیک ہے''۔ لیکن بس جیسے ہی مچھلیوں پر ذرا ہاتھ جمنے لگا تو مجھے اٹھا کر شہر پھینک دیا گیا کہ ٹھیلہ چلاؤ۔ تو بھئی ہم اس طرح ٹھیلے والے بن گئے اور اب جو چاہو کہو اور کرواؤ۔ لیکن اس کے بعد مجھے کسی اور کام پر لگانے کا موقع نہیں ملا

کیونکہ زرعی سدھار نے سارا معاملہ ہی الٹ دیا۔ میں آزاد ہو گیا تو انہوں نے بس اٹھا کر گھوڑا ہمارے حوالے کر دیا۔ اور اب تک ہم بیگم صاحبہ کے بجائے گھوڑے کی چاکری کر رہے ہیں۔''

یہ گھوڑا بوڑھا اور سفیدی مائل تھا گویا کسی مصور نے نشہ کے عالم میں پچر نگا برش اس پر جا بجا مار دیا ہو، جیسے کوئی بے ہنگم سا صرف جس کے پاؤں ٹیڑھے ہوں، چمڑا ڈھیلا ڈھالا، پٹھے کھچے ہوئے اسپرنگ کی طرح۔ ان میں گردن جڑی ہوئی اور گردن سے لٹکتا ہوا ہڈیلا سر جس میں دھندلی دھندلی آنکھیں جڑی ہوئی۔ چچا پیوتر اس گھوڑے کے ساتھ نہایت احترام سے پیش آیا کرتے تھے، اس کو کبھی نہیں مارتے تھے اور اس کا نام ''نانیا'' رکھ چھوڑا تھا۔

نانا ابا نے ایک دفعہ ان سے پوچھا بھی کہ گھوڑے کا نام مسیحی کیون رکھا، وہ تو جانور ہے۔ انہوں نے جواب دیا:

''نہیں تو واسیلی واسیلی وچ! ہرگز نہیں۔ تانیا مسیحی ہے ہی نہیں۔ مسیحی نام تو تاتیانا ہے نا!''

چچا پیوتر کو پڑھنا بھی آتا تھا اور انجیل کی ان کو خوب معلومات تھیں۔ میرے نانا اور وہ اکثر خوب خوب بحثا کرتے تھے کہ معصومین میں سب سے زیادہ معصوم کون تھا۔ انجیل میں جن گنہگاروں کا ذکر تھا ان پر بے دردی سے فیصلے صادر کئے جائے۔ خاص طور پر ابسولم پر سب سے زیادہ لعنت بھیجی جاتی۔ کبھی ان دونوں کی بحث میں محض الفاظ اور قواعد کے پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جاتا۔ میرے نانا کہتے ''بدمعاشیت'' ''غیر قانونیت'' ''بہت پرستیت'' اور چچا پیوتر کہتے کہ نہیں ان لفظوں کا اصلی تلفظ ''بدمعاشی'' ''غیر قانونی'' ''بہت پرستی'' ہے۔

''تمہارا قاعدہ تمہارے ساتھ اور میرا قاعدہ میرے ساتھ!'' نانا ابا غصے میں سرخ ہو جاتے، منہ پھول جاتا۔ ''تمہاری ایسی کی تیسی!''

لیکن چچا پیوتر بڑے پرسکون طریقے سے بیٹھے پائپ پیا کرتے اور س کا دھواں ان پر صدقے واری ہوا کرتا۔

''تمہاری ''ت'' ہی کون سی بہتر ہے'' وہ حقارت کے ساتھ کہتے۔ ''خدا کی نظر میں یہ کون بڑھ کر ہے۔ ہوسکتا ہے خدا تمہاری نمازوں کو سن کر کہتا ہو کہ ہاں لمبی چوڑی تو بہت ہیں یہ نمازیں لیکن قیمت میں کوڑی برابر نہیں!''

نانا ابا مجھ پر چلائے ''الیکسئی ،تم بھاگو یہاں سے''۔ان کی سبز آنکھیں چمکنے لگتیں۔

پیوتر کو صفائی ستھرائی اور باقاعدگی بہت پسند تھی۔جب بھی وہ احاطے میں چلتے پھرتے تو رستے میں پڑی ہوئی لکڑیاں یا ہڈیاں پاؤں سے ادھر ادھر سرکا دیتے اور منہ بنا کر بدبداتے جاتے:

''تو یہ کسی کام کا نہیں یہ کوڑا۔جب دیکھو تب پاؤں میں آتا رہتا ہے!''

وہ خوب باتیں کیا کرتے تھے اور دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ بڑے ملنسار اور خوش مزاج ہیں لیکن کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں مردوں کی آنکھوں کی طرح دھندلا پن چھا جاتا۔اور اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کسی تاریک اور اندھیرے کونے میں خاموش اور رنجیدہ بیٹھے دکھائی پڑتے اپنے گونگے بہرے بھتیجے کی طرح۔

''کیا بات ہے چچا پیوتر؟''

''دور ہو'' وہ اکتائی ہوئی سختی کے ساتھ جواب دیتے۔

پھر ہماری گلی میں ایک مکان میں ایک آدمی آ کر ٹھہرا جس کے ماتھے پر گومڑا تھا اور اس کی ایک عجیب وغرب عادت تھی۔اتوار کے دن وہ کھڑکی میں بیٹھ جاتا اور بندوق سے کتوں، بلیوں، مرغیوں اور کوؤں یہاں تک کہ اگر موج آ جاتی تو انسانوں پر بھی چھرے کا نشانہ لگایا کرتا۔ایک دن اس نے ''بہت خوب'' کو نشانہ بنایا۔چھرا ان کے چمڑے کے جیکٹ میں سے تو خیر نہیں پار ہوا لیکن اس کے کچھ ٹکڑے جیب میں رہ گئے۔مجھے یاد ہے کہ انہوں نے جیب میں سے کچھ ٹکڑے نکال کر ہاتھ پر رکھ کر غور سے دیکھا بھی تھا۔نانا ابا نے ان سے کہا کہ پولیس میں اطلاح دیں لیکن انہوں نے وہ ٹکڑے باورچی خانے کے ایک خونے میں پھینک دئے اور بولے:

''چھوڑو بھی۔اب کون اس کے لئے جھنجٹ کرتا پھرے۔''

اگلی بار نشانہ باز نے نانا ابا کی ٹانگ پر چھرا جڑ دیا۔نانا ابا کو بے حد غصہ آیا۔انہوں نے اس جرم کی اطلاح پولیس میں کر دی اور ان گواہوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا جو نشانہ بن چکے تھے۔لیکن وہ حضرت یکا یک غائب ہو گئے۔

جب کبھی بھی اس شخص کی بندوق کی آواز آتی تو چچا پیوتر جلدی سے اپنی پرانی بڑے بڑے کنگورے والی ہیٹ جو وہ اتوار کو پہنا کرتے تھے، پہن لیتے اور پھاٹک سے باہر نکل جاتے۔باہر رستے پر پہونچ کر وہ اپنے کوٹ کے پچھلے حصوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر ان کو دونوں طرف سے مرغے کی دم کی طرح اٹھا لیتے،

تو ند آگے کو نکال لیتے اور بڑی شان سے قدم اٹھاتے اس نشانہ باز کے گھر کے سامنے سے گذرتے۔ ہمارے گھر کے سب لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے پھاٹک پر اکٹھا ہو جاتے۔ کھڑکی سے فوجی کا زرد چہرہ جھانکتا نظر آتا اور اس کے اوپر بیوی کا روشن چہرہ دکھائی دیتا۔ بیٹلنگ کے یہاں سے بھی سب لوگ اپنے احاطے میں اکٹھے ہو جاتے۔ صرف اوفسیا نیکوف کا مکان بے جان کھڑا رہتا۔

بعض مرتبہ چچا پیوتر کے چکر بیکار جاتے۔ ظاہر ہے کہ نشانہ باز ان کو اپنے نشانے کے لائق نہیں سمجھتا، لیکن کبھی کبھی اس کی بندوق کی دھائیں دھائیں سنائی دے جاتی۔

کبھی کبھی چچا پیوتر اسی طرح آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم لوگوں تک آپہونچتے اور بڑے اطمینان سے رپورٹ پیش کرتے:

''بس کوٹ کی نوک میں لگی!''

ایک دن چھرا ان کی گردن اور کندھے میں لگا۔ نانی اماں سوئی سے چھرے کا سیسہ نکالتی ہوئی بولیں:

''بھلا تم ایسے مجنون کو کیوں چھیڑتے ہو؟ کسی دن چھرا مار کے آنکھیں نکال لے گا!''

''ارے نہیں، اکولینا ایوانوونا'' چچا پیوتر نے حقارت سے جواب دیا۔ ''وہ بھی کوئی نشانہ باز ہے!''

''پھر بھی اس کو یہ فتح کا احساس کیوں دو؟''

''اس کا احساس؟ میں تو اسے چھیڑنے کے لئے کرتا ہوں۔''

پھر اپنی ہتھیلی پر چھرے کے ٹکڑوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے:

''بالکل نشانہ باز نہیں وہ۔ اب وہ بیگم صاحب جو تھیں ناتیان الیکسئی ونا، تو وہ یوں ہی عارضی شادیاں کر لیا کرتی تھیں۔ وہ تو نوکروں کی طرح شوہر بدلتی تھیں۔ تو انہوں نے ایسی ہی عارضی شادی ایک فوجی سے کی تھی جس کا نام مامونت ایلیچ تھا۔ وہ تھا البتہ نشانہ باز! نانی اماں، وہ تو صرف گولیاں چلاتا ہے۔ یہ جو پگلا ایگنشکا ہے نا اس کو وہ دور کھڑا کر دیتا تھا، کوئی چالیس قدم پر اور اس کی پیٹی میں ایک بوتل لٹکتی رہتی تھی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں۔ اور ایگنشکا تو تھا ہی احمق۔ کھڑا کھل کھل ہنسا کرتا۔ پھر مامونت ایلیچ نشانہ لگاتے۔ اورڈز! سیدھی بوتل میں جا کر لگتی۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ شاید ایگنشکا کو مکھی وغیرہ نے کاٹا تو وہ ہل گیا اور گولی اس کے گھٹنے پر لگی، ہڈی پر! پھر لوگوں نے جلدی سے ڈاکٹر کو بلایا اور پلک جھپکتے میں

پاؤں کاٹ دیا گیا، یوں! اور اس کو دفنا دیا گیا۔''

''اور ایگنشکا؟''

''ارے وہ ٹھیک تھا۔ احمق کو ہاتھ پاؤں کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے۔ وہ تو اپنی حماقت پر زندہ رہتا ہے۔ بیوقوفوں کو سبھی چاہتے ہیں۔ یہ بے چارے بے ضرر جو ہوتے ہیں نا، وہ جو کہتے ہیں نا کہ نہ بدھی ہو گی نہ برائی ہوگی۔''

اس کہانی سے میری نانی اماں پر تو کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ ان کو ایسے درجنوں واقعات معلوم تھے۔ لیکن میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے پیوتر سے پوچھا:

''کیا یہ بھی ہوتا تھا کہ کوئی بڑا آدمی کسی کو جان سے بھی مار ڈالے؟''

''کیوں نہیں؟ بالکل مار سکتا تھا۔ ایک دوسرے کو بھی مار ڈالتے تھے۔ ایک دفعہ ایک اور فوجی افسر تاتیان الیکسئی وناسے ملنے آیا تو اس کی لڑائی مامونت سے ہو گئی۔ بس دونوں نے پستول سنبھال اور پارک میں چلے گئے اور وہاں جھیل کے کنارے روش پر اس فوجی افسر نے جو مامونت کو دی ہے تو سیدھی جگر میں جا کے لگی! ڈز! خیر، مامونت شہید مرا اور فوجی افسر کو قفقاز میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اور بس یہ خاتمہ وطن کر دیا گیا۔ اور بس یہ خاتمہ ہوا! تو دیکھا تم نے ایک دوسرے کو بھی مار ڈالتے ہیں یہ لوگ! اور جہاں تک کسانوں اور اس طرح کے لوگوں کا سوال ہے وہ تو۔ تھو۔ جتنے چاہو مار ڈالو، خاص کر اب آج کل جب اسامی کمیرے نہیں ہوتے ہیں۔ پہلے تو ذرا پھر بھی خیال کرتے تھے کیونکہ آخر کار کسان ان ہی کی جائداد اور ملکیت ہوتے تھے!''

''تب بھی کون بہت پرواہ کرتے تھے'' نانی اماں بیچ میں بولتیں۔

''بالکل صحیح ہے۔ جائداد تو تھے مگر کس قدر حقیر اور سستی جائداد تھے۔''

چچا پیوتر مجھ سے خاص مہربانی سے پیش آیا کرتے اور بڑوں کے مقابلے میں مجھ سے زیادہ محبت سے اور آنکھیں چار کر کے بات کیا کرتے تھے لیکن ان میں کچھ ایسی بات تھی جو مجھے نہ جانے کیوں اچھی نہیں لگتی تھی۔ جب وہ ہم لوگوں کو اپنا پسندیدہ مربہ کھلاتے تو دوسروں کے مقابلے میں میری روٹی پر زیادہ موٹی تہ جماتے۔ بازار جاتے تو میرے لئے سونٹھ کی ٹکیاں لے آتے، خشخاش لے آتے اور ہمیشہ مجھ سے بہت سکون اور سنجیدگی سے بات کرتے۔

''کہو مرد خدا، ہم بڑے ہوں گے تو کیا بنیں گے۔ کلرک یا سپاہی؟''

''سپاہی؟''

''ہاں تمہارے لئے ٹھیک ہے۔ آج کل سپاہی بننا کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے اور پادری لوگ بھی تو مزے میں رہتے ہیں۔ بس ادھر آئے ادھر گئے اور پکارنے لگے ''تعریف ہو خدا کی'' اور بس! پادری بننا تو سپاہی بننے سے بھی زیادہ آسان ہے۔ لیکن سب سے آسان مچھیرا بننا ہے۔ اسے کچھ جاننے سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بس عادت ڈال لے۔ بس!''

وہ بڑے مزے میں نقل کرتے تھے کہ مچھلی کانٹے کے چاروں طرف کس طرح گول گول گھومتی ہے اور روھو اور بام اور سال جب پھنستی ہیں تو کس کس طرح پیچ و تاب کھاتی ہیں اور کیسی کشمکش کرتی ہیں۔

''اب دیکھو نا جب تمہارے نانا تم کو پیٹتے ہیں تو بالکل خفا ہوا ٹھتے ہو۔ ہے نا؟'' وہ مجھے تسکین دینے والے انداز میں کہتے۔ ''لیکن بھلے آدمی ایسی معاملے میں پالگل ہونے کی بالکل کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ تمہارے ہی فائدہ کے لئے ہے اور ویسے یہ پٹائی ہے بھی بالکل بچوں کا کھیل۔ لیکن ہاں وہ تاتیان الیکسئی ونا کی بات البتہ تھی۔ وہ جو تم کو پٹواتی تو پتہ چلتا۔ وہ اس کام کے لئے ایک خاص ملازم رکھتی تھی۔ اس کا نام کریستوفر تھا۔ وہ ایسا ماہر تھا اس فن میں کہ آس پاس کے زمیندار بیگم صاحبہ کو کہلا کہلا کر بھیجا کرتے تھے۔ تاتیان الیکسئی وناذرا فلاں کو پٹوانا ہے، مہربانی کر کے اپنے کریستوفر کو ذرا عاریتاً وہ اس کو بھیج دیتی تھی۔''

وہ بڑے اطمینان سے جذباتی ہوئے بغیر تفصیل سے بیان کرتے کہ کس طرح بیگم صاحبہ اپنی کوٹھی کے بڑے بڑے ستونوں والے برآمدے میں سرخ آرام کرسی پر بیٹھتیں، جسم پر صاف شفاف سفید لباس ہوتا، کندھوں سے نیلے رنگ کا گلوبند لپٹا ہوتا اور اس طرح وہ اپنے اسامی مردوں اور عورتوں کے کریستوفر کے ہاتھ سے چابکیں کھانے کا نظارہ کرتیں۔

''یہ کریستوفر ریازان کا رہنے والا تھا، خانہ بدوش یا یوکرینی قسم کا تھا، مونچھ ایک کان سے دوسرے کان تک اور داڑھی مونڈنے سے چہرہ نیلا نیلا۔ اور معلوم نہیں سچ مچ ہی اس کا دماغ چلا ہوا تھا یا یوں ہی مفت خوری کے لئے بن گیا تھا۔ باورچی خانے میں گھس آیا، کسی برتن میں پانی لیا، ایک مکھی یا تل چٹایا کوئی بھی کیڑا لیا اور اس کو پانی میں ڈبو کر مار رہا ہے۔ لکڑی کی نوک سے دبائے جا رہا ہے، دبائے جا رہا ہے۔ کبھی اپنی کالر میں سے کوئی چیلر نکال لیتا اور اسی کو ڈبونے لگتا...''

میں نے اپنے نانا ابا اور نانی اماں سے ایسی بہت سی کہانیاں سنی تھیں، اسی لئے میں ایسی کہانیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ کہانیاں مختلف ہوتے ہوئے بھی اس ایک بات میں ایک ہی سی ہوتی تھیں۔ کہ ان میں انسان کی ذلت اور صعوبت کا ذکر بھرا ہوتا تھا۔ مجھے ایسی کہانیوں سے متلی ہوتی تھی۔

''کوئی اور سی کہانی کہیئے!'' میں کہتا۔

چچا پیوتر نے اپنے چہرے کی ساری جھریاں سکیڑ کر منہ کے پاس اکٹھی کر لیں اور پھر حامی بھری تو سب پھیل کر آنکھوں کے آس پاس چلی گئیں۔

''اچھا اچھا لالچی۔ لو اور سی ایک بار ہمارے یہاں ایک باورچی تھا...''

''کس کے یہاں؟''

''بیگم صاحبہ تاتیان الیکسئی ونا کے یہاں۔''

''آپ ان کو مردوں کی طرح تاتیان کیوں کہتے ہیں؟ وہ مرد تو نہیں تھیں نا؟ یا تھیں؟''

''نہیں نہیں۔ وہ تو خاتون تھیں بلکہ۔ ان کے مونچھ تھی، چھوٹی سی، کالی۔ وہ سانولے جرمنوں کی اولاد تھیں، وہ قوم کچھ خانہ بدوشوں کی سی ہوتی ہے۔ اچھا خیر۔ تو پھر ہمارا جو یہ باورچی تھا نا...اچھا اب یہ کہانی بڑی مزے دار ہے جناب عالی...''

اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مزے دار کہانی یوں تھی کہ ایک بار باورچی نے کوئی سالن خراب کر دیا تھا تو اس کو یہ سزا دی گئی کہ وہ سارا خراب سالن اس کو ایک دم کھلایا گیا جس کے نتیجے کے طور پر اسے خوب قے آئی۔

مجھے کوفت ہوگئی۔ بولا:

''اس میں کیا مزے دار ہے؟''

''تو پھر مزدے دار ہوتا کیا ہے؟''

''معلوم نہیں۔''

''تو پھر اپنی چونچ بند رکھو!''

اور پھر انہوں نے وہی اپنی پرانی اکتا دینے والی کہانیاں کہنی شروع کر دیں۔

کبھی کبھی میرے ماموں زاد بھائی اتوار کو ہم لوگوں سے ملنے آجایا کرتے تھے۔ میخائل ماموں کا

مرجھایا کمہلایا ہوا سا شا اور یا کوف ماموں کا صاف ستھرا اور سمجھ دار سا شا۔ ایک دن ہم تینوں شاگرد پیشے کی چھتوں پر چڑھے ٹامک ٹوٹیاں مار رہے تھے کہ ہم لوگوں کی نظر بیٹلنگ والے احاطے میں گئی۔ وہاں ایک صاحب لکڑی کے ایک ڈھیر پر چڑھے بیٹھے بیٹھے کتے کے کچھ پلوں سے کھیل رہے تھے۔ وہ جسم پر تو ایک لمبا سا سبز کوٹ پہنے ہوئے تھے جس میں سمور کا استر لگا ہوا تھا لیکن سر ننگا تھا اور چھوٹی سی پیلی چندیا خوب چمک رہی تھی۔ میرے بھائیوں میں سے ایک کی رائے ہوئی کہ ایک پلا اڑا لیا جائے۔ فوراً پلان بن گیا۔ ترکیب یہ تھی کہ میرے دونوں بھائی باہر گلی میں جا کر بیٹلنگ والے پھاٹک کے پاس چھپ کر کھڑے ہو جائیں اور میں ان بھلے آدمی کو کسی طرح ڈرا کے وہاں سے بھگاؤں۔ جب وہ بھاگ جائیں تو میرے بھائی موقع پا کر دوڑ پڑیں اور ایک پلا لے اڑیں۔

''لیکن میں ان کو وہاں سے بھگاؤں گا کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ارے اس کی چندیا پر تھوک دینا'' میرے بھائیوں میں سے ایک نے رائے دی۔

میں نے بڑے بڑے جرائم ہوتے دیکھے تھے اور سنے تھے اس لئے میرے نزدیک چندیا پر تھوکنا کوئی ایسا سنگین جرم نہ تھا۔ اس لئے مجھے اس فرض منصبی کو ادا کرنے میں قطعی پس وپیش نہ محسوس ہوا۔

لیکن اس حرکت پر وہ قیامت مچی کہ بس ہی بس۔ بیٹلنگ کے یہاں سے عورتوں اور مردوں کی ایک فوج کی فوج نے ہمارے احاطے پر ہلہ بول دیا۔ آگے آگے ایک خربرو جوان فوجی تھا۔ اور چونکہ جرم کے وقت میرے دونوں بھائی بڑی معصومیت کے ساتھ گلی میں کھیل رہے تھے اس لئے آئی گئی میرے سر پڑی۔ اور مجھ کو ہی وہ مار بھی کھانی پڑی جو نانا ابا نے نہایت باقاعدگی اور شان کے ساتھ مجھ کو کھلائی تاکہ بیٹلنگ خاندان کی جو ہتک ہوئی تھی اس کا کچھ ازالہ ہو جائے۔

جب میں باورچی خانے میں تندور کے اوپر تختے پر لیٹا ہوا تھا، خوب پٹا کٹا، زخمی سارا جسم دکھتا ہوا تو چچا پیوتر مجھے دیکھنے پہونچے۔ خوب اچھے اچھے کپڑے پہنے اور خوب ہشاش بشاش

''واہ جوان، خوب سوجھی!'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''خوب ٹھیک کیا، بڈھا بکرا کہیں کا۔ ان سبھوں پر تھوکنا چاہئے! اگر اس کے پچپچے سر پر ایک گمادے مارتے تو اور بھی اچھا ہوتا!''

میری نظروں میں ان جنٹلمین کا چھوٹا سا، بچوں کا سا چکنا چہرہ پھرنے لگا۔ قیمتی سبز کوٹ پہنے وہ کس طرح کھسیا کھسیا کے چیں چیں کرتے جا رہے تھے اور منے منے ہاتھوں سے اپنی زرد چندیا پر سے تھوک

پونچھتے جا رہے تھے مجھے اس وقت تو اپنے بھائیوں سے سخت نفرت ہوئی تھی اور اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن اس وقت جو میں نے چچا پیوتر کا ٹوکری نما چہرہ دیکھا تو سب بھول گیا۔ ان کا چہرہ اسی خوفناک اور نفرت انگیز طریقے سے کانپ رہا تھا جس طرح میرے نانا ابا کا جب وہ مجھے پیٹ رہے تھے۔

''دور ہو!'' میں نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے انہیں دھکیلتے ہوئے کہا۔ انہوں نے خاموشی سے ہنکارا بھرا، آنکھ ماری اور تندور پر سے اٹھ گئے۔

اس وقت کے بعد پھر کبھی میرا جی نہ چاہا کہ ان سے بات کروں بلکہ ان سے پہلو بچانے لگا اور ان پر شبہ کی نظر رکھنے لگا جیسے میں مبہم طور پر کسی آنے والے خطرے کا منتظر ہوں۔

اس واقعہ کے بعد جلد ہی ایک اور واقعہ ہوا۔

مجھے اوفسیا نیکوف کے خاندان کے گھر سے جس پر ہمیشہ سناٹا سا چھایا رہتا تھا، ایک پراسراری دلچسپی پیدا ہوگئی تھی جیسے اس پرانے بھورے مکان میں کہیں نہ کہیں پریوں کی کوئی داستان چھپی بیٹھی ہو۔

بیٹلنگ کے گھر میں ہمیشہ خوب شور شعب، چہل پہل رہتی تھی، کوئی نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں وہاں رہتی تھیں اور بہت سے طالبعلم اور افسران وہاں آیا کرتے اور خوب باتیں کرتے، ہنستے، گاتے اور کھیلتے۔ سارے مکان پر رنگین سی فضا چھائی رہتی، کھڑکیاں چوپٹ کھلی رہتیں، ان میں سے پودوں کی روشن سبزی جھانکتی رہتی اور خاص طور پر نمایاں رہتی۔ میرے نانا ابا کو اس مکان سے نفرت تھی، گھر میں رہنے والوں کو اکثر عام طور سے ''کافر، بے دین'' کہتے اور عورتوں کے لئے ایک خاص فحش لفظ استعمال کرتے۔ اس لفظ کے معنی چچا پیوتر نے ایک دفعہ بڑے فحش انداز میں خوب مزے لے لے کر سمجھائے تھے۔

لیکن اوفسیا نیکوف کو جو مکان تھا اس کے وقار اور خاموشی سے نانا ابا نہایت مرعوب تھے۔

یہ اونچا مکان ایک ہی منزل کا تھا اور اس کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا کھلا ہوا احاطہ تھا جس میں سبز گھاس کا فرش بچھا تھا۔ احاطے کے بیچوں بیچ کنواں تھا جس پر دو ستونوں پر ٹکی ہوئی چھت بھی تھی۔ مکان گلی سے کچھ اس طرح الگ تھا جیسے گلی سے چھپ جانا چاہتا ہو۔ مکان کے اگلے حصے کی سجاوٹ تین کھڑکیوں سے ہوتی تھی جو پتلی پتلی تھیں، خم کھائی ہوئی۔ ان کے شیشوں پر سورج کی روشنی پڑتی تو قوس

قزح کے سے رنگ دمکنے لگتے۔ پھاٹکے کے داہنے ہاتھ کو اناج کی ایک کوٹھی بنی ہوئی تھی اور اس میں بھی ان تینوں کھڑکیوں سے ملتی جلتی کھڑکیاں بنی تھیں۔لیکن یہ کھڑکیاں صرف دکھاوے کی تھیں اور اس طرح بنی تھیں کہ بھوری دیوار میں چوکھٹے کو جما کر کھڑکی کی شکل دے دی گئی تھی اور پٹ وغیرہ صرف رنگ دئے گئے تھے۔ یہ اندھی کھڑکیاں بہت بری لگتی تھیں اور اناج کی کوٹھی کا وجود بھی گویا یہ ظاہر کرتا تھا کہ یہ مکان کوئی آڑ چاہتا ہے جس کے پیچھے چھپ چھپ کر وہ اپنی زندگی اس طرح بسر کر سکے کہ کوئی اسے نہ دیکھے۔ اناج کی کوٹھی اور خالی اصطبلوں اور ان کے بڑے پھاٹکوں سمیت یہ پوری عمارت ایسی محسوس ہوتی تھی کہ کسی پوشیدہ صدمے کو بڑے باوقار حلم کے ساتھ برداشت کر رہی ہے۔

کبھی ایک لمبا آدمی۔ داڑھی صفاچٹ، سفید مونچھیں سوئیوں کی طرح نوکدار نکلی ہوئی، احاطے میں ادھر سے ادھر لنگڑا لنگڑا کے چلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔کبھی کبھار ایک اور آدمی، ٹیڑھی سی ناک، گل مچھے رکھے، ایک بھورے رنگ کے گھوڑے کو اصطبل سے نکالتا ہوا نظر آتا۔ باہر احاطے میں نکل کر یہ گھوڑا جس کا سینہ اور پاؤں بہت دبلے تھے دھیرے دھیرے سر ہلاتا جیسے کسی نیک طبیعت بڑھیا کی طرح، ہر ایک کی طرف محبت سے جھک جھک کر اس کو پہچان رہا ہو۔ بوڑھا اور لنگڑا آدمی اس کو زور زور سے ٹھونکتا، سیٹی بجاتا، پھر ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر گھوڑے کو واپس اندھیرے اصطبل میں بھیجوا دیتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے یہ بوڑھا اس مکان سے بھاگ جانا چاہتا ہے لیکن کسی افسوں کے تحت وہاں رہنے پر مجبور ہے۔

تقریباً تمام دن، دوپہر سے لے کر شام تک، احاطے میں چھوٹے چھوٹے تین لڑکے کھیلتے رہتے تھے۔ وہ سب ایک سے بھورے پتلون اور کرتے اور ایک ہی سی ٹوپیاں پہنے رہتے تھے اور صورت میں بھی ایک دوسرے سے اس قدر ملتے جلتے تھے کہ میں صرف سائز کے حساب سے ان کو الگ الگ پہچان پاتا تھا۔سب کے گول گول چہرے، بھوری بھوری آنکھیں۔

چہار دیواری کے ایک چھید میں سے جھانک کر میں ان کو دیکھا کرتا تھا لیکن اس بات سے مایوسی ہوتی تھی کہ ان کو کبھی میرا پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ لوگ جو کھیل کھیلا کرتے تھے وہ مجھ کو معلوم نہ تھے لیکن جس محبت اور پیار سے وہ مل جل کر کھیلتے تھے وہ دیکھنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ مجھے ان لوگوں کے کپڑے بھی اچھے لگتے تھے اور یہ بات بھی اچھی لگتی تھی کہ وہ لوگ ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ خاص طور پر بڑے بھائی سب سے چھوٹے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جو بڑا ہی دلکش اور گل گتھنا تھا۔ اگر وہ گر پڑتا تو وہ لوگ ہنستے تو

ضرور تھے۔ جیسے کوئی بھی گر پڑے تو لوگ ہنستے ہی ہیں۔ لیکن ان کی ہنسی میں کوئی کمینہ پن نہ ہوتا تھا۔ فوراً دوڑ کر وہ اٹھنے میں اس کی مدد کرتے اور اس کے ہاتھ اور گھٹنے درخت کے پتوں یا اپنے رومالوں سے جھاڑ کر صاف کرتے۔

''اے بھوندو'' منجھلا والا کہتا۔

نہ وہ لوگ کبھی لڑتے تھے نہ ایک دوسرے کو بیوقوف بناتے تھے اور تینوں مضبوط اور پھرتیلے اور توانا تھے۔

ایک دن میں نے درخت پر چڑھ کر سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سن کر وہ کھیلتے کھیلتے تھم گئے، نظریں مجھ پر پڑیں اور ایک دوسرے کے قریب ہو کر کچھ صلاح مشورہ کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ شاید مجھ پر پتھر پھینکیں گے اس لئے میں درخت سے اترا اور قمیص اور پتلون کی جیب میں خوب روڑے بھر کر پھر درخت پر چڑھا۔ لیکن وہ احاطے کے ایک دور والے کونے میں پھر کوئی کھیل کھیل رہے تھے اور غالباً مجھ کو بھول چکے تھے۔ یہ بڑی ہی افسوسناک بات تھی لیکن میں جنگ میں سبقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی وقت کسی نے کھڑکی سے پکارا:

''بچو گھر میں آؤ۔ جلدی!''

وہ لوگ فرمانبرداری کے ساتھ مڑے اور بطخوں کی طرح آہستہ آہستہ چلتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

پھر میں احاطے کی چہار دیواری کے پار درخت پر کئی بار اس امید میں چڑھا کہ وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ کھیلنے کو بلا لیں لیکن انہوں نے کبھی نہ بلایا۔ میں تخیل ہی تخیل میں ان کے کھیلوں میں شریک ہوتا یہاں تک کہ چلانے اور ہنسنے بھی لگتا اور ایسے موقعوں پر وہ تینوں میری طرف دیکھتے اور آپس میں کچھ پھسپھساتے۔ میں بوکھلا کر درخت سے پھسلاتا ہوا اتر آتا۔

ایک دن وہ لوگ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ منجھلا بھائی چور بنا تھا اور اناج کی کوٹھی کے ایک کونے میں دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کئے کھڑا تھا تاکہ دکھائی نہ دے اور اس کے دونوں بھائی چھپ رہے تھے۔ بڑا لڑکا تو جلدی سے ایک گاڑی میں چڑھ گیا جو چھجے کے نیچے کھڑی تھی لیکن ننھا بھائی کنویں کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں چھپے۔ اتنے میں جو لڑکا چور بنا تھا اس نے آواز دی:

''ایک...دو...''

ننھا کنویں کی مینڈھ پر چڑھ گیا، لٹکتی ہوئی رسی پکڑی اور اچھل کر خالی ڈول میں بیٹھ گیا۔ ڈول فوراً نظر سے غائب ہو گیا اور کنویں کی دیواروں سے اس کے ٹکرانے کی آواز آنے لگی۔

میں نے جو دیکھا کہ رسی جلدی جلدی اور خاموشی سے کھلتی جا رہی ہے تو خوف سے میرا خون جم گیا۔ لیکن میں فوراً درخت پر سے احاطے میں کودا اور چیختا ہوا بھاگا:

''اتنی زور سے نہ کینچو!''

ہم لوگوں نے بچے کو اس میں سے نکالا۔ وہ بری طرح ڈرا ہوا تھا، داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے خون جاری تھا، ایک گال پر بھی بڑے برے کھرونچے آئے تھے، کمر تک پانی میں بھیگا ہوا۔ چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی لیکن کانپتا ہوا مسکرا کر بولا:

''میں کچھا گلا۔''

''اے بھوندو۔ بیوقوف'' منجھلے بھائی نے اس کو گلے لگا کے تتلاتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے سے خون پونچھنے لگا۔ بڑے والے کے چہرے پر بل پڑ گئے اور بولا:

''چلو، اب تو یہ بات چھپ نہیں سکتی۔ چلو اب چلنا ہی پڑے گا ہم لوگوں کو۔''

''کیا تم لوگوں کو 'چاٹ'' ملے گی؟''

اس نے ہاں کہتے ہوئے سر ہلایا اور اپنا ہاتھ بڑھایا:

''تم بہت تیز بھاگے بھئی!''

میں اس کی تعریف سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کا ہاتھ پکڑنا بھی بھول گیا۔ پھر اس نے منجھلے بھائی سے کہا:

''ہاں'' ننھے نے سر ہلایا۔ ''کہہ دیں گے گلھے میں گل پلے۔''

اور وہ لوگ اندر چلے گئے۔

یہ تمام واقعہ اس تیزی سے ہوا کہ جب میں نے مڑ کر درخت کی اس شاخ کو دیکھا جس پر میں بیٹھا تھا تو وہ ابھی تک ہل رہی تھی اور اس کے زرد زرد پتے گر رہے تھے۔

اس کے بعد تقریباً ایک ہفتے تک وہ تینوں بھائی احاطے میں نہیں دکھائی دئے۔ اور جب دکھائی

دئے تو پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش۔ بڑے لڑکے نے جیسے ہی مجھے دیکھا زور سے آواز دی:

''آؤ آؤ۔ ہمارے سات کھیلو!''

ہم سب مل کر چھجے کے نیچے گاڑی میں چڑھ بیٹھے اور بڑی دیر تک وہاں دوستی بگھارتے رہے۔

''کیا مار پڑی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

بڑے نے جواب دیا ''ہاں خوب پڑی۔''

یہ یقین کرنا ذرا مشکل ہی لگتا تھا کہ ان لڑکوں پر بھی میری طرح ''چاٹ'' پڑتی تھی اور میرے خیال میں یہ سخت ناانصافی تھی۔

چھوٹے نے مجھ سے پوچھا:

''تم چڑیاں کیوں پکڑتے ہو؟''

''کیونکہ وہ گاتی بہت اچھا ہیں۔''

''اب مت پکڑنا۔ ان کو آزاد چھوڑ دو کہ جہاں چاہیں جائیں۔''

''اچھا۔ اب نہیں پکڑوں گا!''

''مگر پہلے ایک پکڑ کر مجھ کو دے دینا۔''

''کونسی؟''

''کوئی اچھی چہچہانے والی۔ پنجرے والی۔''

''ہاں تو وہ بلبل ہوسکتی ہے۔''

ننھا بھائی بولا:

''بلی جو مار ڈالے گی اس کو اور پھر ابا بھی تو نہیں پالنے دیں گے۔''

''ہاں اور کیا'' بڑے نے اس سے اتفاق کیا۔

''تم لوگوں کی ماں نہیں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں'' بڑے نے کہا لیکن منجھلے نے اس کو صحیح کیا۔

''ہے، لیکن دوسری ہے۔ ہماری نہیں ہے۔ ہماری مرگئی۔''

''تو اس طرح ماں سوتیلی ماں کہلاتی ہے'' میں نے کہا۔

''ہاں اور کیا'' بڑے نے سر ہلایا۔

تینوں کے تینوں پر ایک اداس سی خاموشی چھا گئی۔

نانی اماں کی کہانیوں سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ سوتیلی مائیں کیسی ہوتی ہیں۔ میں ان کی خاموشی کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ تینوں اس طرح ایک دوسرے سے لگے سٹے بیٹھے تھے جیسے مٹر کے تین دانے۔ مجھے وہ کہانی یاد آئی جس میں سوتیلی ماں جادوگرنی تھی اور اس نے چالبازی سے اصلی ماں کی جگہ لے لی تھی۔ میں نے ان لوگوں کو تسکین دینے کی کوشش کی:

''پریشان نہ ہو! تم لوگوں کی اصلی ماں آ ہی جائیں گی۔''

بڑا لڑکا کندے ہلا کر بولا:

''کیسے آ جائیں گی؟ وہ تو مر گئیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔''

ایسا کبھی نہیں ہوتا؟ اے خدا نہ جانے کتنی بار آبِ حیات چھڑکنے سے نہ صرف مردے جاگ اٹھے تھے بلکہ وہ لوگ بھی جی گئے تھے جن کے سینکڑوں ٹکڑے کر دئے گئے تھے۔ کتنی بار یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ یہ موت اصلی موت۔ خدا کی بھیجی ہوئی موت نہ تھی بلکہ جادوگروں اور جادوگرنیوں کی بلائی ہوئی موت تھی۔

میں نے نانی اماں کی کہانیوں کا سلسلہ بڑے جوش کے ساتھ بیان کرنا شروع کیا لیکن بڑا لڑکا حقارت سے ہنسا اور بولا:

''ارے یہ ہم نے بھی سنا ہے۔ مگر یہ سب تو کہانیاں ہیں، صرف کہانیاں۔''

اس کے دونوں چھوٹے بھائی خاموشی سے سنتے رہے۔ ننھے کے چہرے پر بل تھے، ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، منجھلا ایک گھٹنے پر کہنی رکھے تھا اور دوسرا ہاتھ ننھے کے گلے میں ڈالے اسے میری طرف جھکائے ہوئے تھا۔

شام کافی آ چکی تھی۔ مکانوں کی چھتوں پر گلابی بادل بیٹھتے جا رہے تھے کہ یکا یک وہ سفید مونچھوں والا آدمی ہم لوگوں کے درمیان میں گھس پڑا۔ وہ پادری جیسا لمبا بھورا کوٹ پہنے ہوئے تھا، اس کے سر پر سمور کی ٹوپی تھی۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

بڑے لڑکے نے کھڑے ہو کر نانا ابا کے مکان کی طرف گردن سے اشارہ کیا:

''یہ وہاں سے آئے ہیں۔''

تینوں کے تینوں لڑکے فرمانبرداری کے ساتھ گاڑی سے باہر نکل آئے اور گھر کے اندر چلے گئے جس سے مجھے پھر احساس ہوا کہ وہ غلام بطخوں کی طرح تھے۔

بڈھے نے میرے کندھے پکڑے اور احاطے میں سے ہوتا ہوا مجھے پھاٹک پر لایا۔ ڈر کے مارے میری آنکھوں میں آنسو ابل آئے لیکن وہ اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ مجھے رونے کا موقع ہی نہ ملا۔ اب میں گلی میں کھڑا تھا اور وہ پھاٹک پر۔ وہ ایک انگلی اٹھا کر دھمکاتے ہوئے بولا:

''خبردار اب کبھی ہمارے یہاں آنے کی ہمت نہ کرنا!''

میں نے غصے میں جواب دیا:

''تیرے یہاں کون آیا تھا، بڑھے کھوسٹ شیطان؟''

اس نے اپنا لمبا ہاتھ بڑھا کر پھر مجھ کو دبوچا اور گلی سے گھر کی طرف لے چلا، رستے میں بار بار زور زور سے ایک ہی سوال پوچھتا جاتا تھا جیسے ہتھوڑی سر پر مار رہا ہو:

''تیرا نانا گھر پر ہے؟ نانا گھر پر ہے؟''

بدنصیبی سے نانا ابا گھر پر ہی تھے۔ وہ اس دخل در معقولات کرنے والے بڈھے کے سامنے کھڑے تھے۔ سر اٹھا ہوا، داڑھی آگے کو نکلی ہوئی، کرنل کی بجھی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نانا نے کہا:

''اس کی ماں یہاں ہے نہیں۔ میں کام کاج میں پھنسا رہتا ہوں۔ کوئی دیکھنے بھالنے والا نہیں ہے۔ معاف کیجئے گا کرنل صاحب!''

کرنل صاحب نے ایک ایسی گرج سنائی جو سارے گھر میں گونج گئی، ایڑی پر گھوم گئے اور مارچ کرتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ ذرا دیر بعد میں دھکیلا گیا تو چچا پیوتر کے ٹھیلے میں جا کر گرا۔

''کیوں بھئی پھر پٹائی ہوئی؟'' وہ گھوڑے کا ساز کھولتے ہوئے بولے۔ ''اب کی بار کیوں پڑی؟''

جب میں نے ان کو قصہ سنایا تو وہ غصے سے لال ہو گئے۔ خوں خوں کرتے ہوئے بولے:

''لیکن تم کو ایسے لوگوں سے دوستی کرنے کی کیا پڑی ہے؟ یہ صاحبوں کے بچے، دیکھو ان کی بدولت تمہاری کیا گت بنی۔ اب سے موقع ہو تو تم ان کو اتنی ہی رسیع کرنا!''

وہ دیر تک بھرتے رہے۔ پہلے تو میں اپنے مار کھانے کی وجہ سے ان کی بد بداہٹ سے تسکین محسوس کر کے ان سے اتفاق کرتا رہا، لیکن ان کا ٹوکری نما چہرہ کچھ اس مکروہ طریقے سے کانپ رہا تھا کہ مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ آخر ان لڑکوں بیچاروں نے بھی تو مار کھائی ہوگی اور ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے میرا کچھ بگاڑ انہیں تھا۔

''میں کیوں ان کو پیٹوں؟ وہ اچھے بچے ہیں'' میں نے الٹ کے جواب دیا۔''اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ سب جھوٹ کی پوٹ ہے اور بس۔''

انہوں نے نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا:

''نکل میرے ٹھیلے سے!''

''بے وقوف'' میں باہر کودتے ہوئے کہا۔

''میں بے وقوف؟ میں جھوٹا؟ ٹھہر۔ تجھے بتاتا ہوں'' وہ مجھے پکڑنے کے لئے احاطے میں دوڑانے لگے لیکن پکڑ نہیں پائے۔ اتنے میں نانی اماں باورچی خانے والے برآمدے میں نکل آئیں اور وہ ان سے میری شکایت کرنے لگے:

''یہ لونڈا مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ زبان سنبھالتا نہیں، وہ مجھے ماں کی گالیاں دیتا ہے۔ مجھ کو دیکھو اور اس کو دیکھو بھلا کیا میں اس کے برابر ہوں؟''

جب لوگ میرے منہ پر صاف جھوٹ بولتے تھے تو میں کچھ ایسا حیران رہ جاتا تھا کہ ہوش حواس کھو بیٹھتا تھا۔ چنانچہ میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے جو کچھ کہوں۔ لیکن نانی اماں بڑے استقلال سے بولیں:

''اچھا پیوتر، اچھا۔ اب تم بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو۔ مجھ سے تو نہ کہنا کہ اس نے تم کو ماں کی گالی دی!''

نانا ابا اگر ہوتے تو ضرور چچا پیوتر کی بات کا یقین کر لیتے۔

اس دن کے بعد ان کے اور میرے درمیان صرف خاموش اور کینہ پرور جنگ کا رشتہ رہ گیا۔ وہ ہر موقع ڈھونڈتے کہ مجھے لگاموں سے یا چابک سے کونچیں یا چاٹ دیں جیسے اتفاق سے ایسا ہو گیا ہو، میری چڑیاں کھول کے اڑا دیتے اور ایک دن تو انہوں نے میری چڑیوں پر بلی لگا دی۔ نانا ابا سے ہمیشہ میری

شکایت کرتے رہتے اور اس کا سبب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے۔ میرے لئے ناممکن ہو گیا کہ اب میں ان کو کسی اور طرح تصور کر سکوں سوائے اس کے کہ وہ بھی میرے برابر کا لڑکا تھا جس نے اتفاق سے بوڑھوں کا لباس پہن لیا تھا۔ اپنے موقع پر میں بھی ان کی چپلوں سے رسی اور فیتے چپکے سے کھول دیتا اور جب وہ پہننے چلتے تو ساری چپل الگ الگ بکھر پڑی۔ ایک دن میں کالی مرچ پیس کر ان کی ٹوپی میں چھڑک دی اور وہ گھنٹے بھر تک ادھر ادھر چھینکتے پھرے۔ غرضیکہ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ اتوار کے دن وہ سارا سارا دن میرے خلاف جاسوسی کرتے اور متعدد بار انہوں نے مجھ کو ''صاحب کو بچوں'' سے ''غیر قانونی'' تعلقات پیدا کرتے ہوئے پکڑا۔ ایسے موقعوں پر وہ سیدھے جا کر میرے نانا سے رپورٹ کرتے تھے۔

میں نے ان لڑکوں سے اپنی دوستی برابر جاری رکھی اور اس میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔ نانا ابا کے مکان اور اوفسیا نیکوف کے احاطے والی چہار دیواری میں ایک کونہ سا بنتا تھا جس کی آڑ دو درختوں سے ہوتی تھی۔ وہاں رس بھری کی جھاڑیاں بھی بھری ہوئی تھیں۔ جھاڑیوں کے نیچے چہار دیواری میں میں نے ایک چھوٹا سا سوراخ کاٹ دیا تھا۔ ان بھائیوں میں سے ایک ہمیشہ پہرے پر کھڑا رہ کر یہ دیکھا کرتا کہ کرنل ہمیں نہ پکڑ پائیں اور دو دو کر کے یا باری باری سے اس کونے میں آجاتے اور ہم لوگ چپکے چپکے خوب باتیں کیا کرتے۔

وہ لوگ مجھے اپنی اکتائی ہوئی زندگی کے بارے میں بتاتے اور مجھے اس سے بہت کوفت ہوتی۔ میری چڑیوں کے متعلق اور دوسری بچوں کی دلچسپیوں کے بارے میں بات چیت ہوتی لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ لوگ اپنے باپ یا سوتیلی ماں کا ذکر کبھی نہیں کرتے تھے۔ اکثر تو وہ بڑے بھولے پن سے مجھ سے کہتے کہ کہانیاں سناؤں اور میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ اپنی نانی سے سنی ہوئی ساری کہانیاں دھراتا۔ اگر بیچ میں کچھ بھول جاتا تو ان سے ٹھہرنے کو کہہ کر دوڑا دوڑا جاتا اور نانی اماں سے مدد لیتا۔ وہ نہایت خوشی سے بتا دیتیں۔

ان لوگوں کو میں اکثر اپنی نانی کے متعلق بتاتا۔ ایک دن بڑے لڑکے نے ٹھنڈی گہری سانس لے کر کہا:

''سب نانیاں اچھی ہوتی ہوں گی۔ ہماری بھی ایک بڑی اچھی نانی اماں ہوا کرتی تھیں۔''

وہ اکثر اور کچھ غمناک انداز میں یہ فقرے استعمال کرتا تھا ''کسی زمانے میں'' ''ہوا کرتی تھیں'' ''میرے پاس تھا'' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی عمر گیارہ سال کی نہیں بلکہ زندگی کے سو سال پورے کر چکا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ اس کے ہاتھ بہت نازک تھے، لمبی لمبی پتلی پتلی انگلیاں۔ وہ خود بھی دبلا پتلا اور نازک تھا اور اس کی آنکھیں ایسی شرمیلی اور شفاف تھیں جیسے گرجے میں مقدس شبیہوں کے آگے جلنے والا لیمپ۔ مجھے اس کے دونوں بھائی بھی اچھے لگتے تھے۔ ان سے ہمدردی محسوس ہوتی تھی اور ان کو دیکھ کر ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ لیکن میرے دل میں اصلی چاہت بڑے کی تھی۔

کبھی کبھی میں آپس کی بات چیت میں ایسا کھو جاتا تھا کہ چچا پیوتر کی آمد کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ وہ ایک دم آتے اور ہم لوگوں کو اپنی اونچی کھینچتی ہوتی آواز سے چونکا دیتے:

''کیوں...ں...ں، پھر وہی حرکت؟''

میں غور کر رہا تھا کہ آج کل ان کے خاموشی کے دورے بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں یہ بھی پہچاننے لگا تھا کہ جب وہ کام سے واپس آتے ہیں تو ان موڈ کیا ہے۔ عام طور پر وہ دھیرے دھیرے پھاٹک کھولتے تھے اور قبضوں میں سے ایک تسلسل کے ساتھ چوں...ں...ں...ں نکلتی تھی، لیکن جب ان کا موڈ خراب ہوتا تو قبضوں میں سے یکا یک تیز آواز نکلتی جیسے درد کی چیخ ہو۔

ان کا گونگا بھتیجا شادی کرنے دیہات چلا گیا تھا اور چچا پیوتر اپنی نیچی چھت والی کوٹھری میں تنہا ہی رہتے تھے۔ یہ کوٹھری اصطبل کے اوپر بنی تھی، اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی اور اندر سے ہمیشہ تارکول، پرانے چمڑے، تمباکو اور پسینے کے بھبکے آیا کرتے تھے۔ اسی بو کی وجہ سے میں ان کی کوٹھری میں کبھی نہیں جاتا تھا۔ آج کل وہ سوتے تو چراغ نہیں بجھاتے تھے۔ نانا ابا کو یہ بات بہت بری لگتی تھی۔

''دیکھو پیوتر۔ ذرا ہشیار رہنا! کبھی سارا گھر پھونک کے دھر دو!''

''ارے نہیں! ایسا کوئی ڈر نہیں۔ میں چراغ کو پانی کے کونڈے میں رکھ کر سوتا ہوں'' وہ نظر چرا کے جواب دیتے۔

آج کل وہ اکثر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے، نہ نانی اماں کی پارٹیوں میں شریک ہوتے، نہ ہم لوگوں کو مربہ کھلاتے۔ ان کا چہرہ مرجھا گیا تھا، جھریاں اور گہری وہ گئی تھیں اور چلتے تھے تو بیمار کی طرح لڑکھڑاتے

تھے۔

ایک دن رات کو بے تحاشا برف گری۔ صبح کو میں اور نانا ابا بیلچوں سے برف کھود رہے تھے کہ پھاٹک کا کھٹکا بڑی شان سے کھلا اور پولیس کا ایک آدمی احاطے میں داخل ہوا، دروازہ بند کیا، اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا اور نانا ابا کو انگلی کے اشارے سے بلایا۔ جب نانا ابا اس کے پاس پہونچے تو اس نے اپنی لمبی ناک تقریباً نانا کے چہرے میں گھسا دی اور کوئی بات کہی جس کے جواب میں نانا ابا جلدی سے گھبرا کے بولے:

''یہاں۔ کب؟ مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔''

پھر ایک دم سے چونکے اور چیخے:

''خدا کی پناہ! سچ؟ نہیں؟''

''ش...ش'' پولیس والے نے خبردار کیا۔

نانا ابا نے چاروں طرف دیکھا اور مجھے دیکھ کر بولے:

''بیلچے اٹھا کے اندر چل، گھر میں!''

میں گھر کی دیوار کی آڑ میں چھپ گیا اور دیکھتا رہا کہ وہ لوگ اصطبل تک پہونچ کر چچا پیوتر کی کوٹھری میں داخل ہو رہے ہیں۔ پولیس والے نے اپنے داہنے ہاتھ کا دستانہ اتار لیا تھا اور اسے زور زور سے بائیں ہاتھ پر پھٹپھٹا رہا تھا۔

''وہ خوب سمجھتا ہے۔ دیکھئے گھوڑے کو چھوڑ چھاڑ اپنے آپ چھپ گیا۔''

میں یہ سب ماجرا سن کے نانی اماں کو بتانے کے لئے دوڑا دوڑا باورچی خانے میں پہونچا۔ وہ آٹا گوندھ رہی تھیں، آٹے کے کچھ ذرے ان کے بالوں میں بھی لگے تھے۔ جب میں سب کچھ سنا چکا تو بڑی بے نیازی اور سکون سے سر ہلا کر بولیں:

''ارے کچھ چرایا ہوگا اور کچھ بات ہوگی۔ تو جا کر باہر کھیل! تجھے ان باتوں سے مطلب؟''

میں پھر احاطے میں بھاگا۔ نانا ابا اپنی ٹوپی ہاتھ میں لئے ننگے سر پھاٹک پر کھڑے، آسمان کی طرف نظریں اٹھائے جلدی جلدی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہے تھے۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے، چہرے پر غصہ تھا اور ایک پاؤں کپکپا رہا تھا۔ زور سے پیر پٹک کر بولے:

''تجھ سے کہا نا کہ گھر میں چل!''

اور میرے پیچھے پیچھے ہی گھر میں داخل ہوئے۔ باورچی خانے میں پہونچ کر بولے:

''وروارا کی ماں، یہاں آنا!''

پھر دونوں دوسرے کمرے میں گئے اور دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے۔ جب نانی اماں واپس آئیں تو ان کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی میں سمجھ گیا کہ کوئی خطرناک معاملہ ہے۔

''نانی اماں، آپ کیوں گھبرا رہی ہیں؟''

وہ آہستہ سے بولیں ''تو چپ رہ۔''

دن بھر گھر پر ایک عجیب تناؤ اور پریشانی کا عالم طاری رہا۔ نانی اماں اور نانا ابا ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور ایک دوسرے سے دبے دبے لفظوں میں نہ جانے کیا کہتے جس سے پریشانی کی فضا اور بڑھتی۔

''تمام مقدس شبیہوں کے چراغوں کو روشن کر دو، وروارا کی ماں'' نانا ابا نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

جلدی جلدی دونوں نے کھانا کھایا جیسے کوئی آنے والا ہو۔ نانا ابا تھکے ہمارے انداز میں بار بار گال پھلاتے، بدبداتے اور آہستہ سے کہتے:

''افوہ، انسان کہاں تک شیطان کا مقابلہ کرے! اب اسی کو دیکھو، یوں اچھا خاصہ متقی پرہیزگار آدمی لگتا تھا پر دیکھو کیا کر بیٹھا۔''

نانی اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

جاڑوں کا وہ چمکیلا دن کسی طرح ختم ہی ہونے میں نہ آتا تھا اور ہر گھڑی گھر کی فضا میں بے چینی اور گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ شام ہوتے ہوتے پولیس کا ایک اور سپاہی آپہونچا۔ وہ موٹا سا تھا اور اس کے بال سرخ تھے۔ باورچی خانے کے ایک بنچ پر بیٹھ کر وہ اونگھنے لگا۔ وہ سر ہلا ہلا کے خرخر کر رہا تھا۔

''ان لوگوں کو پتہ کیسے چلا؟'' نانی اماں نے پوچھا۔

وہ ذرا رک کے خرخراتا ہوا بولا:

''فکر نہ کیجئے۔ ہم سب پتہ چلا لیں گے!''

مجھے یاد ہے کہ میں کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا اور سینٹ جارج کی چھاپ کا ایک سکہ منہ میں رکھ رکھ کر گرم کر رہا تھا تاکہ اس سے برف جمی ہوئی کھڑکی پر چھاپ بنا سکوں۔

یکا یک باہر گلیارے میں بڑی گڑ بڑ ہونے لگی اور دروازہ دھڑام سے کھل پڑا۔ پیتروونا دہلیز پر کھڑی چیخ رہی تھی:

''جاؤ، جاؤ! دیکھو تمہارے باغ میں کیا ہو رہا ہے!''

پولیس والے کو دیکھتے ہی وہ الٹے پاؤں گلیارے میں بھاگی لیکن اس نے لپک کر اس کا لہنگا پکڑ لیا اور بھی خوفناک آواز میں چیخا؛

''ایک منٹ ٹھہرو! کون ہو تم؟ باہر کیا ہو رہا ہے؟'

چوکھٹ پر وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا اور رونے لگی۔ روتے روتے آنسو گھونٹ کر الفاظ چبا چبا کر بولی:

''میں گائے دوھنے گئی تھی اور ایک دم سے کاشیرین کے باغ میں جوتوں کی ایک جوڑی مجھے چلتی ہوئی نظر آئی۔''

نانا ابا غصے میں بھر کر بولے:

''یہ جھوٹ ہے، رنڈی کہیں کی! ہمارے باغ میں کیوں دکھائی دیتا کچھ؟ چہار دیواری اتنی اونچی اونچی ہے اور اس میں کوئی چھید بھی نہیں۔ جھوٹ بولتی ہے! وہاں کوئی نہیں!''

''یہ جھوٹ ہے، رنڈی کہیں کی! ہمارے باغ میں کیوں دکھائی دیتا کچھ؟ چہار دیواری اتنی اونچی اونچی ہے اور اس میں کوئی چھید بھی نہیں۔ جھوٹ بولتی ہے! وہاں کوئی نہیں!''

''ہائے میں مر گئی!'' پیتروونا نے ایک ہاتھ پولیس والے کی طرف بڑھایا اور دوسرے سے اپنا سر پکڑا۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں تو جھوٹ ہی کہہ رہی ہوں! میں جا رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ تمہارے باغ کی طرف پیروں کے نشان بنے ہوئے تھے اور ایک جگہ پر برف بالکل کچلی اور دبی پڑی تھی۔ تو میں جنگلے پر چڑھی کہ دیکھوں کیا بات ہے۔ تو وہاں وہ پڑا ہوا تھا۔''

''کون؟''

یہ چیخ سنائی دی بے کار، بے معنی۔ اور پھر ایک دم سے سب اس طرح ایک دوسرے کو دھکیلتے باورچی خانے سے نکل کر باغ کی طرف بھاگے جیسے ان پر جنون سوار ہو۔ برف کے گڑھے میں چچا پیور پڑے

ہوئے تھے، ان کی پیٹھ ایک جلی ہوئی شہتیر پر ٹکی ہوئی تھی، سر سینے پر۔ دہنے کان کے بالکل نیچے ایک بڑا س زخم تھا جیسے کوئی سرخ دھانہ کھلا ہوا ہو۔ اس کے نیلے کنارے دانتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور پلکوں سے جھانک کر دیکھا کہ چچا پیوتر کی زین سازوں کی چھری ان کے گھٹنے پر رکھی ہے اور اسی پر ان کا دھنا ہاتھ تھا جس کی انگلیاں مڑی تڑی اور سنولائی ہوئی تھیں۔ بایاں ہاتھ برف میں گرا ہوا تھا۔ ان کے پتلے دبلے جسم کے نیچے سے برف پگھلتی جا رہی تھی، سفید جھاگ سی برف میں پڑا ہوا جسم اس وقت بالکل بچوں کا سا لگ رہا تھا۔ ان کی داہنی طرف کو برف پر ایک عجیب وغریب سرخ ڈیزائن بن گیا تھا جو کسی پرندے کی طرح لگتا تھا۔ لیکن بائیں طرف بالکل صاف ستھری اور بے داغ تھی اور چکنی چکنی چمک رہی تھی۔ ان کا سر بڑے انکسار کے ساتھ ان کے سینے پر جھکا ہوا تھا اور جھکنے کی وجہ سے ان کی چھلے دار داڑھی سینے پر جھک گئی تھی۔ اور اس کے نیچے سے ایک بڑی سے پیتل کی صلیب دکھائی دے رہی تھی جس کے چاروں طرف خون کی دھاریں بہہ کر جم گئی تھیں۔ لوگوں کی آوازوں اور جمگھٹ سے میرا سر چکرانے لگا۔ پیتر وونا مسلسل چیخ رہی تھی۔ پولیس والے نے چیخ کر والٹی سے کہیں جانے کو کہا، نانا ابا چلا رہے تھے:

''دیکھو، دیکھو، کقدموں کے نشان نہ مٹنے پائیں!''

پھر وہ ایک دم سے چہرے پر بل ڈال کر اور نظریں جھکا کر پولیس والے سے بولے: ''آخر اس طرح چلانے سے کیا فائدہ افسر صاحب! یہ خدا کا کرنا ہے، خدا کا انصاف ہے اور آپ ہیں کہ اپنا انتظام کر رہے ہیں۔ تھو...و...، کیا لوگ ہیں!''

سب لوگ خاموش ہو کر اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بنانے لگے اور اس مرے ہوئے انسان کو غور سے دیکھنے لگے۔

احاطے سے اور پیتر وونا کے گھر کی طرف سے کچھ لوگ جھاڑیوں پر سے چڑھ چڑھ کر باغ میں دوڑے دوڑے آنے لگے، اس چپقلش میں بہت سے گر بھی پڑے اور بڑبڑانے لگے لیکن شور بالکل نہیں ہو رہا تھا یہاں تک کہ نانا ابا نے مڑ کر دیکھا اور عاجز ہو کر زور سے چیخے: ''ارے بھلے آدمیو! تمہیں شرم نہیں آتی، ساری رس بھری کی جھاڑیاں توڑے دے رہے ہو!''

نانی اماں میرے ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر چلی گئیں۔

''کیا کیا انہوں نے؟''میں نے پوچھا۔

''ارے تم نے دیکھا نہیں؟''وہ بھنبھناتی ہوئی بولیں۔

شام بھر اور رات گئے اجنبی لوگ باورچی خانے اور اس کے پاس والے کمرے میں آتے جاتے رہے۔ پولیس والے احکامات دیتے رہے اور ایک آدمی جو پادری سا لگتا تھا ایک نوٹ بک میں نوٹ کرتے کرتے بطخ کی طرح قین قین کرتا جاتا تھا:

''یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟''

نانی اماں نے سب کے لئے چائے بنائی۔ میز پر ایک موٹا سا، ماتا کے داغ والا مونچھیل بیٹھا چیں چیں کرتی ہوئی آواز میں کہتا جا رہا تھا:

''اس کا اصلی نام کسی کو معلوم نہیں، بس لوگوں کو اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ ایلاتما سے آیا دھا لیکن وہ جو گونگا تھا وہ ہماری آپ کی طرح تھا۔ اس نے سب بتا دیا اور اس تیسرے نے بھی قبول کر لیا۔ تیسرا آدمی بھی اس میں شریک تھا۔ یہ لوگ نہ جانے کب سے گرجوں سے چیزیں چرا رہے تھے۔ یہی ان کا خاص پیشہ تھا۔''

پیتروونا بولی''اے پروردگار!''وہ بالکل پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

میں تندور کے اوپر والے تختے پر لیٹا ان سب کو دیکھ رہا تھا اور مجھے یہ سب کے سب پستہ قد، موٹے اور بدہیت لگ رہے تھے۔

10

ایک بار ک، سنیچر کے دن سویرے سویرے میں پیتروونا کے باغ میں لال لال سینے والی گوریاں پکڑنے گیا۔ میں جال ڈالے دیر تک پڑا رہا۔ چڑیاں اکڑ اکڑ کے مزے میں پھدکتی پھرتیں مگر کسی طرح دام میں نہ آتیں۔ چڑیاں بڑے ٹھاٹ سے چاندی جیسی برف پر پھدکتیں اور مٹکتیں، پھر سے اڑتیں اور جھاڑیوں میں چھپ جاتیں، جھاڑیوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ جاتیں اور آنکھیں کھولتے ہوئے پھولوں کی طرح ہوا میں ہلکورے کھاتیں۔ ٹہنیوں سے برف کا غبار نیلگوں چنگاریوں کی طرح جھڑ جاتا۔ یہ تماشا اتنا پیارا، سہانا تھا کہ شکار کی ناکامی سے دل ذرا نہ بجھا۔ ویسے بھی میں کوئی ایسا جوشیلا شکاری نہ تھا۔ مجھے ہمیشہ شکار

سے زیادہ شکار کی تیاریوں اور اہتمام میں مزا آتا تھا۔ زیادہ لطف تو چڑیوں کو دیکھنے میں، ان کے بارے میں سوچنے میں آتا تھا۔

اس سے زیادہ لطف کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ مزے میں کسی برف پوش کھیت کے کنارے، جاڑے کے سناٹے میں بیٹھے ہیں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ سن رہے ہیں۔ کہیں دور سے بھاگتی ہوئی تروئیکا گاڑی کی گھنٹیوں کی گونج سنائی دے رہے۔ روسی جاڑے کے اس پرندے کا اداس نغمہ فضا میں تھرتھرا رہا ہے۔

جب میری ہڈیاں تک پالے سے ٹھٹھر گئیں اور لگا کہ کانوں کو پالا مار گیا تو میں جال سمیٹا اور پنجرے سنبھالے، چہار دیواری پھاند کر نانا کے باغ میں کودا اور گھر کا رخ کیا۔ پھاٹک کھلے ہوئے تھے۔ کوئی گرانڈیل اجڈ گنوار ایک بڑی سی بند برف گاڑی کے تینوں گھوڑوں کی لگام تھامے ہوئے تھا۔ گھوڑوں کے نتھنوں سے بھاپ کے بادل نکل رہے تھے۔ دیہاتی بڑے مزے میں مگن سیٹی بجا رہا تھا۔ میرا دل دھک سے ہوگیا۔

''کس کو لائے ہو تم؟''

وہ مڑا۔ اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مجھے دیکھا اور اچھل کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''پادری کو۔''

بھلا اس سے مجھے کیا لینا دینا۔ پادری ہے تو پھر کسی کرایہ دار کے ہاں آیا ہوگا۔

''چل بیٹے چل!'' دیہاتی چابک سے گھوڑوں کو چھیڑتے ہوئے چلایا۔ گھوڑے اچھل کر آگے بڑے اور فضا میں گھنٹیوں کی جھن جھن، جھن جھن تیر گئی۔ میں نے گھوڑوں کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں پھاٹک بند کیا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ جب میں باورچی خانے میں پہنچا تو مجھے اپنی ماں کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اچھا تو اب میں کیا کروں۔ پھندہ ڈال کر جھول جاؤں، ایں؟''

میں نے پنجرے پھینک دئے اور کوٹ اتارے بنا گلیارے میں بھاگا۔ وہاں نانا میاں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ انہوں نے میرے شانوں پر ہاتھ جمائے اور میرے چہرے کو وحشی آنکھوں سے دیکھا، بڑی تکلیف کے ساتھ تھوک گھونٹ کر ہانپتے ہوئے بولے:

''ماں آئی ہے تیری۔ جاوہاں جا! ٹھہر!'' انہوں نے مجھے اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ میری ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ انہوں نے مجھے کمرے میں دھکیل دیا: ''جا، جا!''

میں دروازے کو کریدتا رہا۔ ٹھٹھری اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے چٹخنی کھولے نہ کھل رہی تھی۔ آخر چٹخنی کھلی اور میں گم سم چوکھٹ پر کھڑا ہو گیا۔

''ارے یہ رہا...'' ماں بولیں۔ ''اوئی اللہ۔ کیسا لم ڈھینگا ہو گیا ہے! کیوں اب تو مجھے پہچانیگا بھی نہیں؟ ہائے ہائے ذرا کپڑے لئے تو دیکھو! اور لو دیکھو اس کے کان پالے سے ٹھٹھر گئے ہیں! ماں ذرا پھرتی سے بنس کی چربی تو دبجیو! جلدی ماں جلدی!''

ماں کمرے کے بیچوں بیچ مجھ پر جھکی رہیں۔ وہ میرے کپڑے اتارتی رہیں اور مجھے گیند کی طرح چاروں طرف لئے پھریں۔ ماں کا بھاری بھرکم جسم گرم لال لباس میں چھپا ہوا تھا، خوب ڈھیلا ڈھالا لباس، بالکل مردوں کے لبادے جیسا۔ بڑے بڑے کالے بٹنوں کی قطار شانے سے کمر تک ترچھی اترتی چلی گئی تھی اور پھر کمر سے بالکل دامن کے کنارے تک۔ میں نے ایسا لباس کاہیکو کبھی دیکھا ہوگا۔

مجھے ماں کا چہرہ پہلے سے چھوٹا نظر آیا، چھوٹا اور زیادہ سفید۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں اور گہری وہ گئی تھیں۔ بال کا رنگ اور سنہرا ہو گیا تھا۔ انہوں نے میرے کپڑے اتارا تار کرا لگ کونے میں پھینک دئے۔ پورے وقت ان کے سرخ ہونٹ مڑتے رہے اور ان کی تیز آواز گونجتی رہی:

''ارے چپ کیوں ہے؟ خوش ہے نا؟ ہے، ہے، کیسی چکٹ قمیص ہے...''

اس کے بعد ماں نے میرے کانوں پر بنس کی چربی ملی۔ میرے کان دکھ رہے تھے۔ پر ماں سے ایسی تازگی بخش، ایسی میٹھی خوشبو اٹھ رہی تھی کہ میرے کانوں کا درد بھی کم ہو گیا۔ میں ماں سے اور بھی زور سے لپٹ گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ جی کا کچھ عجیب حال تھا۔ مارے ہیجان کے زبان سے ایک لفظ بھی تو نہ نکلا... ماں کی باتوں کے ساتھ ساتھ مجھے نانی کی دبی دبی دکھی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''لونڈا بالکل ہاتھ سے گیا... نانا کا بھی تو ڈر نہیں رہا اس کے دل میں۔ آہ واریا، ارے واریا...''

''اب دکھڑا نہ رو اماں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا!''

ماں کے سامنے چاروں طرف ہر چیز بڑی حقیر، گھسی پٹی اور بے جان معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا

تھا کہ میں خود بوڑھا ہوں، نانا کی طرح بوڑھا۔ ماں نے مجھے گھٹنوں کے درمیان دباتے ہوئے اپنے گرم اور بھاری ہاتھوں سے میرے سر کو سہلاتے ہوئے زور سے کہا:

''بال کٹنے چاہئیں! اسکول جانا ہوگا! چاہتا ہے تو پڑھنا؟''

''تھوڑا اور پڑھنا چاہئے۔ ارے تو کتنا کڑیل چھوکرا ہے ایں؟''

ماں مجھ سے کھیلتے ہوئے ہنسیں۔ ان کی ہنسی میں بڑی گونج، بڑی گرمی تھی۔

نانا اندر آئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، آنکھیں لال انگارا۔ ماں نے مجھے ہلکے سے پرے دھکیل دیا اور زور سے پوچھا:

''کیوں ابا؟ تو پھر جائیں ایں؟''

نانا ابا کھڑکی کے پاس کھڑے ہو گئے اور ناخن سے شیشے پر برف کریدنے لگے اور منہ سے ایک لفظ نہ پھوٹے۔ فضا میں اتنا تناؤ پیدا ہو گیا کہ لگا جیسے میری آنکھیں اور کان پھیل رہے ہیں یہاں تک کہ میرا پورا وجود کانوں اور آنکھوں میں ڈوب کر رہ گیا۔ میرا سینہ پھولتا اور پھٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ چیخ پڑوں۔

''ایکسئی بھاگ جا یہاں سے'' نانا نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیوں؟'' ماں نے پھر مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''تم اب کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں اجازت نہیں دے سکتا۔''

ماں اٹھیں اور پورے کمرے میں ڈوبتے سورج کی سرخ روشنی میں نہاتے ہوئے بادل کی طرح تیرتی نظر آئیں۔

''سنو ابا...'' ماں نے نانا کے پیچھے رکتے ہوئے کہا۔

''خاموش!'' نانا نے مڑتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''ہاں میں اپنے اوپر چیخنے نہ دوں گی، نہیں'' ماں نے آہستہ سے کہا۔

''وروارا!'' نانی صوفے سے اٹھیں اور انگلی سے دھمکاتے ہوئے چلائیں۔

نانا بڑبڑاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے:

''ٹھہرو! میں ہوں کون؟ ایں؟ یہ سب کیا ہے؟ ہاں اسے کیا کہتے ہیں!''

یکا یک وہ مڑے اور بولے ''وروارا تو نے میری ناک کٹوا دی۔ ہاں تو نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا وروارا!''

''جا تو یہاں سے...'' نانی نے مجھے حکم دیا۔

میں بجھے ہوئے دل کے سات باورچی خانے میں گیا اور تندور پر چڑھ گیا۔ میں دیر تک دوسرے کمرے سے آتی ہوئی آوازیں سنتا رہا۔ کبھی سب کے سب ایک ساتھ بڑے جوش سے بولنے لگتے، کبھی سب چپ ہو جاتے، جیسے یکا یک سب کو نیند آ گئی ہو۔ وہ لوگ کسی بچے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ بچہ ماں کا تھا جسے وہ کسی کے ساتھ چھوڑ آئی تھیں۔ پر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نانا کیوں لال پیلے ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ ماں نے ان سے پوچھے بنا بچے کو جنم دیا یا اس لئے کہ وہ بچے کو کیوں ساتھ نہ لائیں۔

آخر نانا بھی باورچی خانے میں آ گئے، تمتمائے ہوئے اور پریشان حال، تھکے تھکے، نڈھال۔ ان کے پیچھے پیچھے نانی بھی آئیں۔ وہ کرتے کے دامن کے کونے سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ نانا سلسلا کر بنچ پر بیٹھ گئے۔ اور ہاتھوں کے سہارے جھکتے ہوئے سفید ہونٹ کاٹنے لگے۔ ان کا چہرہ بگڑ رہا تھا۔ نانی ان کے آگے گھٹنوں کے بل گر گئیں اور آہستہ آہستہ مگر بڑے جذباتی انداز میں بولیں:

''وروارا کے ابا، بیٹی کو معاف کر دو۔ یسوع مسیح کے نام پر بخش دو اسے! بڑی بڑی لحیم شحیم برف گاڑیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔ کیا بڑے بڑے شریفوں میں ایسے قصے نہیں ہوتے، سوداگروں کے ایسے گل نہیں کھلتے کیا؟ ذرا دیکھو تو۔ کیسی عورت ہے! معاف کر دو اسے وروارا کے ابا، تم جانو ہم میں کوئی فرشتہ نہیں...''

نانا دیوار پر اڑ گئے اور نانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بڑبڑائے:

''اوہ، ہاں بے شک! کیوں نہیں؟ تم تو کسی کو بھی معاف کر دوں گی! تم تو کچھ بھی معاف کر سکتی ہو۔ آخ! تھو...و...و، کیا لوگ ہیں!''

پھر وہ نانی کی طرف جھکے۔ انہوں نے نانی کے شانے پکڑے اور انہیں زور سے جھٹکے دئے۔

''اور خدا؟ پروردگار تو نہیں معاف کرتا نا؟ دیکھ لو، ہم قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں، اور دیکھو کیسی سزا مل رہی ہے ہمیں۔ زندگی کے آخری دن ہیں، ذرا چین نہیں، خوشی کی ایک کرن نہیں۔ نہ امید! اور ہاں گرہ سے باندھ رکھو میری بات۔ دیکھ لینا ہم بھیک مانگیں گے، بھیک!''

نانی نے نانا کے ہاتھ اپنی مٹھیوں میں لئے اور ان کے پہلو میں بیٹھتے ہوے دھیرے سے ہنسیں۔

''تو کیا ہوا؟ تم بھکاری بننے سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ اچھا تو بھکاری ہی سہی! دیکھو تم بیٹھو گھر اور میں جاؤں گی در در۔ کوئی مجھے خالی ہاتھ چلتا نہ کرے گا۔ ہم بھوکوں نہیں مریں گے۔ چھوڑو یہ سب! کیوں جی ہلکان کرو، بیکار!''

یکا یک وہ کھنکارے اور بکرے کی طرح سر گھمایا، نانی کی گردن میں بازو ڈالے اور زور سے چمٹ گئے۔ وہ اس وقت بہت ہی دبے کچلے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے نانی اماں کے بازوؤں میں کھو سے گئے۔

''بیوقوف! ارے بیوقوف، اللہ کی رحمت ہو تجھ پر! بس تو ہی تو ایک دوست رہ گئی ہے میرے پاس! تو نادان ہے، تو کچھ نہیں سمجھتی۔ تو تو بس چلے تو اپنا سب کچھ لٹا دے۔ یاد ہے، ہم نے اپنے بچوں کی خاطر کس طرح کام کیا، میں نے ان کی خاطر کتنے پاپ کئے! اور اب دیکھو انجام۔ اپنے پاس ایک کوڑی نہیں، کچھ بھی نہیں...''

یہ سن کر میں برداشت نہ کر سکا۔ میں تندور سے کودا اور ان کے پہلو میں جا گرا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں خوشی سے سسکیاں لے رہا تھا کہ لو ماں آ گئیں۔ میں خوش تھا کہ دونوں اتنی محبت سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھ اپنا دکھ سکھ بٹا رہے تھے، دونوں مجھے چمکار رہے تھے، گلے لگا رہے تھے، اپنے آنسوؤں کی برسات میں مجھے نہلائے دے رہے تھے۔

''ارے شیطان، اچھا تو بھی یہاں موجود ہے'' نانا نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تیری ماں آ گئی۔ اب تجھے مجھ سے بھلا کیا کام۔ نانا، بڑھا خناس، ایں؟ اب نانی میں بھی کیا رکھا ہے۔ بڑھیا بکو... جو تجھے بگاڑنے کے سوا اور کوئی نیک کام جانتی ہی نہیں۔ تھو... و... و، کیا لوگ ہیں!''

انہوں نے ہمیں ہاتھ سے الگ کیا اور خود اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہر شخص ہمیں چھوڑ رہا ہے، ہر شخص ہم سے دور بھاگنا چاہتا ہے... سب کو اپنی اپنی پڑی ہے... خیر بلاؤ اس کو!'' انہوں نے سنک کر کہا۔ ''جلدی کرو۔''

نانی اماں باورچی خانے سے نکلیں اور نانا یسوع مسیح کی شبیہہ کے پاس گئے۔

''اے رحیم و کریم، اے پروردگار۔ ذرا دیکھ۔ دیکھ تو سہی یہ کیا ہو رہا ہے!''

وہ سر جھکاتے ہوئے بڑبڑائے اور سینے پر دوھتڑ مارا۔ مجھے یہ بات ذرا نہ جچی۔ ویسے عام طور پر خدا سے ان کے بات کرنے کا انداز مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ خدا کے سامنے ایسی دون کی جو لیتے تھے۔

ماں باورچی خانے میں آئیں۔ ان کے سرخ لباس کی روشنی نے کمرے کو منور کر دیا۔ وہ بنچ پر بیٹھیں اور ان کے پہلو میں نانا نانی۔ ماں کی ڈھیلی ڈھالی آستینیں ماں باپ کے شانوں پر جھول رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ ماں کی باتیں سنتے رہے۔ دونوں ماں کے پہلو میں اتنے ننھے منے سے لگ رہے تھے کہ لگتا تھا وہی ماں ہیں اور یہ دونوں ان کے بچے۔

دل کے طوفان نے مجھے تھکا دیا اور میں تخت پر پڑ کر سو گیا۔

اس دن شام کو بڑے میاں اور بڑی بینے اپنے زرق برق لباس پہنے اور گرجا گھر عبادت کو سدھارے۔ نانی نے چہکتے ہوئے نانا کی طرف آنکھ ماری جو ریچھ کی کھال کا کوٹ اور برجس پہنے ہوئے تھے۔ آنکھ ماری اور بولیں:

''ذرا دیکھنا کیا دھلا دھلایا بکرا ہے تیرا باپ!'' انہوں نے ماں کی کہنی مارتے ہوئے کہا۔

ماں نے خوش ہو کر قہقہہ لگایا۔

جب میں اور ماں کمرے میں اکیلے رہ گئے تو وہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھیں اور صوفے کو تھپتھپاتے وہئے مجھے پاس بلایا:

''یہاں آ ر، بیٹھ تو ذرا۔ بتا کیا حال ہے؟ حال پتلا ہے، ایں؟''

ہاں کیا حال تھا؟

''مجھے کیا معلوم۔''

''کیوں نانا خوب پٹائی کرتے ہیں نا؟''

''اب اتنا زیادہ نہیں کرتے۔''

''سچ؟ کچھ کہہ، کچھ بول، جو جی چاہے بتا۔''

میں نانا کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ سو میں نے کہنا شروع کیا اس کمرے میں ایک بھلا مانس رہتا تھا۔ بڑا اچھا آدمی تھا وہ۔ پر وہ کسی کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ نانا نے تو آخر اسے نکال باہر کیا۔ میں سمجھ گیا کہ ماں کے دل کو یہ کہانی کوئی خاص لگی نہیں۔ اور وہ بولیں:

''کچھ اور سناؤ!''

میں نے تین چھوٹے بچوں کا قصہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ کرنل بہادر نے کس طرح مجھے احاطے سے نکال باہر کیا تھا۔

ماں نے مجھے گلے لگایا اور بولیں:

''بڑا برا آدمی تھا۔''

پھر وہ خاموش ہو گئیں اور آنکھیں میچ کر فرش کو غور سے دیکھتی اور سر ہلاتی رہیں۔

''نانا تم سے اتنے خفا کیوں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''قصور میرا ہے۔''

''تم بچے کو ان کے پاس لے آتیں تو...''

وہ چونک گئیں، ان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگیں۔ پھر انہوں نے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر مجھے چمٹا لیا۔

''بیوقوف، بھولا! پر خبردار جو پھر یہ بات زبان پر لایا، سنا؟ خبردار۔ زبان بالکل بند رکھ۔ اس کے بارے میں سوچ بھی مت!''

کچھ دیر تک وہ بولتی رہیں، آہستہ آہستہ۔ ان کی باتیں دل کو کاٹنے والی تھیں اور سمجھ میں نہ آنے والی۔ وہ انگلی سے ٹھوڑی کو گدا گدا رہی تھیں۔ ان کی گھنی بھوئیں آہستہ آہستہ لرز رہی تھیں۔

ایک موم بتی میز پر جل رہی تھی، موم پگھل رہی تھی اور اس کا عکس آئینے میں جھلملا رہا تھا۔ فرش پر میلی پرچھائیاں رینگ رہی تھیں، کونے میں یسوع مسیح والا چراغ جل رہا تھا اور یخ بستہ کھڑکی میں چاندنی نے ٹھنڈی آگ لگا دی تھی۔ ماں کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں جیسے خالی دیواروں اور چھت پر کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔

''تو سوتا کب ہے؟''

''تھوڑی دیر بعد۔''

''ٹھیک ہے آج سہ پہر کو تو سویا بھی ہے'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''کیا تم یہاں سے چلی جاؤ گی؟''

''کہاں جاؤں گی؟'' انہوں نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔ انہوں میرا سر اٹھایا اور اتنی دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہیں کہ میرے آنسو چھلک پڑے۔

''ارے تو روتا کیوں ہے؟''

''گردن دکھ رہی ہے۔''

لیکن سچ مچ میرا دل زیادہ دکھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ وہ ضرور چلی جائیں گی...

''دیکھنا تو اپنے باپ پر جائے گا'' انہوں نے دری کو پیر سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''نانی نے تجھے باپ کے بارے میں تو ضرور بتایا ہوگا؟''

''ہاں۔''

''ہاں اماں تیرے باپ پر جان دیتی تھیں۔ بہت چاہتی تھیں۔ اور وہ بھی نانی کو بہت چاہتے تھے...''

'جانتا ہوں۔''

ماں نے موم بتی کو دیکھا، ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے موم بتی بجھا دی۔

''ایسے ٹھیک ہے...'' انہوں نے کہا۔

موم بتی بجھ گئی تو لگا کمرے میں تازہ اور صاف ہوا آ رہی ہے۔ فرش پر جو گھناؤنی پرچھائیاں تیر رہی تھیں ان کی جگہ نیلی چاندنی کے گل بوٹے چمک اٹھے اور کھڑکی کے شیشے پر سنہرے سائے جھلملانے لگے۔

''تم یہاں آنے سے پہلے کہاں رہتی تھیں؟''

انہوں نے چند شہروں کے نام بتائے، کچھ اس طرح جیسے بھولی بسری باتیں یاد کر رہی ہوں۔ پورے وقت وہ کمرے کے چکر لگاتی رہیں۔

''یہ لباس تمہیں کہاں ملا؟''

''میں نے خود بنایا ہے۔ میں اپنا سارا کام خود کرتی ہوں۔''

یہ دیکھ کر میرا جی کھلا جا رہا تھا کہ وہ اوروں کی طرح نہیں ہیں، وہ کچھ اور ہیں۔ لیکن وہ اتنا کم بولتی

تھیں۔کہ میرا دل بیٹھا جارہا تھا۔اگر میں کچھ نہ پوچھتا تو وہ بھی کچھ نہ کہتیں۔

ایک بار پھر وہ میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئیں۔ہم چپ چاپ ویسے ہی بیٹھے رہے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے۔ہم اس وقت تک اسی طرح بیٹھے رہے جب تک کہ بڑے میاں اور بڑی بی نہ آ گئے۔ان کے جسم سے موم بتی اور لوبان کی خوشبو آ رہی تھی۔وہ بڑے گمبھیر اور بھلے مانس نظر آ رہے تھے۔

کھانے پر بھی یہی گمبھیرتا اور خاموشی چھائی رہی۔ہم بہت کم بولے۔بولے تو بہت سنبھل کر بولے۔جیسے اندیشہ ہو کہ کہیں ہماری باتوں سے کسی کی ہلکی نیند نہ اچٹ جائے۔

جلد ہی ماں نے میری ''غیر مذہبی'' تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔وہ میرے لئے چند کتابیں لے آئیں۔ان میں ان ایک تھی ''روسی کا قاعدہ''۔اس کتاب سے میں نے چند ہی دن میں حروف تہجی سیکھ لئے۔لیکن ماں فوراً مجھے زبانی شاعری یاد کروانے پر اتارو ہو گئیں۔اس طرح ایک دوسرے کی دل آزاری کا دھندا شروع ہوا۔

شعر اتھا:

راستہ پیچ وخم کھاتا ہوا جس کی نہیں انتہا
خدا کے کھیتوں میں دوڑتا ہوا راستہ
جسے پھاوڑوں اور کدالوں نے نہیں کاٹا
نرم راستہ، گرد وغبار سے آتا ہوا راستہ

میں ''خم'' کی جگہ ''غم'' کہتا تھا۔

''پر ذرا سوچ تو راستہ ''غم'' کیسے کھا سکتا ہے'' ماں احتجاج کرتیں۔''بیوقوف! ''خم'' کہہ ''خم''... ہاں ''خم'' کہنا پڑے گا تجھے!''

میں سمجھ گیا مگر وہی ''غم'' کی رٹ لگائے رہا۔میں اپنی اس غلط رٹ پر خود ہی حیران اور پریشان تھا۔

ماں کو غصہ آ گیا۔انہوں نے کہا کہ میں ہٹی اور احمق ہوں۔یہ بہت ہی تکلیف دہ الزام تھا مجھ پر۔ اور میں نے ان منحوس شعروں کو یاد کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔دل ہی دل میں تو میں سارے شعر بغیر غلطی کے پڑھ لیتا۔پر جب زبانی سنانے کی باری آتی تو میں لفظوں کو گڈمڈ کر کے رکھ دیتا۔مجھے ان

شعروں سے نفرت ہوگئی جو کسی طرح اپنے قابو ہی میں نہ آتے تھے۔ میں چڑ گیا اور اب جان بوجھ کر ان کو بگاڑ کر پڑھنے لگا، ہم قافیہ لفظ چن چن کر پورا پورا انبار لگا دیتا۔ شعر جتنے بے معنی ہوتے اتنا ہی میرا جی خوش ہوتا۔

لیکن یہ تفریح خاصی گراں پڑی۔ ایک دن پڑھائی خاصی کامیاب رہی۔ آخر میں ماں نے کہا وہ شعر سناؤ۔ اور میں بے اختیار شعر یوں پڑھ گیا:

رستہ، خستہ پیچ وخم کھاتا ہوا،

جس کی نہیں ابتدا

لیکن جب تک جب تک مجھے پتہ چلے کہ کیا ہو رہا ہے تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ماں میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے کھڑی ہوگئیں اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں:

''یہ کہاں سیکھا تو نے؟''

''یہ کہاں جانوں'' میرے دل پر چوٹ لگی۔

''ہاں تو جانتا ہے! بتا مجھے!''

''بس یونہی کیا؟''

''یونہی تفریح کے لئے۔''

''جا وہاں کونے میں کھڑا ہو جا۔''

''کیوں؟''

''کونے میں!'' انہوں نے دھمکی کے انداز میں دوہرایا۔

''کس کونے میں؟''

انہوں نے جواب نہیں دیا لیکن مجھے ایسی نظروں سے گھور کر دیکھا کہ میری سٹی گم ہوگئی۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کر کیا رہا ہوں اور وہ چاہتی کیا ہیں۔ مقدس شبیہہ والے کونے میں ایک گول میز تھی جس پر گلدان رکھا تھا۔ گلدان خوشبودار خشک پھولوں اور گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں صندوق تھا جو غالیچے سے ڈھکا ہوا تھا۔ تیسرے کونے میں پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اور چوتھے کونے میں دروازہ تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم چاہتی کیا ہو؟'' میں نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کی اور بوکھلا کر

بولا۔

''وہ کرسی میں دھنس گئیں اور خاموشی سے بھوؤں اور رخساروں کو ملنے لگیں۔

''تجھے نانا ابا نے کونے میں کھڑا کیا ہے کہ نہیں؟''

''کب؟''

''کبھی بھی!'' انہوں نے دو بار میز پر مکہ مارتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''نہیں، مجھے تو یاد نہیں آتا۔''

''تو جانتا ہے یا نہیں۔ کونے میں کھڑا کرنا سزا ہے؟''

''نہیں۔ کیوں کیا یہ سزا ہے؟''

انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اف! ادھر آ۔''

''تم چیخ کیوں رہی ہو مجھ پر؟'' میں نے پاس جاتے ہوئے کہا۔

''اور تو جان بوجھ کر شعر کو بگاڑتا کیوں ہے؟''

میں نے صفائی دی کہ جب میں آنکھ بند کر کے شعر یاد کرتا ہوں تو جیسے شعر ہوتے ہیں ویسے ہی یاد آتے ہیں۔ مگر جب زور سے پڑھتا ہوں تو دوسرے بول نکل پڑتے ہیں منہ سے، کیا کروں؟

''بن رہا ہے ایں؟''

نہیں'' میں نے جواب دیا۔ لیکن اسی آن خیال آیا ''کون جانے شاید بن ہی رہا ہوں؟'' یکا یک میں نے اطمینان سے شعر پڑھنا شروع کئے اور سب صحیح۔ میں حیران رہ گیا۔ میرا دل بھر آیا۔

مجھے لگا جیسے میرا منہ سرخ ہو رہا تھا اور کان جل رہے ہیں۔ میں ماں کے سامنے کھڑا تھا، شرم سے پانی پانی، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے آنسوؤں کے پردے سے دیکھا۔ ماں کا چہرہ مایوسی سے بجھ گیا، ان کے ہونٹ بھنچ گئے، بھوئیں جھک گئیں۔

''اس کا کیا مطلب؟'' انہوں نے ایک عجیب آواز سے پوچھا۔ ''اچھا تو معلوم ہوتا ہے تو سچ مچ بن رہا تھا؟''

''کون جانے۔ میں یہ چاہتا نہ تھا...''

''تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ تجھ سے نبٹنا جان جوکھوں کام ہے'' انہوں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''جا بھاگ جا!''

انہوں نے مجھے اور زیادہ شعر یاد کرنے کو دینا شروع کئے مگر میرے دماغ نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان مترنم مصرعوں کو بگاڑنے اور ان میں الٹے سلٹے لفظ جوڑنے کی خواہش زور پکڑتی چلی گئی۔ اس میں مجھے کوئی مشکل نہ ہوتی۔ ناخوشگوار لفظوں کا دریا چڑھتا چلا آتا۔ ناخوشگوار لفظ بڑی تیزی سے اصلی لفظوں کی جگہ جمتے چلے جاتے۔ اکثر تو ایسا ہوتا کہ پورا پورا مصرعہ میں یاد کرنے کی، رٹنے کی کوشش کرتا اور وہ کسی طرح دماغ میں نہ جمتے۔ میرے خیال میں شہزادے ویاز یمسکی کا شکوہ نامہ خاص طور پر بڑا زبردست دردسر بن گیا:

صبح سے شام تک
بیوائیں، یتیم،
بوڑھے نزار
کاسہ گدائی لئے
در تو نگر پہ بھیک مانگتے ہیں

آخری دو مصرعے میں ہمیشہ پوری ثابت قدمی سے گول کر جاتا۔ آخر ہار کر انہوں نے نانا سے شکایت کی کہ اس کی یاد بڑی خراب ہے۔

''بگڑ گیا ہے، بالکل ہاتھ سے جاتا رہا!'' نانا نے خفا ہو کر کہا۔ ''اس کی یادداد کو کچھ نہیں ہوا۔ اس کو ساری دعائیں مجھ سے بہتر فر فر یاد ہیں۔ اس کی یاد تو پتھر کی طرح ہے۔ ایک بار جو لکیر پڑ جائے تو مٹائے نہ مٹے۔ ذرا اس کی مرمت کرو!''

نانی نے بھی نانا کی رائے پر مہر لگا دی:

''اس کو جادو ٹونے کی کہانیاں اور گیت خوب یاد ہیں۔ اور گیت اور شاعری میں فرق کون سا ہے!''

یہ سب سچ تھا۔ اور میرا دل مجھے ہی قصوروار ٹھہراتا تھا۔ لیکن جیسے ہی میں شعر یاد کرنے کی کوشش کرتا دوسرے لفظ تل چٹوں کی طرح رینگتے ہوئے آتے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے:

صبح سے شام تک، ہمارے پھاٹک پر
لنگڑے لولے یتیم و نادار ہیں کہ آتے ہی چلے جاتے ہیں
روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، سر پٹکتے ہیں روٹی کے لے
روٹی لے کر وہ جاتے ہیں، پیتر وونا کے یہاں
بیچتے ہیں روٹی اور خریدتے ہیں گائے
پھر شراب پی کر مچاتے ہیں دھومیں
صبح سے شام تک

رات کے وقت نانی کے پاس لیٹ کر میں کتاب کے یاد کئے ہوئے اور اپنے بنائے ہوئے شعر سناتا۔ کبھی کبھی تو وہ ہنس پڑتیں۔ مگر زیادہ تر میری خوب خبر لیتیں:

''دیکھ، تو کیا نہیں کر سکتا۔ پر بھکاریوں پر پھبتی اچھی نہیں۔ یسوع مسیح فقیر تھے اور تمام سنت سادھو بھی...''

میں بڑبڑاتا:

نفرت ہے مجھے بھکاریوں سے
اور نانا سے بھی
اے خدا تو ہی بچا
میں کیا کروں کس طرح جان بچاؤں
کس طرح بچوں نانا کے ڈنڈوں سے؟

''ارے تیری زبان میں کیڑے پڑیں نگوڑے مونڈی کاٹے!'' نانی کہتیں۔ ''نانا ابا کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو؟''

''پڑنے دو!''

''آخر تو ہر وقت اپنی ماں کا دل کیوں کڑھاتا رہتا ہے؟ ویسے ہی اس کا جی جلا ہوا ہے۔ اس پر تو جلے پھپھولوں پر نمک چھڑکتا رہتا ہے'' نانی بڑی نرمی سے مجھے سمجھاتیں بجھاتیں۔

''کیوں دل جلا ہوا کیوں ہے ماں کا؟''

''بند کر چپڑ چپڑ! تیرے بھیجے میں یہ باتیں کیا آئیں گی!''

''جانتا ہوں، یہ سب کی...''

''میں کہتی ہوں زبان بند رکھ!''

میرا جی بہت کڑھتا۔ دل بھر آتا۔ مگر نہ جانے کیوں میں اپنے دل کی بات چھپا جاتا۔ میں نڈر اور سرکش بنتا چلا گیا۔ میری ماں کا سبق بڑھتا چلا گیا اور ساتھ ہی میرا درد سر بھی۔ حساب میں مجھے کوئی مشکل نہ ہوتی۔ لیکن مجھ سے گرامر کا روگ کسی طرح پالا نہ جاتا۔ جس بات سے میرا سینہ شق ہوتا تھا یہ تھی کہ نانا کے گھر میں ماں کس طرح دبی کچلی ہوئی زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ روز بروز بجھتی چلی گئیں، وہ ہر شخص کو اجنبی نظروں سے دیکھتیں۔ گھنٹوں کھڑکی پر بیٹھی باغ میں دیکھتی رہتیں۔ ان پر خزان چھا رہی تھی۔ یہاں آنے کے بعد شروع کے چند دن تو ان کے اندر بجلی سی دوڑتی رہی۔ وہ خوش اور مگن رہیں۔ لیکن اب ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ ہالے سے پڑ گئے تھے۔ وہ اپنے کپڑے، سنگار بناؤ کی بھی پروانہ کرتیں۔ وہ دن دن بھر ملے دلے بلاؤز میں بھٹکتی رہتیں، بال شانے کو ترستے رہتے۔ ان کو اتنا بے رنگ اور بجھا بجھا دیکھ کر میرا دل بہت کڑھتا۔ ان کو تو صاف ستھرا، لئے دئے اور خوبصورت نظر آنا چاہئے تھا، ان کو تو دنیا کی سب سے حسین ہستی ہونا تھا۔

سبق دیتے وقت وہ مجھ سے آگے کہیں دور، کھڑکی سے باہر دیکھتی رہتیں یا دیوار پر نظر دوڑاتی رہتیں۔ ان کے سوال تھکی تھکی آواز میں سنائی دیتے۔ وہ میرا جواب سننا بھی بھول جاتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتیں، مجھ پر خوب گرجتیں برستیں۔ اس سے بھی میرا دل خون ہوتا۔ ماں کو تو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نیک ہونا چاہئے، زیادہ انصاف سے کام لینا چاہئے، جس طرح جن پریوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔

کبھی کبھی میں ان سے پوچھتا؛

''کیا تم ہم سے خفا ہو؟''

''اپنے کام سے کام رکھ'' وہ تڑخ کر جواب دیتیں۔

میں نے یہ بھی بھانپ لیا کہ نانا کوئی کھچڑی پکا رہے ہیں جس سے نانی اور ماں دونوں خوف زدہ ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نانا ماں کے کمرے میں بند ہو جاتے اور چیختے بالکل گڈریے نیکا نور کی بانسری کی

طرح۔ایک بار میری ماں اتنے زور سے چیخیں کہ گھر بھر نے ان کی آواز سنی:

''یہ کبھی نہیں ہوسکتا، کبھی نہیں!''

ماں نے زور سے دروازہ کھول دیا اور نانا دھاڑے۔

شام کا وقت تھا۔ نانی باورچی خانے میں بیٹھی نانا کی قمیص سی رہی تھیں۔ وہ قمیص سیتی جاتی تھیں اور بڑبڑاتی جاتی تھیں۔ جب دروازہ بھڑ سے بند ہوا تو نانی بولیں:

''خدایا! لو وہ تو کرایہ داروں کے پاس چلی گئی!''

یکا یک نانا باورچی خانے میں دوڑے ہوئے آئے اور نانی کے سر پر گھونسہ مار کر اپنے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے پھنکارے:

''تو منہ بند رکھنا کب سیکھیگی بڑھیا ڈائن؟''

''تم سٹھیا گئے ہو'' نانی بڑے دھیرج سے بال ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔''تم اس بھرے میں ہو کہ میں زبان پر تالا ڈال دو گے اور میں چپ رہوں گی؟ خاطر جمع رکھو میں جب کبھی تمہارے ارادے بھانپوں گی اسے ضرور بتاؤں گی...''

نانا ٹوٹ پڑے نانی پر اور ان کی گردن مڑوڑنے لگے۔ نانی نے بچاؤ نہ کیا لیکن بولتی رہیں:

''مار، مجھے مار تو، بیوقوف! اور مار، جان لے لے!''

میں تندور کے اوپر والے تختے پر بیٹھا تھا۔ وہیں سے میں نے نانا پر تکیے، کمبل اور جوتے پھینکنا شروع کئے۔ لیکن غصے کا بھوت کچھ اس طرح سوار تھا کہ ان کے کانوں پر جوں تک نہ ریں گی۔ نانی فرش پر گر پڑیں۔ نانا ان کے سر کو ٹھوکر لگاتے رہے۔ ٹھوکر لگاتے لگاتے آخر وہ خود گر پڑے اور گرتے گرتے پانی کی بھری بالٹی الٹ دی۔ نانا تھوکتے کھنکارتے ہوئے اچھل کھڑے ہوئے۔ وہ وحشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باورچی خانے سے نکلے اور دوچھتی میں اپنے کمرے تک بھاگتے چلے گئے۔ نانی کراہتی ہوئی اٹھیں اور بنچ پر بیٹھ کر اپنے الجھے بال سلجھانے لگیں۔ میں تختے سے کود کر نیچے آ گیا۔

''یہ سارے تکیے اور چیزیں اٹھا اور تندور پر رکھ'' نانی نے غصے میں کہا۔''خوب تماشا ہے، تکیے پھینکے جا رہے ہیں چاروں طرف۔ اپنے کام سے کام رکھنا سیکھ! اور ذرا دیکھو۔ وہ بڈھا بھی کس طرح آپے سے باہر ہوا ہے ہونہہ!''

یکا یک ان کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''ذرا دیکھنا تو یہاں''انہوں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔''کیا ہے،دکھ کیوں رہا ہے؟''

میں نے ان کے بال جو اٹھائے تو کیا دیکھتا ہوں کہ بالوں کا کانٹا گدی میں پیوست ہے۔میں نے کانٹا نوچ لیا۔دیکھتا کیا ہوں کہ دوسرا کانٹا بھی اسی طرح چبھا ہوا ہے۔میری تو جان نکل گئی۔

''ماں کو بلا لاؤں''میں نے کہا''میں ڈرتا ہوں!'

''کیا کہا۔ماں کو بلا لاؤں؟''وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلائیں۔''خدا کا شکر ادا کر کہ اس نے یہ تماشا نہیں دیکھا اور تو اسے بلائے گا۔بھاگ جا یہاں سے!''

انہوں نے لیس بنانے والوں کی چستی سے کام لیتے ہوئے خود ہی اپنے کالے بالوں میں انگلیاں گڑو دیں اور کانٹے کو ٹٹولنے لگیں۔میں نے دانت پیس کر ہمت کی اور دو اور کانٹے نکالنے میں نانی کا ہاتھ بٹایا۔

''دیکھ رہا ہے ایں؟''

''بس یونہی!کل حمام گرم گروں گی،سر دھوؤں گی اور سارا درد ہوا ہو جائے گا۔پر ماں سے کہتے مت پھریو۔میری جان میرے کبوتر،اوں؟''انہوں نے بڑی نرمی سے مجھے چمکارا۔''ویسے ہی وہ ایک دوسرے کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔کہنا مت۔اوں؟''

''نہیں۔''

''بھولنا مت،ہاں!اچھا اب آؤ ہم یہاں سب ٹھیک ٹھاک کر دیں۔دیکھنا ذرا میرے منہ پر تو کوئی خراش وراش نہیں؟بس تو ٹھیک ہے۔''

انہوں نے فرش صاف کرنا شروع کیا اور میں نے دل کی گہرائی سے کہا:

''تم تو ولی ہو ولی۔لوگ تمہیں پیٹتے ہیں،ٹھوکریں لگاتے ہیں اور تم کچھ بھی تو نہیں کہتیں!''

''یہ کیا بات ہوئی،حماقت!ولی اونہہ!واہ ولی ڈھونڈنے کی تجھے سوجھی بھی کہاں سوجھی؟''

وہ دیر تک بڑبڑاتی رہیں اور چاروں ہاتھ پاؤں کے بل رینگتی رہیں میں چوکھٹ پر بیٹھا نقشہ بنا رہا تھا کہ نانی کا انتقام نانا سے کس طرح لیا جائے۔

نانا نے پہلی بار میری آنکھوں کے سامنے نانی کو اتنی بری طرح مارا پیٹا تھا۔شام کے دھندلکے میں

مجھے ان کا سرخ چہرہ تیرتا اور ان کے آگے جیسے بال اڑتے نظر آئے۔ میرا جی جل بھن کر کباب ہو رہا تھا۔ دل بہت اداس ہو گیا کہ انتقام کی کوئی مناسب تدبیر نہیں سوجھی۔

دو دن بعد جو میں ان کی دوچھتی میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نانا ایک کھلے ہوئے صندوق کے سامنے بیٹھے ہیں اور کاغذات الٹ پلٹ کر رہے ہیں۔ ان کے پاس ہی ان کی ولیوں والی محبوب جنتری رکھی ہوئی تھی۔ بھوری رنگ کے بھاری کاغذ کے بارہ تختے جن پر مہینوں کے دنوں کے خانے بنے ہوئے تھے اور خانوں میں ولیوں کی شبیہیں تھیں۔ نانا کو یہ جنتری جان سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ مجھے یہ جنتری اس وقت دکھاتے تھے جب خلاف معمول مجھ سے بہت زیادہ خوش ہوتے تھے۔ اور یہ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ میں ان بھوری بھوری تصویروں کو کچھ عجیب جذبات کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ میں ان میں سے بعض ولیوں کی زندگی کا حال جانتا تھا: کیریک اور اولیتا، شہید وروارا، پنتیلیمون، وغیرہ وغیرہ! خاص طور پر ولی الیکسئی کی الم ناک زندگی کا میرے دل پر بڑا اثر تھا۔ میری نانی نے ان کے بارے میں جو شاندار نظمیں سنائی تھیں دل میں گھر کر گئی تھی کہ ہمیشہ لوگ شہادت کا جام پیتے رہے ہیں۔

لیکن اب میں نے اس جنتری کے پرزے اڑانے کی ٹھان لی۔ جب نانا کھڑکی کے پاس گئے اور ایک نیلے کاغذ کو پڑھنے میں محو ہو گئے جس پر عقاب بنے ہوئے تھے تو میں نے جھپٹ کر کئی تختے دبوچے اور زینے پر یہ جا وہ جا، نانی کی میز سے قینچی اڑائی، اچھل کر تندور پر چڑھا اور ولیوں کے سر چھٹا چھٹ قلم کرنے لگا۔ جب میں نے ایک صف کی گردنیں اڑا دیں تو میرا دل بھر آیا۔ اس لئے میں خانوں کی لکیروں کے کنارے کنارے کاٹنا شروع کیا۔ ابھی میں نے یہ خانے کاٹے بھی نہیں تھے کہ دروازے پر نانا آن دھمکے۔

''تجھے جنتری چھونے کی اجازت کس نے دی؟'' انہوں نے پوچھا۔

اچانک ان کی نظر ان چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑوں پر پڑی جو تندور پر بکھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے جھپٹ کر ٹکڑے اٹھا لئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کو دیکھا۔ اب ان پر کھلا کہ اصل میں کیا گل کھل رہے ہیں۔ ان کا چہرہ بگڑ گیا اور داڑھی لرزنے لگی۔ انہوں نے اتنے زور سے سانس لی کہ کاغذ کے ٹکڑے پھر پھراڑنے لگے۔

''یہ تو نے کیا کیا ایں؟'' آخر کار وہ چنگھاڑے اور میری ٹانگ پکڑ کر مجھے تندور سے کھینچنے لگے۔ میں

بالکل ہوا میں قلابازی کھا گیا۔لیکن نانی مجھے تھام لیا۔

''مار ڈالوں گا!'' نانا چلائے اور میرا اور نانی دونوں کا کچومر نکالنے لگے۔

یکا یک اماں آ گئیں۔ میں اچھل کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرے آگے ڈھال بنی کھڑی تھیں۔ انہوں ن ے نانا ابا کے مکوں کو روکتے ہوئے ڈانٹ کر کہا:

''یہ کیا تماشا ہے؟ آپے میں آؤ!''

''میں مارا گیا!'' نانا کھڑکی کے پاس بنچ پر گر پڑے اور فریاد کی۔''تم سب میرے خلاف ادھار کھائے بیٹھے ہو۔تم سب!''

''تمہیں یہ تماشا کرتے شرم نہیں آتی؟'' اماں نے ہلکی آواز میں کہا۔

نانا چنگھاڑے اور بنچ پر پیر پٹکنے لگے۔ان کی آنکھیں بند تھیں اور داڑھی کچھ عجیب مضحکہ خیز ڈھنگ سے چھت کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ واقعی میری ماں کے سامنے یہ تماشا رچانے پر شرم سے پانی پانی ہوتے جا رہے ہیں۔اسی وجہ سے تو انہوں نے آنکھیں کس کے بند کر رکھی تھیں۔

''میں ان ٹکڑوں کو کپڑوں پر چپکا دوں۔ پھر آپ کی جنتری پہلے سے بھی زیادہ کراری ہو جائے گی'' ماں نے کاغذ کے تختوں کو برابر کرتے ہوئے کہا۔''دیکھو کیسا تڑامڑا کاغذ ہے، بالکل کوچا، ایں؟''

ماں اسی لہجے میں بات کر رہی تھیں جس لہجے میں وہ مجھ سے سبق کے وقت بات کرتی تھیں جب ان کی باتیں سر کے اوپر سے گذر جاتی تھیں۔ یکا یک نانا اٹھے اور انہوں نے بڑے جاہ وجلال سے اپنی قمیص درست کی، جیکٹ برابر کی، گلا صاف کیا اور بولے:

''اچھا۔دیکھنا۔سب آج کے آج چپک جائیں ہاں! میں دوسرے تختے بھی لائے دیتا ہوں!''

وہ دروازے کی طرف بڑھے مگر دہلیز پر پہنچ کر مڑے۔''اس کی مرمت ہونی چاہئے!'' انہوں نے ٹیڑھی میڑھی انگلی میری طرف ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ضرور!'' ماں نیان کی ہاں میں ہاں ملائی۔''کیوں، تو نے یہ شرارت کیوں کی؟'' انہوں نے مجھ پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے جان بوجھ کر کیا۔ اگر انہوں نے نانی اماں کو پھر مارا پیٹا تو میں ان کی داڑھی کاٹ دوں گا۔''

نانی اماں اپنا پھٹا ہوا کرتا اتار رہی تھیں۔ انہوں نے یہ سن کر سر ہلایا۔

''چھوکرے تو نے کیا کہا تھا، ایں؟ زبان پر تالا ڈال!'' انہوں نے خفگی سے تھوکتے ہوئے کہا۔

''خدا کرے تیری زبان کو آگ لگے اور تو چپڑ چپڑ کرنا بھول جائے!''

ماں نے نانی کو دیکھا اور پھر میری طرف۔

''کب مارا ایں؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''شرم کرو وارا! تو کیسی کیسی باتیں پوچھ رہی ہے بیٹے سے؟ تجھے دوسروں کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے سے مطلب؟''

''ماں، آہ ماں! تم کیسی فرشتہ ہو!'' ماں نے نانی کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔ بڑی اچھی ماں ہوں میں۔ چھوڑ مجھے جانیدے!''

دونوں نے ایک منٹ کو ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھا پھر الگ ہو گئیں۔ نانا کے قدموں کی آہٹ گلیارے میں سنائی دے رہی تھی۔

جس دن سے ماں آئیں اسی دن سے پڑوس کے فوجی کی من چلی بیوی سے ان کی گاڑھی چھننے لگی ماں ہر شام اس کے ہاں جاتیں۔ وہاں ان کی ملاقات ہیٹلنگ کے گھر کے لوگوں سے ہوتی۔ طرحدار جوان بیگموں اور جیالے افسروں کا جھرمٹ۔ نانا کو یہ ادا پھوٹی آنکھ نہ بھاتی۔ اکثر جب وہ رات کا کھانا کھانے بیٹھتے تو چمچہ اٹھا کر ان کی طرف اشارہ کرتے اور بڑبڑاتے:

''لو پھر محفل گرم ہے! لعنت ہو ان پر! آج پھر رات آنکھوں میں کٹ جائے گی!''

جلد ہی انہوں نے کرایہ داروں سے کہا بوریہ بستر سمیٹو اور نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ جب کرایہ دار دفان ہوئے تو وہ جانے کہاں سے اوٹ پٹانگ قسم کے فرنیچر اٹھا لائے اور ان کو خالی کمروں میں جما دیا۔ دروازے پر تالا ڈال دیا۔

''اب ان کم بخت کرایہ داروں کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی مہمان بلاؤں گا۔''

اور ہر اتوار کو مہمان آنا شروع ہوئے۔ ان میں نانی کی بہن بھی ہوتیں ماتریونا ایوانونا۔ وہ قیامت کا شور اور ہنگامہ مچاتی آتیں، شلغم برابر تو ناک تھی ان کی، دھوبن کا کام کرتی تھیں۔ اس وقت لکیر دار ریشمیں لباس پہنے ہوئے تھیں۔ اور سر پر سنہرا رومال بندھا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے دو بیٹے بھی

آتے۔ واسیلی نقشہ نویس تھا۔ اس کے بال لمبے تھے اور بھورے لباس میں ملبوس تھا۔ بڑا ہی زندہ دلا ور شریف آدمی تھا۔ وکٹر کا سر بالکل گھوڑے جیسا تھا اور اس کے پتلے سے چہرے پر جھائیوں سے داغ داغ اجالا ہو رہا تھا۔ وہ دروازے پر ربر کے جوتے اتار رہا تھا اس کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی:

''اندرئی پاپا، اندرئی پاپا...''

اس آواز پر میں حیران بھی ہوا اور سہما بھی۔

یاکوف ماموں چھتارا سے لیس آتے، اپنے ساتھ ایک مسکین صورت، گنجا ور کانا گھڑی ساز بھی لاتے۔ وہ لمبا سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھا جس کی وجہ سے دھرا پادری نظر آ رہا تھا۔ وہ مستقل کونے میں سپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر ایک طرف ذرا سا جھکا ہوا تھا اور چکنی منڈی ہوئی ٹھوڑی ایک انگلی پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ہر شخص پر چبھتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بہت کم بول رہا تھا اور مستقل ایک ہی بات دوہرائے جا رہا تھا:

''زحمت نہ کیجئے، ارے ایک ہی بات ہے...''

جب میں نے پہلی بار اس ے دیکھا تو مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا، بہت پہلے کا زمانہ۔ اس وقت ہم نووایا کوچے پر رہتے تھے۔ میں کوچے پر بے تحاشا ڈھول کی دھما دھم سنی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بڑی سی سیاہ گاڑی کو سپاہی گھیرے ہوئے ہیں اور لوگ جیل سے بڑے چوک کی طرف جا رہے ہیں۔ گاڑی میں ایک بنچ پر ایک آدمی بیٹھا ہے۔ اس کے سر پر اونی گول ٹوپی تھی۔ اور ہاتھوں میں بیڑیاں۔ اس کے جسم کی حرکت کے ساتھ زنجیریں بج رہی تھیں۔ گردن سے ایک سیاہ تختی لٹک رہی تھی اور اس پر بڑے بڑے سفید حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ جیسے وہ سیاہ تختی پڑھ رہا ہو۔

''یہ میرا بیٹا ہے'' میری ماں نے گھڑی ساز سے مجھے ملاتے ہوئے کہا۔ لیکن میں ڈر کر کتراتے ہوئے اور دونوں ہاتھ کمر پر باندھے ہوئے ایک طرف کو نکل گیا۔

''زحمت نہ کیجئے'' اس نے منہ کو داھنے کان کی طرف کھینچتے ہوئے خوفناک انداز سے کہا۔ اس نے میری پیٹی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بڑی تیزی اور چستی سے مجھے گھمایا۔

''اچھا، لڑکا کرارا ہے!'' اس نے مجھے چھوڑتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا مورچہ چمڑے کی کرسی پر جما لیا جہاں میں آسانی سے سو بھی سکتا تھا۔ نانا ہمیشہ دون کی

لیتے تھے کہ یہ کرسی شہزادے گروزینسکی کی ہے۔ کونے سے میں نے دیکھا کہ بڑے لوگ کتنی کوشش کر کے خوش ہونے پر تلے ہوئے ہیں اور گھڑی ساز کتنے عجیب عجیب اور مشکوک طریقے سے چہرے کی کیفیت بدل رہا ہے۔ اس کا چہرہ پیلا تھا، چپچپا، پسیجتا اور پگھلتا ہوا سا۔ جب وہ مسکراتا تو اس کے ہونٹ دائیں طرف کھنچ جاتے اور اس کی چھوٹی سی ناک بھی بھاگتی ہوئی معلوم ہوتی۔ جیسے شوربے میں تیرتی ہوئی پھلکی۔ اس کے بڑے بڑے جھانکتے ہوئے کان بھی ہلتے۔ کبھی ایک آنکھ کے اوپر بھوؤں کے ساتھ کان اٹھتے ہوئے معلوم ہوتے اور کبھی رخساروں کی ہڈیوں کی طرف جھکتے ہوئے۔ مجھے لگا اگر یہ آدمی چاہے تو بالکل ہاتھوں کی طرح اپنے کانوں سے اپنی ناک ڈھک سکتا ہے۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے وہ زبان نکالتا جو بالکل لٹکن کی طرح گول معلوم ہوتی تھی۔ وہ زبان دھیرے سے ہلاتا اور اپنے موٹے اور چپچپاتے ہوئے ہونٹوں کو تر کرتا۔ مجھے اس تماشے میں لطف کم آیا اور اس پر حیرانی زیادہ ہوئی۔ میں کسی طرح بھی اس سے نظر نہ ہٹا سکا۔

مہمانوں نے چائے رم کے ساتھ پی جس سے جلی ہوئی پیاز جیسی بو آ رہی تھی۔ انہوں نے نانی کی کشید کی ہوئی شراب بھی پی۔ جو سنہری بھی تھی اور سبز بھی اور تارکول کی طرح سیاہ بھی۔ انہوں نے جیم بھی کھایا اور خشخاش اور شہد کے کیک بھی۔ کھاتے کھاتے ان کے پیٹ پھول گئے، وہ پسینے پسینے ہو گئے۔ انہوں نے نانی کے خوب گن گائے۔ جب ان کے پیٹ بھر گئے تو وہ اپنی اپنی کرسی پر اڑ گئے۔ ان کے چہرے سرخ تھے۔ اب انہوں نے بڑی سستی سے یاکوف ماموں کی طرف دیکھا اور کچھ بجانے کی فرمائش کی۔

یاکوف ماموں چھتارے پر جھک گئے۔ انہوں نے تاروں کی کھنچ تان کی اور بڑی بے سری آواز میں گانے لگے:

ہم جیتے رہے، جیسے بن پڑا جیتے رہے
پر کچھ ہاتھ نہ آیا، کچھ ہاتھ نہ آیا
قازان سے آئیں بیگم
اور ہم نے ان کو ساری خبریں سنائیں۔

مجھے یہ گیت بڑا ہی دردناک لگا۔ نانی نے کہا:

''کچھ اور گایا کوف۔ کوف سچا گیت۔ یاد ہے تجھے موتریا، پہلے کیسے کیسے گیت گاتے تھے؟''

''میری جان اب گانے کا اور ہی چلن ہے...'' دھوبن نے بڑی شان سے ریشمیں لباس کو سرسراتے ہوئے کہا۔

میرے ماموں نیم وا آنکھوں سے نانی اماں کو دیکھتے رہے جیسے وہ بہت دور ہوں۔ دل بجھانے والا سر پھوٹتا رہا اور وہ دردناک بول الاپتے رہے۔

نانا چپکے چپکے گھڑی ساز سے کچھ بات چیت کر رہے تھے اور انگلی سے اشارے کر کر کے کچھ بتا رہے تھے۔ گھڑی ساز نے بھوئیں اٹھائیں اور ماں کی طرف دیکھا، سر ہلایا اور اس کے رقیق چہرے پر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوگئی۔

ماں حسب دستور سرگیئف خاندان کے لوگوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اور واسیلی سے آہستہ آہستہ گمبھرتا کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔

''ہاں اس کے بارے میں سوچنا چاہئے...'' واسیلی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وکٹر کے ہونٹوں پر شکم سیر مسکراہٹ ابھری۔ وہ پہلو بدل کر یکا یک باریک آواز اندرئی پاپا...''

''اندرئی پاپا، اندرئی پاپا...''

ہر شخص نے بات چیت بند کر دی اور اس کی طرف دیکھا۔

''اس نے یہ تھیٹر میں سیکھا ہے'' دھوبن نے بڑے فخر سے روشنی ڈالی۔ ''تھیٹر میں گاتے ہیں نا ایسے گانے!''

دو تین بار اور اس قسم کی شام کی محفلیں گرم ہوئیں۔ یہ شامیں اتنی بوجھل اور اکتا دینے والی ہوتیں کہ بھلائے نہیں بھلائی جا سکتیں۔ پھر ایک دن دوپہر کو گھڑی ساز نازل ہو گیا کہیں سے، گرجا گھر کی عبادت کے فوراً بعد۔ میں ماں کے کمرے بیٹھا پرانے زری کے کام کو کھولنے میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ دروازہ بھڑ سے کھلا اور نانی کا خوف زدہ چہرہ دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے بولیں اور غائب ہوگئیں:

''واریا وہ آیا ہے!''

ماں بے حس و حرکت بیٹھی رہیں۔ ایک منٹ بعد پھر دروازہ کھلا۔ نانا نے بڑی شان سے کہا:

''کپڑے بدل اور میرے ساتھ آ ورارا!''

''کہاں؟'' ماں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے بنا کہا اور اٹھیں بھی نہیں۔

''آ، خدا کی رحمت ہو تجھ پر۔ اب جھک مت کر۔ بڑا اچھا آدمی ہے، اپنے دھندے میں یکتا۔ وہ الیکسئی کا بڑا اچھا باپ ثابت ہوگا...''

نانا بڑی شان سے بول رہے تھے اور مستقل اپنی رانوں کو تھپتھپا رہے تھے۔ ان کی کہنیاں ہل رہی تھیں جیسے ان کے بازو بڑھنے کو بے قرار ہوں اور وہ ان کو بڑی مشکل سے قابو میں کر رہے ہوں۔

''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں یہ کبھی نہیں ہوگا'' میری ماں نیا طمینان سے کہا۔

نانا آگے آگے بازو پھیلائے ماں کی طرف بڑے جیسے کوئی اندھا چل رہا ہو۔

''آ، آ۔ نہیں تو میں جھونٹے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا!'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں دھاڑے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''تم مجھے گھسیٹو گے؟'' میری ماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کا چہرہ سفید تھا۔ ان کی آنکھیں غیض وغضب سے مچ گئیں۔ انہوں نے تیزی سے اسکرٹ اور بلاؤز اتارنا شروع کر دئے۔ جب وہ صرف پیٹی کوٹ میں رہ گئیں تو انہوں نے نانا سے کہا:

''اچھا اب لے چلو گھسیٹ کر مجھے!''

نانا نے دانت کھسوڑے اور مکا دکھایا:

''کپڑے پہن وروارا!''

ماں نے ان کو دھکیلا اور دروازے کی طرف بڑھیں:

''اچھا اب چل رہے ہو یا نہیں؟''

''میں تجھے عاق کر دوں گا!'' نانا پھنکارے۔

''بلا سے۔ پھر؟''

ماں نے دروازہ کھولا لیکن نانا نے ان کا پیٹی کوٹ پکڑ لیا اور گھٹنوں کے بل گر گئے۔

''وروارا تیرا حشر برا ہوگا، چڑیل، دیکھ لینا! میری ناک نہ کٹوا! وروارا کی ماں، وروارا کی ماں!'' وہ گڑگڑائے۔

نانی نے پہلے ہی ماں کا راستہ روک رکھا تھا اور ان کو کمرے میں واپس جانے کے لئے چوزے کی

طرح ہنکار رہی تھیں۔

''وروارا تیرا دماغ چل گیا ہے!'' وہ بڑبڑائیں۔''لوٹ جا، بے شرم چھنال!''

جب وہ ماں کو کمرے میں واپس لے آئیں تو دروازے کا قلابہ لگایا اور نانا کی طرف مڑیں۔انہوں نے ایک ہاتھ سے بڑے میاں کو اٹھالیا اور دوسرے ہاتھ سے مکا دکھایا۔

''اواواو، بڑے شیطان پگلے!''

نانی نے بڑے میاں کو چیتھڑوں کے گڈے کی طرح صوفے پر بٹھادیا۔ان کا سر جھک گیا اور منہ کھل گیا۔

''جا پہن ابھی کپڑے!'' وہ ماں پر گرجیں۔

''میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی، سنا تم نے؟'' ماں نے کپڑے اٹھاتے ہوئے کہا۔

نانی نے مجھے صوفے سے دھکیل دیا اور بولیں:

''جا دوڑ کر ایک ڈونگا پانی تو لا!''

وہ قریب قریب سرگوشی میں بات کر رہی تھیں مگر بڑے اطمینان اور زور سے۔میں دوڑا ہوا گلیارے میں گیا۔مجھے سامنے کے کمرے سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

''کل میں چلی جاؤں گی!'' میں نے ماں کو کہتے سنا۔

میں باورچی خانے میں گیا اور کھڑکی پر بیٹھ گیا جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔

نانا پھنکار اور کراہ رہے تھے۔نانی زیر لب بڑبڑا رہی تھیں۔پھر ایک دروازہ کھلا۔ہر طرف خاموشی اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔یکا یک مجھے یاد آیا مجھے کس لئے بھیجا گیا تھا۔میں نے ڈوں گا بھرا اور گلیارے میں گھسا۔گھر کے سامنے والے حصے سے گھڑی ساز نکلا۔اس کے سر جھکا ہوا تھا۔وہ سمور کی ٹوپ کو تھپتھپا رہا تھا اور کھنکار رہا تھا۔اس کے پیچھے پیچھے نانی اماں نکلیں۔ان کے ہاتھ پیٹ پر بندھے ہوئے تھے۔وہ جھکی ہوئی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں:

''تم خود ہی سمجھ سکتے ہو۔محبت زبردستی کا سودا تو ہے نہیں۔یہ آگ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔''

گھڑی ساز لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے نکلا اور احاطے میں چلا گیا۔نانی نے اپنے اوپر صلیب کا

نشان بنایا اور وہاں کھڑی سر سے پاؤں تک لرزتی رہیں۔ وہ ہنس رہی تھیں یا رو رہی تھیں۔ میں یہ سمجھ نہ پایا۔

''کیا بات ہے؟'' میں دوڑتا ہوا ان کے پاس گیا اور پوچھا۔

انہوں نے ڈونگا میرے ہاتھ سے چھینا۔ پانی چھلکا اور میرے پیر بھیگ گئے۔ بولیں:

''کہاں گیا تھا تو پانی لینے؟ دروازہ بند کر!''

وہ واپس مان کے کمرے میں چلی گئیں اور میں باورچی خانے میں۔ وہاں میں ان سب کی کراہیں، ٹھنڈی سانس، بڑبڑاہٹ سنتا رہا جیسے وہ سب اپنے بس سے زیادہ بھاری چٹان کو دھکیل دھکیل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے ہوں۔

بڑا شاندار دن تھا۔ جاڑے کے سورج کی لمبی لمبی کرنیں برف پرش کھڑکی کے شیشوں کو چیرتی ہوئی اندر آ رہی تھیں۔ کھانے کی میز لگائی گئی۔ میز برتنوں اور سنہری کواس کی صراحیوں سے سجی ہوئی چمک کی رہی تھی۔ ساتھ ہی نانا کی وادکا سے بھی روشنی پھوٹ رہی تھی جس کا رنگ جڑی بوٹیوں کی وجہ سے سبز ہو گیا تھا جو خوشبو وادکا کی صراحی میں ڈال دی گئی تھیں۔ کھڑکی کے شیشے پر ایک جگہ جمی ہوئی برف پگھل گئی تھیں۔ میں نے اس دائرے سے چھتوں پر شعلہ فشاں برف کی جھلک دیکھی۔ مجھے احاطے کے کھمبوں، ڈربوں اور چڑیا گھروں پر جمی گھروں نقرئی ٹوپیوں سے چنگاریاں اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ کھڑکیوں کی چوکھٹوں سے لٹکتے ہوئے دھوپ میں نہائے ہوئے پنجروں میں چڑیاں پھدک اور پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ پالتوں مینائیں اور گوریاں بڑی سریلی آواز میں چہک رہی تھیں۔ سنہری مینا گا رہی تھی۔ لیکن موسیقی اور دھوپ سے منور دن میرے لئے کوئی خوشی نہ لایا۔ دن منحوس تھا۔ ہر چیز منحوس تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں چڑیوں کو اڑا دوں اور لو پنجرہ اتار ہی رہا تھا کہ نانی بڑبڑاتی گڑبڑاتی باورچی خانے میں آ گئیں۔ وہ تندور کی طرف دوڑیں اور رانوں پر دوھتڑ مارتے ہوئے چلائیں:

''تم سب پر لعنت ہو، اللہ کا قہر نازل ہو تم سب پر! ہائے اکولینا تو بھی کیسی سڑی بڑھیا ہے، پگلی کہیں کی!''

نانی نے تندور سے سموسے نکالے، انگلیوں سے جلی ہوئی تہیں کھرچ کر الگ کیں اور کڑھن سے تھوکتے ہوئے بولیں:

''لو جل کر راکھ ہو گئے! واہ کیا سنکے ہیں سموسے! تھو! جن دیو جمع ہیں۔ سب کے سب! اللہ کا قہر نازل ہو سب پر۔ سب کھڑے کھڑے اٹھ جائیں اس دنیا سے! ارے تو وہاں بیٹھا کیا دیکھ رہا ہے ٹکر ٹکر، الو کی دم! سر پر ایسا ہتھوڑا ماروں کہ بھرکس نکل جائے مونڈی کاٹے!''

وہ سموسے الٹتی جاتیں اور روتی جاتیں۔ آنسو بہاتی جاتیں اور سموسوں کی جلی ہوئی تہیں کھرچتی اور جھاڑتی جاتیں، ساتھ ہی سموسوں کو آنسوؤں کے یہ بڑے بڑے قطروں سے بھگوتی جاتیں۔

ماں اور نانا باورچی خانی میں آئے۔ نانی نے جلے ہوئے سموسے میز پر پٹک دئے۔ پلیٹیں جھنجھنا اٹھیں۔

''اللہ سمجھے تم سے! دیکھ لو کیا گل کھلے ہیں! اور یہ سب تمہارے کارن!''

ماں کا دل شانت تھا۔ وہ خوش تھیں۔ انہوں نے نانی کو گلے لگا لیا اوز چمکارا۔ بولیں ''بھول جاؤ ماں!'' نانا بہت ہی تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر جھریاں لرز رہی تھیں۔ وہ میز پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے گردن کے گرد رومال باندھا، دھوپ کی وجہ سے سو جی سو جی آنکھیں میچ لیں اور بڑبڑائے:

''اچھا اچھا! چھوڑو بھی اسے! ہم پہلے بھی سموسے کھا چکے ہیں۔ ہمارا پروردگار۔ ذرا بخیل ہے۔ برسوں کی کثر منٹوں میں نکال دیتا ہے، تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور سود بھی نہیں لیتا۔ بیٹھ جاؤ، واریا۔ چلو، چھوڑو بھی!''

ایسا لگتا تھا جیسے ان کے دماغ میں کچھ الجھن سی ہے۔ پورے کھانے کے دوران میں وہ خدا کے بارے میں بولتے رہے، ایوب کی آزمائشوں کا قصہ سناتے رہے۔ بتاتے رہے باپ کے دل کو کیسے کچوکے برداشت کرنے پڑتے، کیسے کیسے زخم کھانے پڑے۔ نانی نے جھلا کر ان کی بات کاٹ دی:

''بس بس، کھاؤ۔ بکومت!'' انہوں نے کہا۔

ماں ہنس پڑیں۔ ان کی روشن آنکھیں چمک اٹھیں۔

''ڈر گیا ایں؟'' انہوں نے مجھے کہنی سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

میں بہت زیادہ تو نہیں ہولا تھا۔ لیکن اب مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا۔

ان لوگوں نے خوب خوب کھایا اور دیر تک کھایا۔ یہ ہر اتوار کا دستور تھا۔ یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی

لوگ ہیں جوکوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ایک دوسرے کونوچ لینے کے لئے لپک رہے تھے،سکیاں بھر رہے تھے، اور غصے سے کھول رہے تھے۔میرا دل یہ ماننے کو بھی تیار نہ تھا کہ یہ سب کچھ انہوں نے سنجیدگی سے کیا تھا یا انہیں اس سلسلے میں کچھ کوشش کرنی پڑی تھی۔ میں ان کے رونے اور چلانے کا،چیخم دھاڑ اور جھگڑوں کا عادی ہو چکا تھا جو بار بار شعلوں کی طرح بھک سے بھڑک اٹھتے تھے اور بھک سے بجھ جاتے تھے۔اب پہلے کی طرح ان ہنگاموں سے میرے دل میں کوئی ہیجان بپا نہ ہوتا تھا۔

بہت بعد میں مجھ پر یہ راز کھلا کہ روسی اپنی زندگی کے افلاس اور بوجھل پن سے اکتا کر جھگڑوں اور دکھوں سے اپنا غم غلط کیا کرتے تھے، بچوں کی طرح اپنے دکھوں سے کھیلتے ، اپنے درد کا تماشا بناتے اور انہیں اپنی بدنصیبوں پر شاید ہی کبھی شرم آتی۔

جب زندگی بے رنگ اور بے چمک ہوتو اس وقت دکھ درد سے ہی زندگی میں کچھ خوشگوار رنگ پیدا ہوتا ہے، اس وقت کہیں آگ لگ جائے تو اسی جی کو ڈھارس بندھتی ہے، دل مین کچھ روشنی ہوتی ہے۔ سپاٹ چہرے پر مسا بھی موتی کا کام کرتا ہے۔

11

اس واقعے کے بعد ماں میں نیا دم خم آ گیا۔وہ سرتان کر چلنے لگیں۔وہ گھر کی مالکن بن گئیں۔نانا بالکل مدھم پڑ گئے، بالکل چپ چپ رہنے لگے۔سرے سے پہلے والے نانا رہے ہی نہیں۔

انہوں نے گھر سے نکلنا چھور دیا۔وہ دوچھتی میں بیٹھے کوئی پراسرار سی کتاب پڑھتے رہتے جس کا نام تھا ''میرے ابا جان کی یادداشت''۔وہ یہ کتاب صندوق میں مقفل رکھا کرتے تھے۔میں نے اکثر دیکھا تھا کہ اس کتاب کو نکالنے سے پہلے ہاتھ ضرور دھولیا کرتے تھے۔کتاب چھوٹی اور موٹی تھی۔گہرے بھورے رنگ کے چمڑے کی جلد تھی اس کی۔نیلگوں سرورق پر دھندلی دھندلی روشنائی سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی:

''دلی عقیدت اور جذبہ ممنونیت کے ساتھ محترم واسیلی کا شیرین کی نذر۔''اس پر عجیب وغریب دستخط تھے جو آخر میں پہنچ کر چڑیا کی طرح پر تولتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔نانا بڑی احتیاط سے چمڑے کی بھاری جلد کھولتے، چاندی کی کمانیوں والی عینک چڑھاتے، ناک پر عینک جماتے اور دیر تک اس عبارت

پر نگاہیں گاڑے رہتے۔ میں نے کئی بار ان سے پوچھا کہ کون سی کتاب ہے۔لیکن لیکن وہ بڑے طمطراق سے جواب دیتے:

''تمہیں اس سے کیا کام۔ کچھ اور دم لے لو۔ میری آنکھ بند ہو جائے تو اس کتاب اور ریچھ کی کھال کے کوٹ کے وارث تم ہی ہو گئے!''

وہ اب میری ماں سے بہت کم باتیں کرتے اور جب بات کرتے تو نرمی سے کرتے۔ جب ماں کچھ کہتیں تو کان دھر کر سنتے، ماموں پیوتر کی طرح آنکھیں جھپکاتے رہتے اور کچھ بڑبڑاتے، ہاتھوں سے اشارے کرتے:

''اچھا اچھا، جو جی چاہے کرو...''

ان کے بکس طرح طرح کے لاجواب کپڑوں سے بھرے ہوئے تھے۔اسکرٹ جن پر زری کا کام تھا، ساٹن کی جیکٹیں، زربفت کے لباس، ریشمی سرفان، کیکا اور کوکوشنیک ☆ جن پر موتی جڑے تھے، زرق برق رومال اور گچھے، موردوویا کی سکوں والی بھاری مالا، رنگ برنگ کے جگمگاتے ہوئے پتھروں کے ہار۔ وہ سب میری ماں کے کمروں میں اٹھا لائے اور میز اور کرسیوں پر بکھیر دئے۔ جب ماں نے ان نادر چیزوں کی تعریف کی تو بولے:

''ہمارے زمانے میں لوگ بڑی شان سے قیمتی کپڑے وغیرہ پہنتے تھے۔اب وہ بات کہاں۔ پہلے کپڑے قیمتی ہوتے تھے لیکن لوگوں کی زندگی سادہ تھی، ان میں زیادہ بھائی چارہ تھا۔مگر میرے خیال میں وہ دن گئے، اب وہ دن لوٹ کر نہیں آنے کے! لو یہ کپڑے پہن کر دیکھو۔ پہنو...''

ایک دن ماں دوسرے کمرے میں گئیں اور جو لوٹیں تو گہرا نیلا سرفان پہنے ہوئے تھیں جس پر زری کا سنہرا کام تھا۔ان کے سر پر موتیوں جڑا رومال بندھا ہوا تھا۔

''ابا حضور کو پسند آیا؟'' انہوں نے نانا کے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

نانا دم بخود رہ گئے۔ان کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ ماں کے چاروں طرف گھومے اور ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ بڑبڑاتے رہے جیسے خواب میں بول رہے ہیں:

''آہ! کاش ورووارا تو دولت مند ہوتی اور آس پاس لوگ شریف اور اچھے ہوتے!...''

اب میری ماں گھر کے سامنے والے دونوں کمروں میں رہتی تھیں۔ اکثر مہمان آیا کرتے تھے ان

کے ہاں۔سب سے زیادہ دونوں ماکسیموف بھائی آیا کرتے۔ پیوتر لمبا تڑنگا خوش رو افسر تھا، اس کی لمبی داڑھی سنہری تھی اور آنکھیں نیلی۔ وہی آدمی جس کے سامنے نانا نے میری مرمت کی تھی جب میں نے بڈھے کے گنجے سر پر تھوکے دیا تھا۔ ایوگینی بھی لمبا تھا مگر اس کا رنگ زرد تھا اور ٹانگیں لمبی تھیں۔ اس کی سیاہ داڑھی نکیلی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں آلوچے جیسی تھیں۔ وہ ہمیشہ ہری وردی پہنتا تھا جس پر سنہرے بٹن

☆ سنگار کا سامان۔(مترجم۔)

ٹنکے ہوئے تھے اور جس کے تنگ شانوں پر سنہرے بلے چپکے ہوئے تھے۔ وہ بار بار کشادہ پیشانی پر جھک آنے والے لمبے اور لہردار بالوں کو پیچھے جھٹکتا رہتا تھا اور مسکراتا تھا، کچھ یوں جیسے آزردہ کرم ہو کر مسکرا رہا ہو۔ وہ ہمیشہ پھنسی پھنسی آواز سے کچھ نہ کچھ بولتا رہتا تھا اور ہمیشہ اپنی بات ان ہی جملوں سے شروع کرتا تھا:

''دیکھو۔ میں اس چیز کو یوں دیکھتا ہوں...''

ماں آنکھیں آدھی بند کئے اس کی باتیں سنتیں اور اکثر بات کاٹ کر ہنستیں:

''معاف کرنا ایوگینی واسیلی وچ، تم ابھی بچے ہو...''

''بالکل ٹھیک۔ بچہ!'' بڑے ڈیل ڈول کا افسر اتفاق کرتا اور اپنی بات پر زور ڈالنے کے لئے اپنی ران ایک تھاپ بھی جما دیتا۔

کرسمس کی چھٹیاں بڑی دھوم دھڑ کے کے ساتھ گزر گئیں۔ قریب قریب روز ہی میری ماں اور ان کے مہمان اچھے اچھے کپڑے پہنتے اور کہیں باہر چلے جاتے۔ ماں کا لباس سب سے زیادہ نفیس ہوتا۔

جب کبھی یہ مگن گروہ گھر کے پھاٹک سے باہر نکلتا، لگتا جیسے گھر زمین میں دھنسا چلا جا رہا تھا۔ ہر چیز بوجھل ہو جاتی، اتنی خاموش کہ دل بیٹھنے لگتا۔ نانی کمروں میں بوڑھے ہنس کی طرح چلتی، صفائی ستھرائی کرتی نظر آتیں۔ نانا تندور کے پاس کھڑے کمر سینکتے اور بڑبڑاتے رہتے:

''خیر۔ اچھا ٹھیک ہے... چھوڑ و اس کو اپنے راستے پر چلنے دو... دیکھیں اس کا کیا انجام ہوتا ہے...''

کرسمس کے بعد ماں مجھے اور میخائل ماموں کے بیٹے ساشا کو اسکول لے گئیں۔ ساشا کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی اور وہ سوتیلی ماں اس کو اتنا پیٹتی رہتی تھی کہ آخر نانی نے نانا اصرار کیا کہ ساشا کر

لے آؤ، ہمارے ساتھ رہے گا۔ ہم مہینے بھر اسکول جاتے رہے۔ اس زمانے میں جو کچھ پڑھایا گیا اس میں سے بس ایک ہی بات یاد ہے۔ اور وہ یہ کہ جبک بھی نام پوچھا جائے تو صرف ''پیشکوف'' کہنا کافی نہیں ہے۔

مجھے کہنا پڑتا تھا ''میرا نام پیشکوف ہے۔''

میں استاد سے اتنی سی بات بھی نہیں کہہ سکتا تھا:

''بھئی، تم بیکار مجھ پر لال پیلے ہوتے ہو! میں تمہاری دھونس میں نہیں آؤں گا...''

اسکول سے فوراً ہی جی اوب گیا۔ دوسری طرف میرے ممیرے بھائی کا دل پہلے ہی دن سے اسکول پر لٹو ہو گیا۔ اور اس نے جھٹ پٹ بہتوں سے یاری گانٹھ لی۔ لیکن ایک دن سبق چل رہا تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند میں چلا اٹھا:

''نہیں، نہیں...!''

جب وہ جاگا تو اس نے کلاس سے باہر جانے کی اجازت مانگی۔ اس پر لڑکوں نے جی کھول کے بڑی بے دردی سے چھیڑا اور چڑایا۔ دوسرے دن اسکول جاتے ہوئے جب ہم سینا یا چوک کے پاس گلی کے نکڑ پر پہنچے تو وہ رکا اور بولا:

''تم اکیلے اسکول جاؤ۔ میں آج نہیں جاؤں گا۔ میں تو آج ذرا سیر کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ بیٹھ گیا۔ اس نے کتابیں برف کے نیچے دبائیں اور چل دیا۔ جنوری کی دھوپ میں نہایا ہوا دن تھا۔ پوری دنیا میں جگمگا رہی تھی۔ مجھے ساشا پر بڑا رشک آیا مگر دانت پیس کر محض ماں کی خاطر ہے کسی نے صاف کر دیں۔ اب اگلے دن اسکول نہ جانے کی واقعی معقول وجہ موجود تھی۔ تیسرے دن نانا کو اس کی آوارگی کا حال معلوم ہو گیا۔

ہم دونوں کٹہرے میں کھڑے کئے گئے۔ باورچی خانے کی میز کی دوسری طرف نانا، نانی اور ماں جرح کے لئے بیٹھے۔ مجھے خوب یاد ہے ساشا نے نانا کی جرح کے جواب میں کتنا مضحکہ خیز جواب دیا تھا۔

''آخر تو اسکول پہنچا کیوں نہیں؟''

''میں اسکول کا راستہ ہی بھول گیا'' ساشا نے سراسیمہ آنکھوں سے نانا کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''بھول گیا ایں؟''

''ہاں۔ میں اسکول ڈھونڈتا رہا، اسکول ڈھونڈتا رہا...''

''تجھے تو الیکسئی کے پیچھے چلنا چاہئے تھا۔ اس کو تو راستہ یاد تھا۔''

''وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔''

''الیکسئی؟''

''ہاں۔''

''وہ کیسے؟'' ساشا نے ایک لمحے کو سوچا اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

''برف کا طوفان جو آیا تو۔ کچھ دکھائی نہ دیا۔''

ہر شخص ہنس پڑا کیوں کہ موسم صاف اور روشن تھا۔ ساشا کے ہونٹوں پر بھی بڑی مدہم سی مسکراہٹ ابھری۔ لیکن نانا نے کھیسیں نکالتے ہوئے طنزاً کہا:

''کیا تو اس کا ہاتھ یا پیٹی پکڑ کر نہیں چل سکتا تھا؟''

''میں نے کوشش تو کی مگر ہوا اتنے زور کی تھی کہ پیٹی چھوٹ گئی...''

وہ بہت آہستہ آہستہ انتہائی بے ہنگم پن سے بول رہا تھا۔ مجھے اس کا بھونڈا اور بیکار جھوٹ بہت کھلا اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ اڑیل گھوڑا کیوں بنا ہوا ہے۔

انہوں نے ہماری مرمت کی اور ایک بوڑھے فائرمین کو، جس کا ایک بازو مڑا ہوا تھا، ہمیں اسکول لے جانے پر مامور کیا۔ اس بڈھے کا فرض یہ تھا کہ ساشا کو علم کے راستے سے بھٹکنے نہ دے۔ مگر بیکار۔ اگلے دن جب ہم گلی کے نکڑ پر پہنچے تو ساشا نے جھٹ دائیں پیر کا جوتا اتار بائیں طرف اور بائیں پیر کا جوتا اتار دائی طرف پھینکا اور صرف موزے پہنے بیچ چوک میں یہ جا وہ جا۔ بڈھے نے ہانپتے ہوئے جوتوں کا رخ کیا۔ اس نے جوتے اٹھائے اور مارے ہول کے مجھے ہنکا کر گھر لے آیا۔

پورے دن ماں اور نانی مفرور کو شہر کے کونے کونے میں ڈھونڈتی رہیں۔ آخر وہ شام کو خانقاہ کے پاس چرکوف کے بھٹیار خانے میں ملا جہاں ناچ کر وہ لوگوں کا دل بہلا رہا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر گھر لائیں۔ سب اس لڑکے کی چٹان جیسی خاموشی سے ایسا جھک ہوئے کہ اسے پیٹا تک نہیں۔ وہ میرے پاس تندور کے اوپر والے تختے پر لیٹا ہوا ٹانگیں ہوا میں لہرا رہا تھا اور آہستہ آہستہ بول رہا تھا:

''میری سوتیلی ماں مجھے نہیں چاہتی۔ باپ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ دادا کے دل میں میری جگہ نہیں۔ آخر میں ان کے ہاں کیوں پڑا رہوں؟ میں دادی سے پوچھوں گا کہ چور اور ڈاکو کہاں رہتے ہیں۔ میں ان کے پاس بھاگ جاؤں گا۔ پھر تم سب کا دل کٹیگا! آؤ، ہم دونوں ساتھ وفو چکر ہو جائیں۔ ایں؟''

میں اس کے ساتھ نہیں بھاگ سکا۔ اس وقت میری زندگی کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں افسر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا، یہ بڑی پنکھے جیسی سنہری داڑھی والا افسر۔ اس کے لئے پڑھنا ضروری تھا۔ جب میں نے ساشا کو اپنا منصوبہ سنایا تو اس نے ایک آن کو سوچا اور بولا:

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ جب تم افسر بن جاؤ گے تو میں اس وقت ڈاکوؤں کا سردار ہوں گا۔ تم مجھے پکڑنے کو مارے پھرو گے۔ ہم میں سے کوئی دوسرے کو قتل کر دے گا یا قید کر لے گا۔ میں تو خیر تمہاری جان ہرگز نہیں لوں گا۔''

''میں بھی نہیں ماروں گا!''

اس پر ہماری بات چیت کی تان ٹوٹ گئی۔

نانی اندر آئیں۔ وہ تندور پر سمٹ کر بیٹھ گئیں اور ہم سے باتیں کرنے لگیں:

''ہائے چوہو؟ ہائے میرے ننھے منے یتیمو، میرے دل کی کویلیو!''

ان کا دل ہمارے لئے پگھل رہا تھا۔ انہوں نے ساشا کی سوتیلی ماں کو بھٹیار خانے کے مالک کی بیٹی موٹی ممانی نادیژدا کو خوب برا بھلا کہنا شروع کیا۔ اس کے بعد وہ تمام سوتیلی ماؤں اور سوتیلے باپوں پر لعنت بھیجنے لگیں۔ پھر انہوں نے ہمیں سادھوایونا کی کہانی سنائی جو بچپن ہی میں اپنی سوتیلی ماں کو کھینچ کر خدا کے دربار میں لے گئے تھے۔ ان کا باپ بیلوئے جھیل پر مچھیرا تھا

جس کو ڈائن بیوی کھا گئی۔

اس نے میاں کو شراب پلائی

اور کچھ کھلا کر سلا دیا

پھر اس نے میاں کو سوتے میں اٹھا کر شاہ بلوط کی ناؤ میں ڈالا

چھوٹی سی ناؤ میں جیسے تابوت۔

خود ہی دیوار کے چپو اٹھائے

ناؤ کھے کر لے گئی بیچ جھیل میں گہرائی میں،
جہاں پانی خواب میں دوڑ رہا تھا دھیرے دھیرے
اور اس رسوائے زمانہ کے گناہ کا انتظار کر رہا تھا۔
وہاں وہ کشتی پر ایک طرف جھکی
ناؤ ڈولی، جھکی، الٹی،
اس کا شوہر پانی میں ڈوب گیا جیسے پتھر
اور اس کا کوئی نشان نہ رہا۔
بیوی تیزی سے تیرتی ہوئی جھیل کے کنارے پہنچی
ساحل پر سر پٹک کر روئی پیٹی، چیخی، چنگھاڑی
جھوٹ موٹ میاں کے مرنے پر بین کرنے لگی۔
اس نے اتنی بے دردی سے اس کو موت کے گھاٹ اتارا
اور خود ہی لوگوں کو پکارا،
مچائی واویلا لوگوں کو ترس آیا،
بیوہ کے سوگ پر لوگوں کا دل بھر آیا،
''ہے ہے ایسی چڑھتی جوانی اور یہ بیوگی
ہائے تیری خوشی غم کی اندھیری رات میں کھو گئی
پر خدا کی مرضی میں چارہ کیا۔
وہی ہمیں مارتا ہے وہی ہمیں جلاتا ہے۔''
اکیلے ایونوشکا کو سوتیلی ماں کے آنسوؤں پر یقین نہ آیا۔
اس نے آہستہ سے ہاتھ رکھا سوتیلی ماں کے سینے پر
اور لعنت کی
''اے عورت، نرمی کی مورت
تو ہے رات کا پنچھی، فریبی،

میں تیرے آنسوؤں کا دریا بہائے
تیرے سینے میں دل خوشی سے دھڑک رہا ہے!
آ ہم خدا سے فریاد کریں، انصاف کی بھیک مانگیں
پروردگار سے، رحیم و کریم سے!
ہم میں سے ایک چھری اٹھائے اور آسمان پر پھینکے
اگر میں جھوٹا ہوں تو وہ چھری مجھے قتل کرے گی
اگر تو مجرم ہے تو جان سے جائے گی۔''
دھیرے دھیرے ماں اس کی طرف بڑھی
اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں
کھڑی ہوئی اور انتقام کے جذبے سے بھڑک کر بولی
''تو ہے زمانے کا احمق
وقت سے پہلے ہی تو نے
بھیڑیے کی کوکھ سے جنم لیا ہے
لعنتی تو یہ کیا بک رہا ہے؟
تو کیسا زہر اگل رہا ہے!''
جو لوگ کھڑے تھے یہ سن کر چونک گئے
کتنا بھاری تھا یہ الزام
چپ چاپ، دل پر بوجھ لئے، انہوں نے دیکھا
سب نے آہستہ آہستہ صلاح مشورہ کیا۔
پھر ایک بڈھا مچھیرا آگے بڑھا
اور ایک ایک لفظ تول تول کر بولا:
''بھلے لوگو ذرا وہ خنجر لانا
میں خنجر اٹھاؤں گا اوپر

اسے آسمان پر پھینکوں گا،
خنجر گناہ گار کے سینے میں پیوست ہوگا۔''
لوگوں نے لاکر بڈھے کو خنجر دیا۔ بڈھے نے خنجر کو سر کے اوپر اچھال دیا۔
خنجر پرندے کی طرح دھندلی دھندلی روشنیوں میں غائب ہوگیا۔ وہ دیر تک خنجر کے گرنے کا انتظار کرتے رہے اور شفاف بلندیوں میں گھورتے رہے۔
انہوں نے ٹوپیاں اتار لیں اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے وہ خاموش کھڑے رہے
وہ خاموش کھڑے رہے
رات خاموش تھی
اور خنجر کا کہیں پتہ نہ تھا!
پھر جھیل پر صبح کی لالی پھیلی
سوتیلی ماں کا چہرہ بھی سرخ تھا
اور اس کے گلے میں کانٹے پڑ رہے تھے۔
یکا یک خنجر تیر کی طرح جھلملایا
خنجر آسمان سے ٹوٹا اور سوتیلی ماں کے دل میں اتر گیا
خدا کے نیک بندے سجدے میں گر پڑے
اور رب کا شکر ادا کرنے لگے
''اے خدا تو بڑا رحیم و کریم ہے!''
بوڑھا مچھیرا ایونا کے پاس آیا
اس کو لے کر بن میں چلا گیا
دور، بہت دور، دریائے کیرژنتیس کے کنارے
شاندار شہر کیتژ میں...
اگلے دن جو میری آنکھ کھلی تو میرے پورے جسم پر لال لال دھبے پڑے ہوئے تھے۔ یہ چیچک کے حملے کی شروعات تھی۔ میں پچھلی دو چھتی میں لٹا دیا گیا۔ وہاں میں بہت دنوں تک بالکل اندھا پڑا رہا۔

میرے بازو اور ٹانگیں چوڑی چوڑی پٹیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ میں رات دن انگاروں پر لوٹا کرتا۔ بڑے بھیانک خواب دیکھا کرتا۔ ایک بار تو میں مرتے مرتے بچا۔ نانی کے سوا اور کوئی میرے پاس نہ آتا۔ وہ مجھے دودھ پیتے بچے کی طرح چمچے سے کھاتیں پلاتیں، بڑے اچھے اچھے قصے کہانیاں سنایا کرتیں۔ آخر میری صحت سنبھلنے لگی۔ میرے بازو اور ٹانگیں کھول دی گئیں۔ ہاں البتہ اب تک میں دستانے پہنے ہوئے تھا تاکہ میں اپنے چہرے کے دانے نہ نوچ لوں۔ ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ نانی مقررہ وقت پر نہیں آئیں۔ نہ جانے کیوں میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ یکا یک تصور ہی تصور میں میں نے دیکھا کہ نانی دوچھتی کی گرد آلود لینڈنگ پر اوندھے منہ پڑی ہیں اور ان کے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی گردن دو ٹکڑے ہوگئی تھی، بالکل بچا پیوتر کی طرح۔ کونے کے گرد آلود سائیوں سے ایک بڑی سی بلی اچھلی اور نانی پر کود پڑی۔ اف اس کی ہری آنکھیں کس طرح گول گول چمک رہی تھیں۔

میں بستر سے اچھل کر کودا اور لاتوں اور شانوں سے دھکے دے دے کر دوہری کھڑکی سے چھلانگ لگا کر برف کے گڑھے میں گر پڑا۔ اس شام میری ماں کے ہاں محفل گرم تھی اس لئے کسی نے کھڑکی کے ٹوٹنے کی آواز نہیں سنی۔ کچھ دیر میں یونہی برف میں پڑا رہا اور کسی کو پتہ نہ چلا۔ ہڈیاں نہیں ٹوٹیں ہاں شانے کی ہڈی اکھڑ گئی تھی اور شیشے سے جہاں تہاں جسم کٹ گیا تھا لیکن پالے نے ایسا ڈسا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ کوئی تین مہینے میں اپنے کمرے میں پڑا گھر میں بڑھتی ہوئی ہماہمی کی دھمک سنتا رہا۔ دروازے کھلتے اور بند ہوتے اور آنے جانے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا۔

برفانی طوفان چھتوں پر ناچتا اور شور مچاتا۔ دوچھتی کے دروازے کے باہر ہوا شائیں شائیں کرتی رہتی تھی، چمنیوں میں گھس کر ماتم کرتی اور کھڑکیوں کو جھنجھناتی۔ دن کے وقت کوؤں کی کائیں کائیں سنائی دیتی۔ جب راتیں خاموش ہوتیں تو کہیں دور سے بھیڑیوں کے غرانے اور چیخنے کی بھیانک آوازیں آتیں۔ اس موسیقی کی دھن پر میری روح ناچتی رہی، پروان چڑھتی رہی۔ پھر بہار آئی، لجاتی، بل کھاتی دبے پاؤں آئی اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے میرے کمرے میں جھانکنے لگی۔ جنگلوں پر بلیاں غرانے اور میاؤں میاؤں کرنے لگیں۔ بہار کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں دیواروں کے اندر سرسراتی ہوئی اندر آتیں۔ برف کے تودوں کے پگھلنے کی سرسراہٹ اور چھتوں سے برف کے گرنے کی آواز سنائی دیتی، گرجے کی گھنٹیاں بجتیں۔ ان کی گونج میں زیادہ جان پیدا ہوگئی تھی۔ یہ بات جاڑے کی گونج میں کہاں تھی۔

نانی مجھے دیکھنے آئیں۔ ادھر کچھ دنوں سے ان کی باتوں سے وادکا کی خوشبو آنے لگی تھی۔ اور یہ بو بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ اب وہ اپنے ساتھ بڑا سا سفید چائے دان بھی لاتیں اور میرے بستر کے نیچے چھپا دیتیں اور آنکھ مار کر دھمکاتیں:

''میرے لعل۔ دیکھنا، اپنے نانا کی دم سے کہتے مت پھرنا!''

''تم پیتی کیوں ہو؟''

''ہش! جب تو بڑا ہوگا تجھے آپ ہی معلوم ہو جائے گا!''

پھر وہ چائے دان سے ایک گھونٹ پیتیں، آستین سے منہ پونچھتیں اور ہونٹوں پر روحانی سرشاری سے بھیگی ہوئی مسکراہٹ بکھیر کر میری طرف مڑتیں:

''اچھا تو جناب عالی، میں کل کیا کہہ رہی تھی آپ سے؟''

''ابا کے بارے میں۔''

''کہاں چھوٹی تھی ڈور؟''

میں بتاتا کہانی کہاں تک پہنچی تھی۔ وہ بڑی خوش آہنگ روانی سے گھنٹوں کہانی سناتی رہتیں۔

ایک دن جب وہ نشے میں نہ تھیں، جب وہ تھکی تھکی اور اداس تھیں، خود ہی ابا کا قصہ چھیڑ بیٹھیں:

''رات میں نے تیرے باپ کو خواب میں دیکھا۔ ہاتھ میں ڈنڈا لئے وہ کھیتوں میں چل رہا تھا اور سیٹی بجا رہا تھا اور ایک کتا، ہاں چتکبرا کتا، اس کے پیچھے پیچھے زبان نکالے بھاگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں تیرا باپ اب آئے دن خواب میں آتا ہے۔ لگتا ہے اس کی روح بیقرار بھٹک رہی ہے...''

کئی دن تک لگاتار وہ مجھے ابا کا قصہ سناتی رہیں۔ یہ قصہ بھی ان کی تمام کہانیوں کی طرح دلچسپ تھا۔ میرے باپ سپاہی کے بیٹے تھے۔ دادا کو ترقی دے کر افسر بنا دیا گیا اور پھر جلاوطنی کے دن کاٹنے کو سائبیریا بھیج دیا گیا کیوں کہ وہ اپنے ماتحتوں پر بڑا ظلم توڑا کرتے تھے۔ وہیں کہیں سائبیریا میں میرے ابا پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی بڑی کٹھن تھی۔ ابھی وہ چھوٹے ہی تھے کہ گھر سے بھاگنے کی مہم شروع کر دی۔ ایک دن دادا نے کتا لیا اور بیٹے کی تلاش میں جنگل گئے گویا بیٹا نہ ہوا گلہری ہوئی۔ ایک بار اور جو بیٹے صاحب پکڑے گئے تو پھر وہ دھواں دھار پٹائی ہوئی کہ اڑوس پڑوس کے لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا ورنہ...

''کیا لوگ ہمیشہ بچوں کو پیٹا کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ نانی نے بڑے اطمینان سے جواب

دیا:

''ہمیشہ۔''

ابا کے سر سے ماں کا سایہ بڑی کم سنی میں اٹھ گیا۔ اور ابھی وہ نو ہی برس کے تھے کہ باپ بھی چل بسے۔ دینی باپ نے ان کو گود لے لیا اور انہوں نے لے پالک بیٹے کو شہر پیرم میں ایک بڑھئی کی گلڈ میں شامل کر دیا۔ شروع میں تو ہنر سکھایا لیکن ابا بھاگ کھڑے ہوئے اور بازار اور میلے میں اندھوں کی لاٹھی کا کام کیا۔ جب وہ سولہ برس کے ہوئے تو نیژنی نووگورود آ گئے اور کولچین کیچھاز پر بڑھئی کا کام کرنے لگے۔ بیس برس کی عمر میں ہی وہ فرنیچر بنانے میں ماہر ہو گئے۔ جس کارخانے میں وہ کام کرتے تھے میرے نانا کے مکان کے پڑوس ہی میں تھا۔ کووالیخا سڑک پر...

''تم جانو چہار دیواری ٹھہری نیچی اور ٹانگیں لمبی...'' نانی ہنسیں۔ ''ایک دن میں اور واریا باغ میں بیٹھے رس بھریاں چن رہے تھے۔ یکا یک جو میری نظر اٹھی تو بس مت پوچھ، رس تیرا باپ چہار دیواری سے چھلانگ لگا کر کود پڑا۔ مارے ڈر کے ہمارے تو گھگھی بندھ گئی۔ وہ سیب کے درختوں کے درمیان چلتا ہوا ہماری طرف آیا۔ کیا مرد تھا وہ؟ دیو تھا دیو، سفید قمیص اور ساٹن کی پتلون چڑھائے، ننگے پاؤں ننگے سر۔ اس کے لمبے لمبے بالوں کو ایک فیتہ دبائے ہوئے تھا۔ جانتے ہو کیوں آیا تھا وہ؟ تیری ماں سے شادی کی التجا کرنے! میں نے چند بار پہلے بھی اسے کھڑکی کے پاس سے گزرتے دیکھا تھا۔ جب کبھی میں اسے دیکھتی تو دل ہی دل میں کہتی ''خوب لڑکا ہے!'' تو جب وہ میرے پاس آیا تو میں بولی ''اچھا میرے بیٹے، بتاؤ تم راستہ کیسے بھول گئے؟'' وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ ''میں ہوں تمہارا غلام، خادم۔ اپنی جان تمہارے قدموں پر ڈالنے آیا ہوں! اور یہ رہی واریا۔ یسوع مسیح کے لئے ہمیں بیاہ کرنے دیجئے۔ ہمیں دعا دیجئے!'' اب میں کیا بتاؤں، میں تو بالکل ہکا بکا رہ گئی۔ کسی طرح کچھ کہا نہ جائے! منہ پر مہر لگ گئی۔ میں نگاہ جو اٹھاؤں تو کیا دیکھتی ہوں تیری ماں، چڑیل، مزے میں سیب کے درخت کے پیچھے چھپی کھڑی، رس بھری کی طرح لال، لونڈے کو اشارے کر رہی ہے اور آنکھیں ہیں کہ ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔ میں بولی ''ارے زمانے بھر کی بھولی! کہیں کوئی ایسا کرتا ہے؟ اس سے تو بہتر زمین پھٹے اور تو اس میں سما جائے! کیا تیرا دماغ بالکل چل گیا ہے وروارا؟ اور تو، اے نوجوان سوچ ذرا تو کیا کر رہا ہے! چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔'' ان دنوں تیرے نانا مالدار آدمی تھے۔ ان کی جائداد کا حصہ بخرہ نہیں ہوا تھا۔ چار چار مکان تھے، روپے کی

بھر مار تھی۔ لوگوں میں ساکھ تھی۔ کچھ ہی دنوں پہلے نو برس تک کارخانے کے ملکیار ہنے کے سلسلے میں ان کو ایک وردی اور ہیٹ ملی تھی...ان دنوں تیرا نانا بڑا مغرور تھا! جو میں کہہ سکتی تھی سو میں نے کہہ دیا۔ مگر میرا دل لرز رہا تھا ڈر سے، مارے ترس کے دل پھٹا جا رہا تھا۔ ہائے دونوں پر کیسی بجلی گر پڑی تھی۔ تیرا باپ اٹھا اور بولا ''جانتا ہوں واسیلی واسیلیو چ اپنی مرضی سے واریا کو میرے پاس نہ آنے دیں گے۔ اچھا تو اب میں واریا کو اڑا لے جاؤں گا۔ اور اسی کے لئے تمہاری مدد مانگ رہے ہیں ہم!'' ذرا سوچو، میری مدد! میں نے لاکھ بھگایا اسے مگر کیا مجال جو وہ ٹس سے مس ہوا ہو۔ بولا ''جی چاہے مجھ پر پتھر برساؤ، مگر میری مدد ضرور کرو! میں ہمت نہیں ہاروں گا!'' اب وروارا اس کے پاس آئی اور لڑکے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی ''ہم بہت دنوں سے میاں بیوی ہیں۔ مٹی سے ہی! اب ہمیں بس شادی کی ضرورت ہے!'' میں چکرا گئی۔ لگا جیسے انہوں نے مجھے دھکا دے دیا ہو! ہائے میں مری!''

نانی زور سے ہنسیں اور ان کا پورا جسم کانپ گیا۔ انہوں نے چٹکی بھر نسوار لی، آنکھوں سے آنسو پونچھے اور ٹھنڈی سانس لے کر بولتی رہیں:

''ابھی تو بچہ ہے۔ تو کیا جانے میاں بیوی بن جانے میں اور شادی میں کیا فرق ہے۔ مگر شادی کے بغیر جب بچہ ہو جائے تو یہ بڑی بھیانک بات ہوتی ہے۔ دیکھ یاد رکھیو۔ بڑا ہو کر خبردار جو کسی کنواری لڑکی کو ایسی مصیبت میں پھنسایا تو نے۔ بڑا گناہ ہوگا، کنواری یوں کرموں جلے اور پھر بچے کا کوئی پرسان حال نہیں۔ دیکھو بھولنا مت! عورت پر ترس کھانا چاہئے اور جان و دل سے اس سے محبت کرنی چاہئے۔ یونہی مزے اڑا کر الگ ہو جانا بڑا گناہ ہے! گرہ سے باندھ رکھ۔ میں تجھے عقل کی بات بتا رہی ہوں!''

وہ تھوڑی دیر کو رکیں اور اپنے خیال میں کھو گئیں۔ پھر سنبھلتے ہوئے کہانی کے تانے بانے بننے لگیں۔

''ہاں تو اب کیا ہو؟ میں نے میکسم کے سر پر ایک مکا جمایا اور وروارا کی چٹیا پکڑ کر کھینچی۔ تب لونڈے نے دل کو لگتی ایک بات کہی ''مار پیٹ سے تو ہونی انہونی ہونے سے رہی۔'' جھٹ لڑکی بولی ''نجات کا راستہ سوچو، پیٹنے سے کیا ہوگا؟'' میں نے کہا ''روپیہ پیسہ ہے تیرے پاس؟'' لڑکا بولا ''کچھ روپیہ تو تھا مگر میں نے اس واریا کے لئے انگوٹھی خرید لی!'' تو کیا تین ہی روبل تھے؟'' اس نے کہا ''نہیں کوئی سو روبل!'' ان دنوں چیزیں سستی تھیں اور پیسے کا بڑا مان تھا۔ میں نے تیرے ماں باپ کو دیکھا۔ بالکل بھولے بچے! ننھے منے احمق!'' میں نے انگوٹھی فرش کے تختے کے نیچے چھپا دی ہے تاکہ تم لوگوں کی

نظر نہ پڑے اس پر!'' تیری ماں نے کہا۔ ''ہم اسے بیچ سکتے ہیں!'' تھے نا بالکل بچے؟ خیر، ہم نے ایک ہفتے میں شادی رچانے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے خود ہی پادری سے مل کر سب کچھ طے کرنا تھا۔ لیکن ہائے میں کتنا روئی تھی پھوٹ پھوٹ کر۔ ہائے میرا کلیجہ تیرے نانا کے ڈر سے منہ کو آرہا تھا، تھر تھر کانپ رہی تھی میں! اور واریا کا بھی وہی حال تھا۔ سر سے پیر تک لرزتی رہتی تھی! خیر، ہم نے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرلیا۔

''تیرے باپ کا ایک دشمن تھا۔ ایک کاریگر۔ بڑا دل جلا تھا موٹڈی کاٹا! ایک زمانے سے وہ دونوں پر چپکے چپکے نظر رکھتا تھا۔ سب کچھ تاڑ گیا۔ خیر، میں نے اپنی بیٹی کو جو کچھ میرے پاس تھا اس میں سے بہترین کپڑے پہنائے اور اسے لے کے پھاٹک سے نکلی۔ نکڑ پر ایک ترویکا گاڑی انتظار کر رہی تھی۔ لڑکی گاڑی میں سوار ہوئی۔ میکسم نے سیٹی بجائی اور گاڑی یہ جا وہ جا۔ میں گھر لوٹی تو آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ذرا سوچو، کس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اسی کمینے بدمعاش سے! بولا ''میں دل کا اچھا ہوں۔ میں ان کی خوشی کا آشیانہ اجاڑنا نہیں چاہتا۔ بس میں اتنا چاہتا ہوں، اکولینا ایوانونا کہ میرے ہاتھ پر پچاس روبل رکھ دو اور بس!'' میرا ہاتھ خالی تھا۔ حساب کتاب سے مجھے جنم کی چڑ تھی۔ میں نے ایک پھوٹی کوڑی بچائی بھی نہیں تھی۔ میں تھی نری احمق۔ بولی ''میرے پاس پیسہ نہیں۔ دوں کہاں سے!'' وہ بولا ''اچھا تو وعدہ کرو!'' ''وعدہ؟ لیکن میں وعدہ پورا کرنے کو پیسہ کہاں سے لاؤں گی؟'' ''کیا مال دار میاں کے پیسے چرانا اتنا مشکل کام ہے؟'' وہ بولا۔ میں ایسی کم بخت کہ اس سے کھڑی باتیں کرتی رہی۔ چاہئے تو تھا کہ میں اسے باتوں میں پھنسائے رہوں۔ مگر میں نیاس کے منہ پر تھوک دیا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ دوڑ کر مجھ سے پہلے صحن میں پہنچ گیا۔ مت پوچھو کیسا ہنگامہ کھڑا کیا ہے اس نے!''

نانی نے آنکھیں بند کرلیں اور ایک مدہم سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر تیر گئی۔

''اف نہ پوچھو پھر کیا ہنگامہ ہوا ہے! آج بھی وہ سب کچھ یاد آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تیرا نانا درندوں کی طرح چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کے دل کو بڑا زبردست دھکا لگا تھا! اس کی شان کچھ اور تھی۔ وہ وروارا کی طرف دیکھتا اور شیخی بگھاڑتا۔ ''میں تو اپنی بٹیا کی شادی کسی رئیس زادے، نواب زادے سے کروں گا''۔ اور لو اب یہ رہا اپنا رئیس۔ نواب! لیکن ہم کمزور بندے بھلا کیا جانیں جوڑا کیسے بنایا جاتا ہے۔ پاک مریم کی جیسی مرضی! تیرا نانا احاطے میں بگولے کی طرح ناچ رہا تھا۔ بالکل بھڑکتا ہوا شعلہ! یاکوف اور میکائل کو بلایا، کوچوان کلیم کو پکارا اور اس چتکبری صورت والے کاریگر کو۔ میں نے دیکھا...تو وہ

باٹ اٹھا کر نچا رہا ہے۔ میخائل نے بندوق اٹھائی۔ ہمارے گھوڑے بجلی تھے، ہوا سے باتیں کرتے تھے، اور بگھی بڑی ہلکی پھلکی تھی۔ ''دیکھ لینا وہ ان کو جا لینے گے!'' میں نے سوچا۔ لیکن وروارا کے فرشتے نے مجھے ایک تدبیر سجھائی۔ میں نے ایک چھری لی اور بم کا فیتہ کاٹ دیا، سوچا ''راستے میں گھوڑے کا ساز ٹوٹ جائے گا!'' اور یہی ہوا۔ بم کھسک گیا اور نانا، میخائل اور کلیم مرتے مرتے بچے۔ لیکن اس طرح دیر تو ہوگئی۔ اب جو وہ گرجا گھر پہنچے تو واریا اور میکسم منبر کے سامنے کھڑے تھے، ان شادی ہو چکی تھی۔ شکر اللہ کا!

''خیر، یہ لوگ ٹوٹ ہی تو پڑے میکسم پر۔ لیکن میکسم تھا آدمی تگڑا جوان۔ دو چار ہی ایسے بلوان ہوتے ہیں۔ اس نے میخائل کو منبر سے اٹھا کر پھینکا تو غریب بازو سے گیا۔ کلیم کو دوسرا گھونسہ جڑا تو وہ ڈھیر۔ اب تیرے نانا، یاکوف۔ سبھی میکسم کے پاس پھٹکنے کی ہمت ہار بیٹھے۔

''مگر غصے میں تیرا باپ آپے سے باہر نہ ہوا۔ بولا'' پھینکو ہاتھ سے وہ باٹ... میں صلح صفائی کا آدمی ہوں۔ میں نے تمہارا کیا لیا ہے؟ مجھے جو کچھ دیا ہے خدا نے دیا ہے۔ کسی نے کوئی حق نہیں خدا کا دیا مجھ سے چھین لے۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔'' تینوں آدمی پیچھے ہٹ گئے۔ نانا بگھی میں بیٹھا اور بولا'' اچھا خدا حافظ وروارا! تو اب میری بیٹی نہیں رہی۔ میں اب تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا! میرے لئے تو زندہ ہو یا مردہ ایک ہی بات ہے!'' تیرا نانا گھر آیا۔ اس نے مجھے خوب پیٹا۔ میں پٹتی رہی اور کچھ نہ بولی، کراہتی رہی۔ میں جانتی تھی یہ سب گزر جائے گا اور ہونی ہو کر رہے گی۔ ''سنوا کو لینا، یہ مت بھولو تمہاری بیٹی جنم جنم کو گئی۔ اب تمہاری کوئی بیٹی نہیں۔ نہ اس گھر میں نہ اور کہیں۔ سمجھیں؟'' میں سوچتی رہی دل ہی دل میں ''سڑی تو بکا کر جھوٹ! تیرا کیا ہے گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ، یہ غصہ زیادہ دن تھوڑے ہی باقی رہے گا!''

میں دم بخود یہ کہانی سنتا رہا۔ میں ان کی کہانی کی بعض باتوں پر حیران ہ گیا۔ نانا نے تو ماں کی شادی کا نقشہ کچھ اور ہی کھینچا تھا۔ اصل میں وہ شادی کے خلاف تھے اور شادی کے بعد ماں کو گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ اور نانا کا کہنا تھا کہ شادی خفیہ نہیں ہوئی تھی اور وہ خود شادی میں موجود تھے۔ میں نے نانی سے نہیں پوچھا کہ ان دونوں میں سے کون سی کہانی سچ ہے۔ میں جھجک رہا تھا کیونکہ میرے دل کو نانی والی کہانی زیادہ بھائی۔ اتنی رومانی جو تھی! وہ باتیں کرتیں جاتیں اور ہلتی رہتیں۔ جب وہ غم انگیز یا خوفناک موڑ پر پہنچتیں تو اور زیادہ ہلنے لگتیں۔ اکثر ان کی آنکھیں بند ہو جاتیں، ان کی گھنی بھوئیں تھرتھرانے لگتیں

اور ایک گرم مسکراہٹ ان کے رخساروں کی جھریوں میں کھیلنے اور تھرکنے لگتی۔ وہ جس طرح ہر بات کو آئی گئی بنا لیتیں، ٹال جاتیں اس کا میرے دل پر بڑا اثر ہوتا تھا۔ لیکن بعض وقت ان کے احتجاج کی کڑوی اور جلتی ہوئی باتیں سننے کو بھی میرا دل تڑپ اٹھتا۔

''خیر شروع کے دو ہفتے تو پتہ ہی نہ چلا کہ واریا اور میکسم، دونوں ہیں کہاں۔ لیکن انہوں نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو پیغام لے کر بھیجا۔ اگلے ہی سنیچر کو میں نے عبادت کے لئے گرجا جانے کا بہانہ کیا اور ان سے ملنے چل دی۔ سوپتینسکی سڑک پر ایک مکان تھا جس کے بازو میں دونوں کا بسیرا تھا۔ اس مکان کے صحن میں بھانت بھانت کے کاریگر رہتے تھے۔ اف کتنا گندہ تھا صحن۔ لیکن دونوں کو اس گندگی کی ذرا پروا نہ تھی۔ دونوں مزے میں خوشی سے پھولی ہوئی بلیوں کی طرح کھیلتے اور قلابازیاں کھاتے رہتے۔ میں دونوں کیلئے کچھ تحفہ لے گئی تھی۔ یہی چائے، شکر، دال، جیم، آٹا، سوکھی ہوئی جنگلی چھتریاں اور کچھ پیسے۔ اب یاد نہیں رہا پیسے کتنے تھے۔ بس سمجھو جتنا کچھ میں تیرے نانا کی آنکھ بچا کر اپنی گرہ میں سمیٹ سکی، سب لے گئی۔ ایسی چوری چوری تھوڑی ہے جو آدمی اپنے لئے نہ کرے! پر تیرے باپ نے یہ سب لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے دل کو دھکا لگا۔ بولا ''ہم بھکاری ہیں کیا؟'' لو واریا بھی سر میں سر ملانے لگی ''ہوں، ماں یہ سب لانے کی کیا پڑی تھی تمہیں، ایں؟'' لیکن جو کچھ لائی تھی میں نے ان کے آگے ڈال دیا۔ ''بھولا کہیں کا، پروردگار نے مجھے تیری ماں بنایا!'' میں نے لڑکے سے کہا اور لڑکی سے بولی ''اور بیوقوف تیری رگوں میں تو میرا خون دوڑ رہا ہے! کون سی کتاب میں آیا ہے تو ماں سے نک چڑھا پن برتے۔ بتا؟ یہاں زمین پر اپنی ماں کی ہتک، آسمان پر خدا کی ماں کی ہتک ہے!'' لو اب میکسم نے مجھے بازوؤں میں سمیٹ کر اٹھا لیا اور پورے کمرے میں ناچتا رہا، مجھے بالکل یوں اٹھا لیا۔ تھا بھی پورا ریچھ! واریا مزے میں پورے کمرے میں مٹکتی رہی۔ جانو بالکل اپنے میاں کا مور! پھر جو اس نے ٹھاٹ سے اپنے ''گھر بار'' کا قصہ چھیڑا ہے تو مت پوچھو۔ گویا بڑی منجھی ہوئی گرھستن بول رہی ہو۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے! اور وہ سموسے جو وہ چائے کے ساتھ لائی؟ نگوڑا بھیڑیا کھائے تو دانتوں سے جائے! اور پنیر؟ ہی ہی۔ بالکل مالغوبہ!

''ہاں تو اسی طرح زندگی کی ناؤ چلتی رہی۔ بہت دنوں تک یہی قصہ رہا۔ اب تیرے دنیا میں آنے کا وقت آیا اور تیرا نانا ہے کہ منہ پر گوند چپکائے بیٹھا ہے۔ اپنی سی کرنے والا، ضدی۔ میں چھپ چھپ کر نئے جوڑے کے پاس جاتی۔ وہ سب جانتا تھا۔ پر ایسا بنتا تھا جیسے کچھ جانتا نہ ہو۔ گھر پر کسی کی مجال نہ تھی کہ

وروارا کا نام زبان پر لاتا۔ میں بھی چپ رہتی۔ لیکن میں جانتی تھی، باپ کا دل آخر باپ کا دل ہے۔ کب تک پتھر رہے گا! اور لو وہ وقت آ ہی گیا۔ اف کیسی رات تھی۔ برف کا طوفان چنگھاڑ رہا ہے، ہوا ہے کہ بھیڑیوں کی طرح کھڑکی کو نوچ رہی ہے۔ چمنی چیخ رہی ہے۔ لگتا تھا دوزخ کے سارے شیطان بے لگام اودم مچا رہے ہیں۔ تیرا نانا اور میں پاس پاس لیٹے تھے۔ آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ میں اٹھ بیٹھی اور بولی ''ہائے کیسی رات ہے قیامت! فکر اور تردد سے پسنے والوں کے لئے تو یہ رات اور بھی کالی بلا ہے!'' یکا یک تیرا نانا بولا ''کیا حال ہے ان کا؟'' میں نے کہا ''ٹھیک ہی ہے! برا نہیں ہے۔'' ''کن کا حال پوچھ رہا ہوں میں ایں؟'' اس نے پوچھا۔ ''اپنی بیٹی وروارا اور داماد میکسم کا اور کس کا؟'' ''تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا میں ان کے بارے میں پوچھ رہا ہوں؟'' ''وروارا کے ابا، بہت ہو لیا تماشا!'' میں بولی۔ ''بس یہ کھیل ختم کرو۔ اس کھیل سے کس کے دل کی کلی کھل رہی ہے بھلا؟'' تیرے نانا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ارے شیطانو، شیطانو! آفت کے پرکالے!'' وہ بولا۔ ''مگر اس گدھے کا کیا ہوگا؟'' یعنی تیرے باپ کا۔ ''کیا وہ واقعی اتنا بڑا احمق ہے؟'' میں بولی ''بیوقوف تو وہ ہے جو نہ کام کرے، نہ کاج کرے اور دوسروں کی روٹی توڑا کرے۔ ذرا ایک نظر اپنے یاکوف اور میخائل پر ڈالو۔ کیوں کیا وہ احمق بہتر ہیں؟ ہمارے گھر میں کون کام کرتا ہے اور کمائی گھر لاتا ہے؟ تم۔ اور وہ تو ہاتھ بٹاتے ہیں نا تمہارا؟'' بس اب کیا تھا۔ لے دے شروع ہوگئی۔ اب جو مجھ پر نزلہ گرا تو مت پوچھو۔ کیا کیا کہہ ڈالا۔ بیوقوف، کتیا، ٹڑی، پگلی اور خدا جانے کیا کیا! پر میں کچھ نہ بولی! ''میری سمجھ میں نہیں آیا تو کیسے آ گئیں ایسے آدمی کے بھرے میں جس کے اور کا پتہ نہ چھور کا!'' تیرا نانا بولا۔ میں اب بھی چپ۔ بھڑاس نکال لینے دو۔ جب دل کا غبار نکل گیا تو میں بولی ''جاؤ خود ہی جا کر دیکھ لو کیسی زندگی کٹ رہی ہے ان کی۔ واہ، بالکل دودھ شہد بنے ہوئے ہیں دونوں۔'' تیرے نانا نے کہا ''لیکن مجھے کیا پڑی ہے انہیں عزت بخشنے کی؟ آنا ہو تو وہی آئیں یہاں۔'' بس مت پوچھو۔ تیرے نانا کے منہ سے اس بات کا نکلنا تھا کہ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں خوشی سے رونے لگی۔ تیرے نانا نے میری چوٹیاں کھولنی شروع کیں۔ تیرا نانا میرے بالوں پر جان دیتا تھا۔ میرے بالوں سے کھیلنے کو اس کا دل مچل اٹھتا تھا۔ ''ارے پگلی عورت، رونا مچلنا بند کرو! سمجھتی ہو میرے سینے میں دل نہیں؟'' تیرا نانا تھا آدمی زوردار، بڑا بھلا مانس۔ پھر کچھ ایسا بھوت سوار ہوا اس پر کہ سمجھنے لگا مجھ سے بڑا گروگھنٹال اور کوئی ہے ہی نہیں۔ تب سے تیرا نانا گھٹیا ہو گیا، سٹھیا گیا۔

''ہاں ایک دن۔ اتوار کو۔ دونوں ہم سے ملنے آئے۔ دونوں دمک رہے تھے، صاف ستھرے اور خوبصورت! میکسم تیرے نانا کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ ذرا سوچو، تیرا نانا مشکل سے اس کے کندھوں تک آتا تھا۔ ''واسیلی واسیلیوچ، یہ نہ سوچئے گا کہ میں جہیز لینے آیا ہوں۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ میں تو صرف اپنی بیوی کے باپ کی خدمت میں سلام عرض کرنے آیا ہوں۔'' بس اس بات سے تیرے نانا کا دل خوش وہ گیا۔ تیرا نانا ہنس پڑا اور بولا ''اخاہ! تو اس ڈھب کے شیطان ہیں آپ! اچھا اچھا، بہت حماقت ہو چکی! اب سیدھے سیدھے یہاں آ جاؤ گھر میں رہنے سہنے لگو!'' میکسم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''اس کا فیصلہ واریا کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا جو جی چاہے کرے۔ میں اس کے ساتھ ہوں!'' ''میں اس کے ساتھ ہوں!'' پھر بحثا بحثی شروع ہو گئی۔ اور کسی طرح ان کی ٹیں ٹیں ختم ہی نہ ہو۔ میں ہوں کہ بار بار تیرے باپ کو آنکھ مار رہی ہوں۔ اور میز کے نیچے نیچے اس کے پیر کو ٹھوکے لگا رہی ہوں۔ لیکن تیرا باپ بھی خوب تھا۔ اپنی سی کر کے رہے گا۔ اف کیسی آنکھیں تھیں تیرے باپ کی۔ صاف شفاف، روشن روشن اور ان پر کالی کالی بھوؤں کا سایہ۔ کبھی کبھی اس کی بھوئیں آنکھوں پر جھک جاتیں، چہرہ پتھر ہو جاتا، پھر وہ کسی کا چھومنتر نہیں سن سکتا تھا۔ میں اس کو اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی تھی اور وہ یہ جانتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا اور کمرے کے چکر کاٹتا اور کہتا ''تم ہی ہو میری سچی ماں، اپنی ماں، جیسے دھرتی ماں! میں وروارا سے زیادہ تم پر جان دیتا ہوں!'' تیری ماں ان دنوں بالکل چڑیل تھی چڑیل۔ سیدھے میاں پر پل پڑتی ''مونڈی کاٹے، کتے کے پہلے ایسی بات زبان پر لاتے تیری زبان جلتی کیوں نہیں؟'' پھر ہم تینوں ایک دوسرے کو رگڑ دیتے۔ واہ کتنا مزا آتا تھا، اس زمانے میں! میرے کبوتر خوب دن تھے وہ! تیرا باپ کیا ناچتا تھا، یکتا تھا یکتا، اور کیسے کیسے خوبصورت گیت یاد تھے اسے۔ اس نے یہ گیت اندھے بھکاریوں سے سیکھے تھے۔ اور تو جانے، اندھے جیسا کوئی نہیں گا سکتا!

''اچھا، تو دونوں باغ کے سامنے والے بازو میں آن بسے۔ تو وہیں پیدا ہوا تھا۔ بھری دوپہر یا تھی۔ تیرا باپ کھانا کھانے گھر آیا اور لو سامنے تو پڑا کہہ رہا ہے۔ آئے آئے تشریف لائے۔ تیرا باپ خوشی سے پھول نہ سمایا اور اب جو اس نے تیری ماں کو کلیجے سے لگا کر بھینچا ہے تو مت پوچھ۔ گویا بچہ پانا دنیا کا سب سے کٹھن کام ہو۔ اس نے مجھے اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا اور اسی طرح باہر صحن میں نکل گیا اور تیرے نانا کو خوش خبری سنائی۔ جناب نواسے صاحب تشریف لے آئے۔ نانا تک کو ہنسی آ گئی ''میکسم تو بڑا شیطان

ہے!''

''لیکن تیرے ماموؤں کو تیرا باپ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ پیتا پلاتا نہ تھا، زبان کا تیز تھا، دماغ میں غضب کی اپج تھی، نت نئی الا بلا باتیں سوچتا رہتا تھا۔ وہاں وہ ان ہی باتوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

''ایک بار بڑے روزے کا زمانہ تھا۔ زوروں کی ہوا چل رہی تھی۔ یکا یک گھر میں سیٹیوں، چیخوں اور بھونکوں کا ایسا طوفان اٹھا کہ سب کے چھکے چھوٹ گئے۔ تیرے نانا نے دوڑ کر لیوں کے چراغ جلائے اور اللہ پیر کرنے لگا۔ پھر یکا یک ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے سے اور بھی کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ تیرا ماموں یاکوف تاڑ گیا ''یہ سب میکسم کی کارستانی ہوگی!'' بعد میں میکسم نے خود ہی بتایا کہ اس نے کس طرح دو چھتی کی کھڑکی پر بوتلیں رکھیں تا کہ ہوا چیختی اور غراتی ہوئی اندر داخل ہو۔ ''میکسم ذرا سنبھل کے!'' تیرے نانا نے دھمکایا۔ ''دیکھ لینا کہیں یہ ہتھکنڈے تجھے سائبیریا کی ہوا نہ کھلا دیں!''

''ایک بار ایسا جاڑا پالا پڑا کہ میدانوں سے بھیڑیے تک نکل آئے۔ ایک دن ایک کتا غائب، تو دوسرے دن کوئی گھوڑا ہنہنا رہا ہے، تیسرے دن سنتری کا قیمہ بنا رکھا ہے۔ ان کلموئے بھیڑیوں نے بڑا ستایا! تیرا باپ بندوق اٹھاتا، اس کی لیتا اور رات کے وقت باہر نکل جاتا۔ جب لوٹتا تو ایک دو بھیڑیے ضرور مار لاتا۔ وہ ان کی کھالیں اتارتا اور ان میں بھس بھرتا۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس طرح شیشے جڑتا کہ دیکھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نقلی ہیں یا اصلی۔ ایک دن تیرا ماموں میخائل موری کی طرف گیا۔ یکا یک کیا دیکھتی ہوں کہ وہ الٹے پاؤں دوڑا چلا آ رہا ہے، آنکھیں ہی کہ نکلی پڑ رہی ہیں، رونگٹے کھڑے ہیں، زبان اس طرح لٹکی ہوئی ہے کہ بولنا دوبھر۔ وہ بالکل دوہرا ہوا جا رہا ہے، ہانپ رہا ہے۔ ''بھیڑیا!'' ہر شخص جس کے جو ہاتھ لگتا ہے اٹھا لیتا ہے اور موری کی طرف بگ ٹٹ بھاگتا ہے۔ اور سچ مچ بھیڑیے کا سر ہے کہ دیوار کے سوراخ سے جھانک رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ گولیاں برسا رہے ہیں، ڈنڈے سے پیٹ رہے ہیں، مگر ڈھیٹ بھیڑیا ہے کہ اپنی جگہ ڈٹا ہوا ہے۔ سب دبے پاؤں بڑھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک خالی کھال پڑی ہے اور اس کے سر میں بھس بھرا ہوا ہے اور اگلی دونوں ٹانگیں کموڈ پر ٹھکی ہوئی ہیں کیل سے! ارے ابکے تیرا نانا غصے سے بھوت ہو گیا، بالکل بھوت! اب یاکوف نے بھی تیرے باپ سے گٹھ جوڑ کر لیا اور نئے نئے تماشے ہونے لگے۔ میکسم گتے سے ایک سر بناتا، پھر اس پر آنکھیں اور ناک ابھارتا، منہ بناتا اور بالوں کی جگہ سن چپکا دیتا۔ پھر وہ اور یاکوف، دونوں گلی میں جاتے اور اس ہوے کو کسی کی کھڑکی میں اٹکا

دیتے۔ظاہر ہے پڑوسی ڈر جاتے اور شور مچانے لگتے۔وہ چادریں اوڑھ لیتے اور نکل جاتے۔ایک بار ایک پادری ڈر گیا۔وہ ڈر کر سنتری کے پاس بھاگا، مارے ہول کے سنتر کی بھی گھگھی بندھ گئی اور اس نے سیٹی بجانا شروع کر دی۔وہ ہمیشہ یہی کھیل کرتے اور کہنے سننے سے ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔میں نے کہا بھئی یہ کھیل بند کرو۔واریا نے بھی بہت سمجھایا بجھایا، مگر وہ اپنی سی کرتے رہے۔میکسم کہتا ''اف چھوٹی سی چیزیں دیکھ کر جب لوگوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتے ہیں تو واہ کیا مزا آتا ہے!'' کیا مجال جو باتوں میں آ جائے...

''خیر اس شرارت کے ہاتھوں تو اس کی جان کے لالے ہی پڑ گئے تھے۔تیرا ماموں میخائل تو اپنے نانا پر گیا ہے۔بات بات میں چرکا لگ جاتا ہے اس کے دل پر، اس کے دل میں کوئی نہ کوئی کینہ پلتا رہتا ہے۔اس نے تیرے باپ سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ایک بار چاروں پامسکایا سڑک سے دعوت اڑا کر آ رہے تھے۔یہی میکسم، تیرے دونوں ماموں اور ایک پادری۔(بعد میں وہ اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا کیونکہ اس نے سائس کو پیٹ پیٹ کر دوسری دینا چلتا کر دیا)۔انہوں نے تیرے باپ کو اپنے ساتھ دیوکوف تالاب چلنے کے لئے کہا۔جیسے وہاں برف پر پھسلنے کا ارادہ ہو۔مگر وہ تالاب پہنچے تو انہوں نے تیرے باپ کو گڈھے میں دھکیل دیا۔مگر، یاد آتا ہے، میں تجھے یہ قصہ سنا چکی ہوں...''

''میرے ماموں اتنے کمینے کیوں ہیں؟''

''نہیں وہ کمینے نہیں ہیں...'' نانی نے اطمینان سے جواب دیا اور چٹکی بھر نسوار ناک میں سڑک لی۔

''احمق ہیں اور بس۔میخائل کائیاں ہے مگر احمق بھی ہے... یا کوف تو ہے ہی... ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ان لوگوں نے تیرے باپ کو گڈھے میں دھکیل دیا۔جب وہ نکلنے کی کوشش کرتا اور انگلیوں سے کنارا تھامتا تو تینوں جوتوں سے اس کی انگلیاں کچلتے۔وہ تو خیر ہوئی کہ دونوں نشے میں دھت تھے اور تیرا باپ ٹھیک ٹھاک تھا۔اللہ کا چاہا کچھ ایسا ہوا کہ میکسم کسی طرح گڈھے کے بیچوں بیچ تیرتا رہا۔یہ لوگ اس کے سر پر برف پھینکتے رہے۔لیکن ان کے نشانے خالی گئے۔آخر وہ وہاں سے یہ سوچ کر چل دئے کہ وہ ان کی مہربانیوں کے بغیر ہی ڈوب جائے گا۔لیکن میکسم رینگ کر نکل گیا اور سیدھا پولیس والوں کے ہاں بھاگا۔تو جانتا ہی ہے بالکل چوک ہی پر تو ہے تھانہ۔سرجنٹ میکسم کو اور ہمارے پورے خاندان کو جانتا تھا۔اس نے پوچھا یہ سب ہوا کیسے؟''

نانی نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا اور شکرانہ ادا کیا:

''اللہ اس کی روح کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بڑا کھرا آدمی تھا۔ جنت اس کا حق ہے! اس نے پولیس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا کہ قصہ کیا ہوا۔ اس نے کہا ''غلطی میری ہے۔ میں نشے میں دھت تالاب پر چلا گیا اور گڈھے میں گر گیا۔'' لیکن سرجنٹ نے کہا ''تم جھوٹ بولتے ہو، تم تو کبھی پیتے پلاتے نہیں۔'' سرجنٹ اور دو اور آدمیوں نے مل کر میکسم کو واد کا کی مالش کی، خشک کپڑے پہنا کر سمور کے کوٹ میں لپیٹا اور گھر پہنچا گئے۔ ادھر یاکوف اور میخائل کا کہیں پتہ نہیں۔ گھر لوٹے ہی نہیں۔ وہ مزے میں بھٹیار خانوں میں گلچھرے اڑاتے تھے۔ میں اور تیری ماں میکسم کو پہچان ہی نہ سکے۔ ہائے وہ کیسے کیا ہو گیا تھا۔ سر سے پاؤں تک نیلا پڑ گیا تھا، اس کی انگلیاں کچلی ہوئی تھیں، خون ٹپک رہا تھا، اس کی کنپٹیوں پر کچھ برف جیسا سفید نظر آ رہا تھا۔ پر یہ سفید پگھل نہیں رہی تھی۔ لو ایک آن میں اس کے بال کس طرح سفید ہو گئے تھے!

''وروارا ہے کہ چیخ رہی ہے ''میکسم، دشمنوں نے کیا کر دیا تو کو۔ میکسم، یہ کیا ہو گیا؟'' سرجنٹ ہر طرف سونگھتا پھر رہا ہے، جرح کر رہا ہے اور میرا دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے، دل کہہ رہا ہے رنگ بے ڈھب ہے! میں نے وروارا کو تو سرجنٹ سے
چپکایا اور لگی میکسم کو کریدنے۔ سچ بتا بھئی، سچ بتا! اس نے کان میں کہا ''جاؤ میخائل اور یاکوف کو ڈھونڈو! ان سے کہو کہ ان کا میرا ساتھ یامسکا یا سڑک پر چھوٹ گیا۔ وہ گئے پوکروفکا کی طرف اور میں پریادیلنی گلی کی طرف مڑ گیا۔ ان سے کہو اوٹ پٹانگ نہ بکیں ورنہ پولیس ناک میں دم کر دے گی۔'' میں دوڑی ہوئی تیرے نانا کے پاس گئی۔ بولی تم سرجنٹ کو باتوں میں لگائے رکھو اور میں پھاٹک پر بیٹوں کی راہ دیکھتی ہوں میں نے بری خبر سنا دی۔ تیرے نانا نے لرزتے اور بڑبڑاتے ہوئے کپڑے پہنے۔ ''میں جانتا تھا کوئی ایسی او ایسی بات ہو کر رہے گی!'' مگر یہ سب جھوٹ تھا۔ وہ جانتا خاک نہ تھا۔ خیر، بیٹے آئے، میں نے دونوں کے کان کھینچے۔ خوب خاطر تواضع کی۔ میخائل کا نشہ تو اسی آن ہرن ہو گیا۔ مگر یاکوف نشے میں دھت تھا۔ بڑبڑایا ''جانے میری بلا! یہ سب میخائل کی کارستانی ہے۔ وہ مجھ سے بڑا ہے!'' ہم نے بڑی مشکل سے سرجنٹ کو ٹھنڈا کیا۔ دل کا اچھا تھا وہ! اس نے کہا ''اب اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو یاد رکھو، میں مجرم کو پہچان لوں گا!'' وہ چلا گیا۔ وہ چلا گیا۔ تیرا نانا میکسم کے پاس گیا ''شکریہ بیٹے۔ میں خوب جانتا ہوں کوئی

اور ہوتا تو بالکل دوسرا کھیل کھیلتا۔ بیٹی تیرا بڑا احسان ہے۔تو ہمارے گھر اتنا اچھا انسان لائی۔'' ہاں جب تیرے نانا کے جی میں آتی تو اس طرح بڑی اچھی اچھی باتیں کرتا، اس کی عقل تو بعد میں ماری گئی، پھر اس نے اپنے دل پر تالا ڈال لیا۔ اچھا تو ہم تینوں اکیلے رہ گئے۔ میکسم نے اب کچھ رونا شروع کیا وراس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ چیخا'' آخر انہوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ میں نے آخر ان کا کیا بگاڑا ہے؟ اماں، بتاؤ، آخر انہوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟'' وہ مجھے ہمیشہ اماں کہتا تھا۔ بالکل ننھے بچے کی طرح۔ ہاں اس کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا، بالکل بچوں جیسا۔'' کیوں ماں؟'' وہ پوچھتا۔ میں کرموں جلی ہوں کہ بیٹھی اس کے ساتھ آنسو بہا رہی ہوں۔ آخر ماں کا دل ہے، آخر بیٹوں پر ترس کیسے نہ آئے؟ تیری ماں نے بلاؤز کے سارے بٹن مروڑ مروڑ کر توڑ دئے۔ وہ یوں بیٹھی تھی جیسے کسی سے لڑ کر آئی ہو۔ ''میکسم، چلو یہاں سے، چل دیں!'' وہ چیخ پڑی۔'' میرے بھائی ہماری جان کے گاہک ہیں۔ میں ان سے ڈرتی ہوں۔ چلو چل دیں!'' میں نے اس کو روکا'' اب آگ پر تیل نہ چھڑکو! ویسے ہی گھر دھواں دھواں ہو رہا ہے!'' ٹھیک اس وقت تیرے نانا نے دونوں گدھوں کو بھیجا کہ جا، جا کر معافی مانگ۔ تیری ماں نے دھڑ سے میخائل کے پورا تھپڑ ہی تو جڑ دیا۔'' لے، یہ ہے معافی!'' اور تیرا باپ ہے کہ پوچھ رہا ہے ''بھائی تم لوگوں نے یہ سب کیوں کیا؟ ایں؟ تم نے تو مجھے زندگی بھر کو اپاہج بنا دیا تھا بھائی۔ انگلیاں صاف ہو جاتیں تو میں کس کام کا کاریگر رہ جاتا، ایں؟'' خیر کسی طرح صلح صفائی ہو گئی۔ تیرا باپ کوئی سات ہفتے بیمار رہا'' اماں، آؤ کسی دوسرے شہر چلیں۔ میں اس جگہ سے اکتا گیا ہوں!'' اس کے کچھ ہی دن بعد اس کو استراخان بھیج دیا گیا۔ زار آنے والا تھا اور تیرے باپ کو شاندار محراب بنانا تھی۔ اس کو موسم بہار کے پہلے ہی جہاز سے رخصت کر دیا گیا۔ اور مجھے لگا جیسے کسی نے میرا آدھا دل کاٹ کر الگ کر دیا۔ وہ بھی اداس تھا۔ وہ بار بار کہتا تم بھی چلو اماں ہمارے ساتھ۔ مگر وارا، مت پوچھو، کوئی خوش سی خوش تھی۔ اس نے اپنی خوشی چھپانے کی کوشش بھی نہ کی، بے حیا کہیں کی!.. ہاں تو اس طرح وہ ہمارے ہاں سے سدھار گئے۔ اور بس...''

انہوں نے ایک گھونٹ واد کا پی، ایک چٹکی نسوار کی لی اور کچھ سوچتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا اور بولی:

''تیرے باپ سے میرا خون کا رشتہ نہ تھا۔ مگر ہمارا رشتہ دل کا تھا۔''

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ کہانی کے تانے بانے بن رہی ہیں اور لو نانا آن دھمکے۔ وہ سوکھا مارا چہرہ اٹھاتے، ہوا میں کچھ سونگتے، نانی اماں کو شبہے بھری نظر سے دیکھتے ہوئے تھوڑی دیر قصہ سنتے اور بڑبڑاتے:

''جھوٹ جھوٹ، جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں...''

ایک بار انہوں نے یکا یک پوچھ لیا:

''الیکسئی کیا تیری نانی شراب پیتی ہے یہاں؟''

''نہیں۔''

''تو جھوٹ بول رہا ہے، تیری آنکھیں بتا رہی ہیں!''

وہ چلے گئے، پر ان کو یقین نہ آیا۔ نانی نے ان کے غائب ہوتے ہوئے ہیولے کی طرف آنکھ ماری اور یہ کہاوت دوہرائی:

اودئی جاؤ جاؤ

گھوڑے کو نہ ڈراؤ

ایک دن وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے ہوئے اور فرش پر آنکھیں گاڑ کر بولے:

''وروارا کی ماں؟''

''ایں؟''

''دیکھتی ہو کیا گل کھل رہے ہیں؟''

''دیکھتی ہوں۔''

''کیا خیال ہے تمہارا؟''

''قسمت وروارا کے ابا، قسمت۔ یاد رکھو، تم کہا کرتے تھے اس نواب نواب زادے کے بارے میں؟''

''ہوں۔''

''تو پھر یہ رہا نواب زادہ تمہارا۔''

''بھکاری۔''

''خیر وہ جانے، اس کا معاملہ ہے۔''

نانا باہر چلے گئے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی آفت آنے والی ہے۔ میں نے نانی سے پوچھا:

''کیا باتیں ہو رہی تھیں نانی؟''

''کیا تجھے سب جاننا ضروری ہے، ایں؟'' انہوں نے میری ٹانگوں پر مالش کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تو نے بچپن ہی میں سب جان لیا تو پھر بڑے ہو کر جاننے کو کیا رہ جائے گا'' وہ ہنسیں اور سر دھننے لگیں۔

''آہ، تیرا نانا! نانا تیرا! تو پروردگار کی نگاہوں میں بڑا پاپی ہے۔ الیکسئی، دیکھو کہیو مت! بات یہ ہے کہ تیرے نانا کا سب کچھ لٹ گیا ہے! ایک ایک دمڑی لٹ گئی! اس نے ایک بھلے مانس کو قرض دیا تھا، بڑا بھاری قرض، ہزاروں کا۔ اور لو وہ بھلا مانس دیوالیہ ہو گیا، دیوالیہ...''

وہ اپنے خیال میں کھوئی ہوئی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی روشنی بجھ گئی اور اندھیرا چھا گیا۔

''کیا سوچ رہی ہو نانی؟''

''سوچ رہی ہوں، کون سا قصہ سناؤں؟'' انہوں نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔ ''اچھا ایوستیگنئی کی کہانی کیسی رہے گی؟ سن:

ایک تھا راہب
سمجھا تھا میں تو روشنی کا مینار ہوں۔
پادری اور زار سے زیادہ ہے روشنی میری۔
اور سوداگر۔؟ ارے چھوڑ وہ تو
خیر گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔
اس کی آنکھیں بڈھے الو کی طرح نکلی رہتیں
پڑوسیوں کو صبح سے شام تک سبق پڑھاتا رہتا۔
اس کی نظر میں کوئی چیز بھی ٹھیک نہیں!
بگھی میں سفر کرے تو کہے لو چرخ چوں چرخ چوں چلتی ہے سیب کھایا تو۔ لو یہ تو میٹھا نہیں
دھوپ میں بیٹھے۔ تو باپ رے باپ بڑی گرمی ہے۔

ہر چیز کو دیکھتا ہے اور ایسے ہی اپنی سی ہانکتا چلا جاتا ہے نانی نے آنکھیں گول گول نچائیں اور گال پھلائے۔ ان کے بھولے چہرے سے فوراً عجیب سی حماقت اور مسخراپن ٹپکنے لگا۔ انہوں نے آواز کو کھینچ کھینچ کر کہا:

''ارے یہ چیز میں بھی بنا سکتا ہوں،
کہیں اچھا، بہت شاندار
مگر جانتے ہی ہو میں اپنا وقت برباد نہیں کر سکتا۔''

نانی ایک منٹ کو رکیں، پھر بولیں:

ایک دن کچھ شیطان آن دھمکے اس کے ہاں:
''یہاں تو تمہیں بڑی تکلیف ہے نا؟
کیا خیال ہے۔ آؤ ہمارے ہاں دوزخ میں مہمان،
وہاں کی آگ تو لبالب کنووں کو بھی چاٹ جائے!''
ابھی راہب نے سر پر ٹوپی بھی نہیں جمائی تھی
کہ دو شیطان اس کے کندھوں پر جم گئے،
دوسرے شیطانوں نے اس کو پنجوں میں دبوچا
اور اس کی چٹکیاں بھریں اور بوٹیاں نوچیں،
پھر اٹھایا اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیا۔
''اچھا ایوستیگنئی، کہو کیسے ہو، خوش ہو نا اب؟''
راہب بھننے لگا اور اس نے آنکھیں نکالیں،
لیکن اب بھی وہی انداز تھا دانا و عاقل والا
اس کے ہونٹ بڑی نفرت سے مڑے اور وہ بولا:
''دوزخ کی آگ سے دھواں بہت اٹھتا ہے!''

نانی نے آواز کو بہت ہی کھینچ کر کہانی ختم کی، پھر زور سے قہقہہ لگایا اور جو میری طرف مڑیں تو چہرے کی کیفیت کچھ اور تھی:

''ایوستیگنئی ہار نہ مانا، وہ بھی تیرے نانا کی طرح تھا، اپنی سی کر گزرنے والا۔ اچھا۔ اب سوچو! سونے کا وقت ہو گیا!...''

میری ماں کبھی کبھار ہی مجھے دیکھنے کو دو چھتی میں آتیں۔ وہ آتیں، دو چار باتیں جلدی جلدی کہتیں اور چلی جاتیں۔ ان کا حسن اب اور بھی چمک اٹھا تھا اور ان کے کپڑے پہلے سے زیادہ اچھے ہو گئے تھے۔ لیکن ان میں بھی مجھے کوئی راز سا نظر آتا تھا، نانی کی طرح، کوئی ان بوجھی بات! میرا دل کہتا تھا کہ ضرور کوئی بات ہے جو ماں اور نانی دونوں مجھ سے چھپانا چاہتی ہیں اور میں یہ پہیلی بوجھنے کی کوشش کرتا رہتا۔

نانی اماں جو کہانیاں کہتیں، اتنی امنگ سے نہ سنتا۔ ابا کی کہانی بھی میرے دل میں سر اٹھاتے ہوئے اندیشوں کو دور نہ کر سکی جو زور بروز زیادہ مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔

''وہ کون سی چیز ہے جو ابا کی روح کو اتنا ستا رہی ہے؟'' ایک دن میں نے نانی سے پوچھا۔

''میں کیا جانوں؟'' انہوں نے آنکھوں پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''خدا کے کارخانے میں بندے کو کیا دخل۔ یہ ہماشما کی عقل میں آنے والی باتیں نہیں، بھلا؟...''

راتیں آنکھوں میں کٹ جاتیں۔ میں پڑا پڑا اندھیرے نیلے آسمان پر ستاروں کے کارواں کو آہستہ آہستہ گزرتے ہوئے دیکھتا رہتا اور بڑی المناک کہانیاں سوچتا رہتا جن کے ہیرو میرے ابا ہوتے۔ وہ ہمیشہ اکیلے ہوتے، ان کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا ہوتا اور ایک جھبرا کتا ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہتا...

12

ایک شام میں ہلکی سی جھپکی مارنے کے بعد جو اٹھا تو محسوس ہوا کہ میری ٹانگیں بھی جاگ گئی ہیں۔ میں نے ٹانگیں چارپائی کے کنارے لٹکا دیں۔ پھر ایک بار ٹانگیں سن اور بے جان ہو گئیں۔ لیکن اب دل میں اعتماد پیدا ہو چکا تھا کہ میری ٹانگیں صحیح سالم ہیں اور میں چل سکتا ہوں۔ دل میں خوشی کا ایسا طوفان اٹھا کہ میں نے بے اختیار پیر فرش پر رکھ دئے اور کھڑا ہو گیا۔ میں گر پڑا، مگر رینگتا ہوا زینے سے اترا۔ میں نے سوچا مجھے دیکھ کر تو یکا یک لوگوں پر بجلی گر پڑے گی۔

مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نانی اماں کی گود میں کیسے پہنچا۔ لیکن جو آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہوں کہ میں ماں کے کمرے میں نانی کی گود میں ہوں۔ عجیب عجیب لوگ مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان ہی میں ایک سوکھی ماری

سبز بڑھیا بھی تھی جس کی آنکھیں سبز تھیں۔

''اس کورس بھریوں کا جیم اور گرم گرم چائے پلا کر کمبل میں لپیٹ دو...'' سبز آنکھوں والی بڑھیا نے بڑے طمطراق سے کہا۔ اس کی آواز نے دوسروں کی آوازایں دبا دیں۔

اس کا پورا وجود سبز تھا۔ اس کا لباس، اس کی ٹوپی، اس کا چہرہ اور بائیں آنکھ کے نیچے مسا! مسے سے جھانکتے ہوئے روئیں تک گھاس معلوم ہوتے تھے۔ اس کا بالائی ہونٹ اٹھا ہوا تھا اور نچلا لٹکا ہوا۔ اس کے سبز دانت چمک رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کئے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سیاہ لیس کے دستانے تھے۔

''کون ہے یہ؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ اب تیری دادی ہوں گی'' میرے نانا نے بڑی ناخوشگوار آواز میں کہا۔

ماں نے قہقہہ لگایا اور ایوگینی ماکسیموف کو میری طرف دھکیلتے ہوئے کہا:

''اور لے یہ ہوں گے تیرے نئے ابا۔''

ماں نے کچھ اور بھی کہا، بہت بہت جلدی جلدی۔ بالکل سمجھ میں نہ آیا کیا۔ ماکسیموف آنکھیں میچے ہوئے میرے اوپر جھک گیا:

''میں تمہیں کچھ رنگ خرید دوں گا۔''

کمرہ جگمگا رہا تھا۔ کونے میں میز پر شمع دان رکھے تھے۔ ہر شمع دان میں پانچ موم بتیاں جل رہی تھیں۔ ان کے درمیان نانا کی پسندیدہ شبیہہ رکھی تھی۔ ''مت رو، اے ماں!'' فریم پر جڑے ہوئے موتی چمک رہے تھے اور موم بتی کی روشنی میں پگھلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ سنہرے ہاروں میں جو ہیرے چمک رہے تھے ان سے روشنی کے شعلے سے لپک رہے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے سے چپکے ہوئے چہرے جھانک رہے تھے۔ چپٹی چپٹی ناکیں شیشے پر دبی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے چاروں طرح ہر چیز تیرتی ہوئی محسوس ہوئی، سبز عورت مجھ پر جھکی اور اس نے ٹھنڈی انگلیوں سے کنپٹیوں کو چھو کر دیکھا اور بڑبڑائی:

''ضرور، ضرور...''

''ارے بیہوش ہو گیا'' نانی نے کہا اور مجھے دروازے کی طرف لے چلیں۔

لیکن میں بیہوش نہیں ہوا۔ میں نے تو محض آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور جب وہ مجھے اٹھا کر زینے پر

چڑھ رہی تھیں تو میں نے کہا:

''تم مجھے بتاتیں کیوں نہیں نانی؟''

''اچھا، اچھا۔ اس وقت بولو مت، سنا؟''

''تم سب مجھے دھوکا دیتے ہو۔ تم سب...''

نانی نے مجھے چارپائی پر لٹایا اور تکیے میں منہ ڈال کر رونے لگیں۔ ان کے شانے ہل رہے تھے اور وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں:

''رو رو رو...''

اور میرا جی رونے کو نہ چاہ رہا تھا۔ دوچھتی میں دھندلکا اور ٹھنڈک تھی۔ میرے لرزنے سے چارپائی ہل رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ کسی طرح سبز عورت میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتی تھی۔ میں سوتا بن گیا اور نانی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔

چند دن بڑے پھیکے اور بے رنگ سے بیت گئے۔ ماں منگنی کا اعلان کرنے کے بعد کہیں چلی گئیں اور گھر پر سناٹا چھا گیا۔

ایک دن صبح ہی صبح نانا ہاتھ میں چھینی لئے آئے اور کھڑکیوں کے کنارے کھودنے لگے۔ نانی کٹھوت میں پانی اور کچھ چیتھڑے لئے آئیں۔

''تو پھر، بڑی بی؟'' نانا نے آہستہ سے پوچھا۔

''تو پھر کیا؟''

''تم خوش ہونا؟''

نانی نے وہی جواب دیا جو انہوں نے زینے پر کہا تھا۔

''اچھا اچھا۔ اس وقت بولو مت، سنا؟''

ان سیدھے سادے لفظوں میں خاص معنی چھپا ہوا تھا، ان لفظوں میں تو بڑی بات، ناخوشگوار بات پوشیدہ تھی۔ سب یہ جانتے تھے مگر کوئی اس کا نام زبان پر لانا نہ چاہتا تھا۔

نانا نے بڑی احتیاط سے جاڑے کی چوکھٹ ہٹائی اور اسے لے کر چل دئے۔ نانی نے کھڑکی کھول دی۔ ایک مینا اور گوریاں باغ میں چہچہائیں۔ پگھلتی ہوئی مٹی کی خمار آگئیں خوشبر کمرے میں بس گئی۔ تندور

کی نیلی دیواریں اداس اور زرد پڑ گئی تھیں۔ان کو دیکھ کر میں لرز اٹھا۔میں چپکے سے رینگتا ہر بستر سے نکلا۔

''ننگے پاؤں نہ پھرنا'' نانی نے ڈانٹ بتائی۔

''میں ذرا باغ میں جا رہا ہوں۔''

''ذرا دم تو لے۔سیلن تو دو ہونے دے بھائی!''

میں ان کی حکم کی تعمیل پر بالکل آمادہ نہ تھا۔میں اب بڑوں کو دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ان کو دیکھ کر میرے دل پر اوس پڑ جاتی تھی۔

زردی مائل ہری ہری دو کی پلکیں زمین سے جھانک رہی تھیں۔سیب کے درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، پیتر وونا کے مکان کی چھت پر خوبصورت ہری کائی کا مخمل بچھا ہوا تھا۔ہر طرف چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔معطر اور گنگناتی ہوئی ہوا میں میرا سر تیرنے لگا۔بھورے بھورے جھاڑ جھنکاڑ جو برف سے دب گئے تھے، اس گڈھے کے کنارے کنارے نظر آ رہے تھے جہاں چچا پیوتر نے اپنا گلا کاٹ لیا تھا۔میرا جی بھرا آیا۔ہاں اس میں بہار کا کوئی نشان نہ تھا۔ہر چیز جلی ہوئی، اداس اور سیاہ معلوم ہو رہی تھی۔گڈھا یہاں بن بلایا مہمان معلوم ہوتا تھا۔میرا خون کھول گیا اور بے اختیار جی چاہا کہ یہ جنگلی گھاس نوچ لوں، اینٹ اٹھا کر پھینک دوں، ہر وہ چیز ہٹا دوں جو وہاں کباڑ کا ڈھیر بنی پڑی تھی۔میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنے لئے الگ تھلگ ایک چھوٹا سا کنج بناؤں، اکیلا رہوں اور کوئی بڑا بوڑھا پاس نہ ہو۔میں فوراً اس پر عمل شروع کر دیا۔اس طرح گھر کے حال کے واقعات میں بھول گیا۔حق تو یہ ہے کہ گھاؤ اپنی جگہ رہا لیکن پہلی سی ٹیس نہ اٹھتی تھی۔

''تو منہ لٹکائے کیوں بھٹکتا پھرتا ہے بابا؟'' میری نانی اور اماں پوچھتیں۔ایسے سوال سے میں بالکل گھبرا جاتا۔میں ان لوگوں سے خفا نہ تھا، بس اتنی سی بات تھی کہ اس گھر سے وابستہ ہر چیز میرے لئے ناخوشگوار ہو گئی تھی۔اکثر وہ سبز عورت کھانے یا شام کی چائے پر ہمارے ساتھ آ بیٹھتی۔وہ احاطے کے پرانے کٹہرے کا سڑا ہوا کھمبا نظر آتی۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان دیکھے تاگے سے اس کی آنکھیں چہرے میں ٹانک دی گئی ہیں۔اس دیدے ہڈیالے گڈھوں میں گھومتے رہتے، اس کے دیدے ہر چیز کو دیکھتے ہوئے، پرکھتے ہوئے معلوم ہوتے۔جب وہ خدا کا نام لیتی تو آنکھیں چھت پر ٹک جاتیں۔جب گھریلو چیزوں کا ذکر چھڑتا تو آنکھیں فرش پر جھک جاتیں۔اس کی بھوئیں نقلی معلوم ہوتی تھیں۔اس کے چوڑے

جبڑے منہ میں آئی ہوئی ہر چیز کو بڑی خاموشی سے چبا ڈالتے۔ وہ کانٹے کو کچھ عجیب مضحکہ خیز ڈھنگ سے پکڑتی تھی۔ اس کی انگلیاں مڑی تڑی نظر آتیں اور چھنگلی اٹھی رہتی۔ اس کے کانوں کے آگے رخساروں کی گول ہڈیاں لرز رہی تھیں، اس کے کان تھرکتے رہتے اور اس کے مسے کے سبز بال لرزتے اور اس کے زرد اور بیزار کن صاف ستھری جھریوں بھری جلد پر مسا بھی تھرکتا۔ اس کا بیٹا اور وہ خود دونوں اتنے صاف ستھرے براق نظر آتے کہ ان کے پاس پھٹکنے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ شروع شروع میں پہلی ملاقات کے بعد اس نے کئی بار کوشش کی کہ میں اس کا بوڑھا ہاتھ چوموں جس سے قازان کے زرد صابن اور لوبان کی بو آتی تھی۔ میں ہمیشہ نو دو گیارہ ہو جاتا۔

''ایوگینی، سنتے ہو، اس چھوکرے کی خوب اچھی طرح تربیت ہونی چاہئے'' وہ بار بار اپنے بیٹے سے کہتی۔

وہ بڑی سعادت مندی سے سر جھکا دیتا، پیشانی پر بل ڈالتا اور منہ سے ایک لفظ نہ پھوٹتا۔ اس سبز ہستی کی موجودگی میں تو ہر شخص کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔

میں اس بڈھی سے نفرت کرتا تھا اور اس کے بیٹے سے بھی جس کے صلے میں کئی بار میری خاصی مرمت بھی ہوئی۔ ایک دن جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو بڈھی نے گول گول دیدے نچائے اور بولی:

''پیارے الیکسئی، آخر تو اتا مارا مار، اتے بڑے بڑے نوالے کیوں ٹھونستا ہے؟ دیکھنا کہیں گلے میں نوالے اٹک گئے تو دم گھٹ جائے گا!''

میں نے منہ سے نوالہ اگل دیا اور اسے کانٹے سے اٹھا کر اس کی ناک کے آگ لے جاتے ہوئے کہا:

''ایسا ہی کلیجہ پھٹ رہا ہے تو لو، کھا لو!''

ماں نے مجھے میز سے بھگا دیا اور دوچھتی میں بند کر دیا۔

بعد میں نانی میرے پاس آئیں اور منہ پر ہاتھ رکھ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگیں:

''اف، خدایا! اف خدایا! خدا سمجھے تجھ سے۔ کیسا چھوٹا سا شیطان ہے تو!''

ان کا منہ پر ہاتھ رکھنا کچھ مجھے جچا نہیں۔ اس لئے میں ان کے پاس سے بھاگا، چھت پر گیا اور دیر تک وہیں چمنی کے پیچھے بیٹھا رہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی شرارت کروں اور ان سب سے گستاخی کر

کے ان کے دل کباب کروں۔ یہ خواہش اتنی منہ زور تھی کہ دبائے نہ دبتی تھی۔ اپنی اس خواہش سے لڑنا میرے لئے دوبھر تھا، مگر لڑنا ہی پڑتا تھا، مجبوری جو تھی۔ ایک دن میں نے اپنے ہونے والے سوتیلے باپ اور ہونے والی دادی کی کرسیوں پر چیری کی رال لیس دی۔ دونوں کرسیوں سے چپک گئے۔ کیا کیا مسخرا پن کیا ہے پھر دونوں نے، مت پوچھئے۔ نانا ابا نے جی بھر کے میری دھلائی کی۔ اس کے بعد دوچھتی میں ماں آئیں اور مجھے دونوں زانوؤں کے درمیان زور سے دباتے ہوئے بولیں:

''اخر تو اتنی شرارت کیوں کرتا ہے، ایں؟ کاش تو جان سکتا کہ اس سے میرے دل پر کیا بیتتی ہے!''

ان کی آنکھوں میں روشن روشن آنسو تیرنے لگے اور انہوں نے میرا سر اپنے گال پر دبایا۔ اگر وہ مجھے طمانچہ جڑ دیتیں تو بات کہیں آسان ہوتی۔ میں نے عہد کیا ماں اگر تم رونا بند کر دو تو میں پھر کبھی ان کا دل نہیں دکھاؤں گا۔

''یہ ٹھیک ہے'' ماں نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں شرارت نہ کرو۔ جلد ہی ہماری شادی ہو جائے گی اور ہم ماسکو جائیں گے۔ اس کے بعد جب ہم واپس آئیں گے تو تو ہمارے ساتھ رہے گا۔ ایوگینی واسیلیوچ بڑے نیک دل اور عقل مند ہیں۔ تو بھی کالج میں پڑھے گا، ان ہی کی طرح۔ پھر تو ڈاکٹر بنیگا یا اور کچھ جو بھی تیرا جی چاہے پڑھا لکھا آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ اچھا جا، جا کر کھیل...''

یہ سارے ''پھر'' اور ''اس کے بعد'' ایک زینے کی طرح نیچے اترتے چلے گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ زینہ مجھے ماں سے چھین کر کہیں اندھیرے میں لے جا رہا ہے، میں تنہائیوں میں گم ہو رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے جس مستقبل کی جھلک دکھائی تھی اس میں میرے دل کی مسرت نہ تھی۔ میں اپنی ماں سے کہنا چاہتا تھا:

''شادی نہ کرو ماں۔ میں کروں گا کام کاج اور خوشی خوشی تمہارا بوجھ اٹھاؤں گا!''

لیکن میں نے یہ بات کہی نہیں۔ ماں کو دیکھ کر میرے دل میں بڑے نازک اور لطیف جذبات جاگتے۔ لیکن میں ان کا اظہار کبھی نہ کر پاتا۔

باغ میں میرا کام دن بہ دن آگے بڑھتا رہا۔ میں نے جھاڑ جھنکاڑ نوچ پھینکے۔ گڈھے کے کناروں کو اینٹوں سے مضبوط کر دیا۔ دوسری اینٹوں سے میں نے اپنے لیٹنے بھر کا چبوترا تیار کیا۔ میں نے رنگین شیشے اور ٹوٹی ہوئی پلیٹوں کے ٹکڑے اکٹھے کئے، ان کو اینٹوں کے درمیان چکنی مٹی سے بٹھایا۔ جب ان پر

دھوپ چمکتی تو وہ گرجے کی شبیہوں کی طرح شعلہ گوں جگمگا اٹھتیں۔

''ابے تو تو بڑا کائیاں نکلا۔ کیا چیز بنائی ہے!'' ایک دن نانا نے میرے آشیاں کا معائنہ کر کے کہا۔

''لیکن مشکل یہ ہے کہ جھاڑ جھنکاڑ پھر اگ آئیں گے۔ تو نے جڑیں جو رہنے دیں۔ اچھا جا بیلچہ لے آ، میں نکال دیتا ہوں جڑیں!''

جب میں بیلچہ لے آیا تو انہوں نے ہاتھوں پر تھوکتے ہوئے بیلچہ اٹھالیا اور بڑے زور سے بیلچہ کی تیز دھار زمین میں گہری گاڑ دی۔

''جڑیں پھینک دیں! میں یہاں تیرے لئے سورج مکھی اور مالوا کے پھول لگا دوں گا۔ بڑا شاندار رہے گا۔ ایں؟''

یکا یک وہ بے حس و حرکت بیلچے کے سہارے کھڑے ہو گئے، بالکل چپ۔ میں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور روشن تھیں، کتے کی آنکھوں کی طرح۔

''قصہ کیا ہے؟''

انہوں نے خود کو جھنجوڑا، ایک ہاتھ سے منہ پونچھا اور میری طرف دیکھا۔

''ہوں، دیکھا ہے، مجھے ابھی سے پسینہ آ گیا۔ دیکھ تو ذرا کتنے کیڑے ہیں!''

وہ پھر زمین کھودنے لگے۔ یکا یک بولے:

''لیکن ان باتوں میں رکھا کیا ہے۔ بیکار، فضول! جلد ہی میں مکان بیچ دوں گا۔ خزاں تک ضرور بیچ دوں گا۔ تیری ماں کے لئے جہیز چاہئے۔ ہونہہ کم سے کم وہ تو ٹھکانے سے رہے...''

انہوں نے ہاتھ جھٹک کر بیلچہ پھینک دیا اور باغ کے کونے میں حمام کے پیچھے چلے گئے جہاں ان کے پودگھر تھے۔ میں نے کھدائی شروع کر دی اور فوراً بیلچے سے اپنا پنجہ کاٹ کر رکھ دیا۔

اس زخم نے کچھ ایسا گل کھلایا کہ میں ماں کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ میں صرف پھاٹک تک گیا اور وہاں سے میں نے ماں کو ماکسیموف کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا جو ماں کا بازو تھامے ہوئے تھا۔ ماں کا سر جھکا ہوا تھا، ماں کے قدم اینٹ کے فٹ پاتھ پر ڈراڑوں سے جھانکتی ہوئی ہری دوب پر بڑی احتیاط سے اٹھ رہے تھے جیسے کانٹوں پر چل رہی ہوں۔

شادی بڑی خاموشی سے ہوئی۔ شادی کی رسم کے بعد جو چائے ناشتے کا دور چلا اس سے بھی کوئی گرمی پیدا نہیں ہوئی۔ میری ماں فوراً اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئیں اور اپنے بکس ٹھیک کرنے لگیں۔ میرا سوتیلا باپ میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔ بولا:

''میں نے تمہیں رنگوں کا تحفہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر ایسے رنگ یہاں نہیں ملتے اور اپنے رنگ تمہیں دے نہیں سکتا۔ میں تجھے رنگ ماسکو سے بھیج دوں گا۔''

''کیا تم تصویریں بنانا نہیں چاہتے؟''

''مجھے آتا ہی نہیں۔''

''اچھا تو پھر کچھ اور بھیج دوں گا۔''

میری ماں اندر آئیں۔

''ہم جلدی لوٹ آئیں گے'' ماں نے کہا۔ ''جیسے ہی تمہارے ابا امتحان پاس کریں گے اور تعلیم ختم ہوگی ہم واپس آجائیں گے۔''

وہ لوگ مجھ سے بڑوں کی طرح بات کر رہے تھے۔ یہ بات میرے دل کو بہت بھائی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بڑی حیرانی کی تھی کہ اتنی بڑی داڑھی والا آدمی پڑھ رہا ہے۔

''کیا پڑھ رہے ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''پیائش۔''

اب یہ پوچھنے کی زحمت کون اٹھاتا بھلا کہ یہ پیائش کس چڑیا کا نام ہے۔ گھر پر بڑا تکلیف دہ سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے اونی دھاگا سرسرا رہا ہو۔ میں بڑی بیقراری سے رات کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ نانا تندور کی طرف پشت کئے ادھ کھلی آنکھوں سے کھڑکی کے باہر گھور رہے تھے۔ سبز عورت سامان سفر باندھنے میں ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور ہائے واٹے کرتی جا رہی تھی۔ نانی دوپہر سے پی پلا کر نشے میں دھت تھیں۔ وہ دوچھتی میں بند کر دی گئی تھیں تاکہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے اور خاندان کی ناک نہ کٹے۔

اگلی صبح تڑکے ہی ماں روانہ ہوگئیں۔ جدا ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے کلیجے سے لگایا، مجھے یوں اٹھا لیا گویا میں روئی کا گالا ہوں۔ انہوں نے اس وقت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ جانے کن نظروں سے دیکھا۔ ایسی نظروں سے تو انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا۔ ایسی نظروں سے تو انہوں نے پہلے

کبھی نہ دیکھا تھا۔انہوں نے مجھے پیار کیا اور بولیں:

''اچھا خدا حافظ...''

''اس سے کہتی جاؤ میرے کہنے میں رہے'' نانا نے بگڑے تیور کے ساتھ آسمان کی طرف گھورتے ہوئے کہا جواب تک گلنار تھا۔

''تجھے اپنے نانا ابا کی باتوں پر کان دھرنا چاہئے'' ماں نے میرے اوپر صلیب کا نشان بناتے ہوئے تنبیہہ کی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ماں کچھ اور کہیں گی۔ نانا کے اس طرح بیچ میں ٹپک پڑنے پر مجھے بہت غصہ آیا۔

ماں اور میرا سوتیلا باپ دونوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھے۔ ماں کا اسکرٹ کسی چیز میں پھنس گیا اور وہ دیر تک بھپر بھپر کر اس کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہیں۔

''ماں کا ہاتھ کیوں نہیں بٹاتا، سوجھتا نہیں تجھے، ایں؟'' نانا نے مجھ سے کہا۔لیکن اس وقت میرے دل کے پرزے اڑ رہے تھے۔ میں ہاتھ بٹانے کی ہمت کہاں سے لاتا۔

ماکسیموف نے بڑی احتیاط سے چست نیلی پتلون میں چھپی ہوئی لمبی لمبی ٹانگیں گاڑی میں رکھیں۔ نانی نے اس کو چند گٹھریاں اور پوٹلیاں دیں جن کا ڈھیر سا لگ گیا اسکے زانوؤں پر۔ یہ ڈھیر اس کی ٹھوڑی کو چھونے لگا۔

''بس!'' اس نے گھبرا کر کہا اور اس کی زرد بھوئیں سکڑ گئیں۔

سبز عورت اور اس کا بڑا بیٹا، جو افسر تھا، دوسری گاڑی میں بیٹھے۔ سبز عورت موم کے پتلے کی طرح تنی بیٹھی تھی۔ اس کا بیٹا تلوار کے دستے سے داڑھی کھجا رہا تھا اور برابر جمائیاں لئے جا رہا تھا۔

''اچھا تو اب تم جنگ پر جا رہے ہو؟'' نانا نے پوچھا۔

''بے شک!''

''بہت خوب، ذرا ترکوں کی پٹائی کی ضرورت بھی ہے۔''

جانے والے چل دئے۔ ماں نے کئی بار مڑ کر دیکھا اور ہوا میں رومال ہلایا۔ نانی روتے ہوئے مکان کی دیوار کے سہارے کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے بھی ہاتھ ہلایا۔ نانا چپ چاپ کھڑے آنکھیں میچ کر آنسو ٹپکاتے رہے۔

''خیر...اس کا انجام...اچھا نہ ہوگا...'' وہ بڑبڑائے۔

میں اسٹول پر بیٹھا گاڑی کو ہچکولے کھاتے، موڑ پر آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ میرے دل میں کوئی دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ کس کر...

ابھی سویرا تھا۔ سڑکیں اب تک سنسان تھیں اور کھڑکیاں بند۔ پہلے کبھی اس کھوکھلے پن کا، اس خلا کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کہیں دور سے گڈریے کی بانسری کی ہٹ دھرم تان سنائی دی۔

''چل ناشتہ کر'' نانا نے کہا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''لگتا ہے تیری قسمت میں میرے ساتھ ہی گزر بسر کرنا لکھا ہے۔ تو گویا ماچس کی تیلی ہے اور میں پتھر۔ اچھا ہے تیلی پتھر پر رگڑی جا رہی ہے!''

صبح سے شام تک ہم نے باغ میں خاموشی سے کام کیا۔ انہوں نے زمین کھودی، رس بھریوں کی جھاڑیوں کو باندھا، سیب کے درختوں سے کائی جھاڑی کیڑوں کا بھرتہ بنایا۔ میں اپنے گوشے کو ٹھیک ٹھاک کرتا رہا، سجاتا رہا۔ نانا نے حمام کی جلی ہوئی شہتیر کے زمین سے نکلے ہوئے سرے کو تراشا اور زمین میں کھمبے گاڑ دئے جن پر میں نے چڑیوں کے پنجرے لٹکا دئے۔ میں نے جھاڑیوں اور ٹہنیوں سے ایک شامیانہ سا بنایا اور دھوپ اور شبنم سے بچنے کے لئے چبوترے کے اوپر ڈال دیا۔

''ہاں یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آدمی اپنے سے اپنے لئے چیزیں بنانے اور سجانے کا گر سیکھ لے!'' نانا نے کہا۔

زندگی کے بارے میں جب وہ کوئی بات کہتے تو میں اس کو گرہ سے باندھ لیتا۔ کبھی کبھی وہ اینٹوں کی نشست پر لیٹ جاتے جس کو میں نے گھاس سے ڈھک دیا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بولتے۔

''اب تو اپنی ماں کے جسم کا کٹا ہوا ٹکڑا ہے۔ اب اس کے اور بچے ہوں گے جو تجھ سے زیادہ اس کے کلیجے کے ٹکڑے ہوں گے۔ تو خود ہی جانتا ہے تیری نانی اماں پینے لگی ہے۔''

وہ خاموش ہو جاتے، دیر تک خاموشی کی مہر نہ ٹوٹتی جیسے چپ چاپ کچھ سن رہے ہوں۔ پھر ان کے بھاری بھاری لفظ ہونٹوں سے گرنے لگے:

''یہ دوسری بار اسے شراب کی لت پڑی ہے۔ پہلی بار اس وقت جب میخائل کے فوج میں جانے کا قصہ تھا۔ تیری نانی بالکل میرے گلے پڑ گئی کہ میں رشوت دے کر اس کی نجات کا پراونہ حاصل کر لوں۔

سوجھی ہوا۔ بیوقوف کہیں کی۔ اگر وہ فوج میں ہوتا تو شاید سنبھل جاتا۔ تھو...و...و، کیا لوگ ہیں! اور میں جلد مر جاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو بالکل اکیلا رہ جائے گا۔ سمجھا؟ بالکل اکیلا، تو اپنی زندگی کا مالک ہوگا، ہونہہ، خود ہی اپنی خدمت کر اور کبھی دوسروں کو موقع نہ دے کہ تجھ سے خدمت لیں! چپ چاپ رہ، دھیرج رکھ مگر چل اسی راستے پر جو تیرا راستہ ہے۔ سب کی باتیں سن مگر کر وہی جو تیرا دل کہتا ہے...''

بارش والے دنوں کو چھوڑ کر ساری گرمی میں نے باغ میں کاٹ دی، جب راتیں گرم ہوتیں تو وہیں باہر ہی سو بھی جاتا۔ نانی نے بستر کے لئے نمدے کا ایک ٹکڑا دے دیا تھا۔ وہ خود بھی اکثر راتیں میرے ساتھ ہی گزارتیں۔ وہ آتیں تو بغل میں پیال دبائے آتیں اور میرے صوفے کے پہلو میں پیال بچھا کر لیٹ جاتیں۔ پھر کہانیاں کہتیں۔ بیچ بیچ میں وہ پکار اٹھتیں:

''دیکھ، وہ ستارا ٹوٹا! یہ کسی کی روح ہے، تڑپ ہوگی اپنی دھرتی ماں کے لئے! جانو کسی اچھی اور نیک انسان نے جنم لیا۔''

یا:

''عقل کے دشمنو، کیا مرنے کی سوجھی ہے'' نانا بڑبڑاتے۔ ''ٹھنڈک سے اکڑ جاؤ گے اور چوڑا کو آئے تو گلا کاٹ دیں گے...!''

سورج ڈوبنے لگتا تو آسمان پر آگ کے سیلابی دریا موجیں مارنے لگتے۔ دریاؤں کا دم ٹوٹتا اور سرخی مائل سنہری راکھ باغوں کے سبز مخمل پر بچھ جاتی۔ تب سرمئی اندھیرا دنیا پر ہاتھ رکھتا دکھائی دیتا۔ دنیا پھولتی اور پھیلتی ہوئی اور دھندلکے کو اپنی رگ رگ میں جذب کرتی ہوئی معلوم ہوتی۔ دھوپ کے جلائے ہوئے پتے شاخوں پر جھک جاتے اور گھاس زمین پر سر جھکا دیتی۔ ہر چیز میں زیادہ جان پڑ جاتی، ہر چیز زیادہ نرم ہو جاتی۔ ہر چیز سے خوشبو چھنتی، موسیقی سے بھی زیادہ لطیف خوشبو۔ دور دور میدانوں کے فوجی پڑاؤں سے صبح کی موسیقی کی دھنیں تیرتی ہوئی آتیں۔ رات اپنے ساتھ ایک ایسا جذبہ، ایک ایسا احساس لاتی جو ماں کی محبت کی طرح زوردار اور تازگی بخش ہوتا۔ خاموشی کیا تھی ماں کا پیار تھا، نرم نرم ہتھیلیوں سے دل کو تھپکنے والی خاموشی! خاموشی دل کے تمام زخموں پر مرہم رکھتی، دن بھر جو باریک اور دم گھوٹنے والا غبار جمع ہوتا اسے یہ خاموشی اپنی ہتھیلیوں سے صاف کر دیتی۔ لیٹے لیٹے آسمان کو گھورتے رہنے میں بڑا لطف آتا۔ ستارے آنکھیں کھول رہے ہیں اور آسمان کی گہرائیوں کو اور گہرا بنا رہے ہیں۔ ایسا لگتا جیسے یہ

گریزاں گہرائیاں مجھے چپکے سے زمین سے اٹھا لیتی ہیں اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا کہ زمین سکڑ کر میرے برابر کی ہوگئی ہے یا میں خود اتنا پھیل گیا ہوں کہ وہ کائنات جس کی آغوش میں خود میں تھا اب میرے بازوؤں میں سما گئی ہے۔ خاموشی بڑھتی چلی جاتی، اندھیرا اور دبیز ہوتا چلا جاتا لیکن ان دیکھے تار تھرتھراتے رہتے۔ ہلکی ہلکی آوازیں پھوٹتی رہتیں۔ ہر آواز، چاہے یہ آواز سوئی ہوئی چڑیا کی ہو یا گزرتے ہوئے ساہی کی سرسراہٹ یا کسی انسان کی صدا۔ ان تمام آوازوں میں ایک بات ایسی ہوتی جو ان کو دن کی آوازوں سے الگ کرتی اور جن کی شدت حساس خاموشی کے دباؤ سے دوبالا ہو جاتی۔

اکارڈین کی گونج، عورت کا قہقہہ، سڑک کے پتھروں پر تڑختی ہوئی ٹاپ، کتے کی غراہٹ۔ یہ ساری آوازیں دن کی شاخوں سے آخری پتوں کی طرح جھڑ جاتیں۔

کبھی کبھی رات کو سڑک پر یا کھلے میدان میں نشے میں ڈوبی ہوئی آوازوں کا شور بلند ہوتا، بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دیتی۔ یہ آوازیں بہت معمولی تھیں، اتنی معمولی کہ ان کی طرف دھیان بھی نہ جاتا۔

نانی اماں گھنٹوں لیٹی رہتیں، ان کے بازو سر کے نیچے پڑے رہتے۔ وہ پڑی پڑی بڑے خاموشی جذبے کے ساتھ کوئی داستان سنائی رہتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ انہیں اس کی ذرا پروا نہیں کہ میں سن رہا ہوں یا نہیں۔ وہ کبھی بھی کسی ایسے قصے کے تانے بانے بننے سے نہ چوکتیں جو رات کی خوبصورتی اور جوانی میں اور جان نہ ڈال دے۔

میں ان کی باتوں کی لوری سنتے سنتے سو جاتا۔ اٹھتا تو دھوپ میرے چہرے پر مچلتی ہوتی اور کانوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ کا شہد ٹپکتا ہوتا۔ صبا کی رگوں میں دھوپ کی گرمی دوڑتی اور وہ دبے پاؤں اٹھتی، سیب کے درختوں کے پتوں سے شبنم کے موتی جھڑ جاتے، لم گھاس سے روشنی سی پھوٹتی۔ منڈلاتی ہوئی دھند کے پردے میں چھپی ہوئی گھاس میں شفاف بلوریں خیرگی پیدا ہو جاتی۔ کہیں ان دیکھی بلندیوں سے ابابیل کا نغمہ سنائی دیتا اور نئے دن کی تمام آہٹیں اور رنگ میرے دل میں شبنم کی طرح جذب ہو جاتے۔ دل میں ایک خواہش انگڑائی لیتی، اٹھوں اور چاروں طرف کی سیر کروں اور تمام جاندار چیزوں کے ساتھ زندہ رہوں، ان کے سر میں سر ملا کر گاؤں۔

یہ میری زندگی کا سب سے پرسکون دور تھا۔ میں اس زمانے میں سوچتا رہا، خواب دیکھتا رہا۔

گرمیوں کا یہ موسم ہی وہ موسم تھا جس نے میرے دل میں اپنی قوت کا احساس بیدار کیا۔ میں لوگوں سے کترانے لگا۔ اوفسیا نیکوف خاندان کے بچوں کی آوازیں اور چیخ پکار سن کر اب ان کیپاس جانے کو جی نہ چاہتا۔ اور جب ممیرے بھائی میرے پاس آتے تو مجھے کوئی خوشی نہ ہوتی۔ الٹا مجھے دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں باغ میں میرے گھر کا ناس نہ کر دیں۔ وہ چیز جو میں نے پہلی بار اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔

اب نانا کی نصیحتوں اور وعظوں میں بھی مجھے مزا نہ آتا۔ درشتی اور شکوہ وشکایت کا راگ زیادہ تیز ہوتا گیا۔ اب آئے دن نانی اماں سے ان کا جھگڑا ہونے لگا۔ نانی کو وہ نکال دیتے۔ وہ ایسے میں یاکوف ماموں یا میخائل ماموں کے ہاں چلی جاتیں۔ کبھی کبھی وہ کئی کئی دن گھر نہ آتیں۔ پھر نانا خود ہی اپنے لئے اور میرے لئے کھانا پکاتے۔ کھانا پکاتے اور بکتے جھکتے رہتے، کبھی انگلیاں جلا لیتے، کبھی پلیٹیں توڑ دیتے۔ دن بدن ان کا لالچ بڑھتا ہی رہا۔

جب باغ کو کونے میں وہ میرے پاس آتے تو بڑے مزے میں آرام سے گھاس پر بیٹھ جاتے اور دیر تک چپ چاپ مجھے دیکھتے رہتے۔ اس کے بعد یکا یک پوچھتے:

''ارے کچھ پھوٹتا کیوں نہیں؟''

''نہ جانے کیوں۔''

''ہم اونچے لوگ تو ہیں نہیں، تو جانتا ہے'' وہ نصیحت کے انداز میں کہنا شروع کرتے۔ ''کوئی بھی ہمیں کچھ سکھانے سے رہا۔ ہمیں یہ سب خود ہی سیکھنا ہوگا۔ دوسروں کے لئے کتابیں لکھی گئی ہیں، اسکول بنائے گئے ہیں۔ ہمارے لئے کچھ بھی نہیں! ہمیں سب کچھ خود ہی پانا ہوگا، حاصل کرنا ہوگا...''

وہ بالکل کھو جاتے۔ بے حس وحرکت اور خاموش اپنے خیال میں گم۔ ایسے میں ان کی طرف دیکھتے ڈر لگتا۔

خزاں کے موسم میں انہوں نے مکان بیچ دیا۔ مکان بیچنے سے ایک دن پہلے ناشتے کی میز پر انہوں نے نانی سے پاس انگیز آواز سے فیصلہ کن انداز میں کہا:

''وروارا کی ماں، میں ایک زمانے سے تمہیں کھلا پلا رہا ہوں۔ مگر اب تماشا ختم ہوا۔ اب تمہیں اپنی روٹی آپ ہی کمانی پڑے گی!''

نانی بالکل خاموش بیٹھی رہیں جیسے انہیں بہت دنوں سے یہ سننے کی امید تھی۔ انہوں نے بڑے

اطمینان سے نسوار کی ڈبیہ نکالی، اسفنج جیسی ناک میں نسوار چڑھائی اور جواب دیا:

''ٹھیک ہے، کیا کیا جائے! ہر حال میں مگن رہنا ہے...'' کمرے کرائے پر لے لئے۔ مکان بدلنے کے دوران میں نانی نے لمبے فیتے والا جوتا اٹھایا اور اسے تندور کے نیچے گھسیڑ دیا۔ وہ فرش پر دوزانو بیٹھ گئیں اور تندور کے آسیب سے کہنا شروع کیا:

''اے آسیب آ، اے آسیب آ۔ اندر کی سیر کر اور ہمارے نئے گھر میں قسمت کا ستارہ اوج پر لا...''

نانا احاطے میں تھے۔ انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

''اسے بھی لے جا رہی ہو کیا؟ کافر کہیں کی، میں تجھے ایسا سبق پڑھاؤں گا کہ تو بھی یاد کرے گی! تو مجھے یوں ذلیل کرے گی ایں؟''

''اف، وروارا کے ابا سنبھل کے، خبردار! دیکھ لینا ہم پر کوئی بڑی آفت آئے گی!'' نانی اماں نے چنوتی دی مگر نانا ابا غصے میں بھوت ہو گئے اور انہوں نے آسیب کو ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔

تین دن تک نانا پرانا مال خریدنے والے تاتاری کے ہاتھ فرنیچر وغیرہ بیچتے رہے۔ تاتاری بے تحاشا گالیاں بکتے جاتے اور مول تول کرتے جاتے۔ نانی ان کو کھڑکی سے دیکھتی رہتیں، کبھی ہنس دیتیں، کبھی رونے لگتیں اور ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہلتے اور کچھ کہتے:

''لے چلو...توڑ دو...''

میں بھی باغ میں اپنی کٹیا کو چھوڑتے ہوئے رو پڑا۔

دو گاڑیاں آئیں۔ ان میں سامان رکھا گیا۔ میں جس گاڑی میں بیٹھا وہ ایسی چرخ چوں چرخ چوں چل رہی تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھے پھینک دینا چاہتی ہے۔ جھٹکے دے دے کر کوئی مجھے اٹھا کر پھینکے دے رہا ہے... یہ احساس اگلے دو برس تک میرے پورے وجود پر چھایا رہا۔ میری ماں کی موت کے دن تک!

نانا کے تہہ خانے میں اٹھ آنے کے بعد جلد ہی میری ماں ملنے آئیں۔ وہ بالکل زرد اور دبلی ہو گئی تھیں۔ ان کی یہ بڑی بڑی آنکھیں جل رہی تھیں جن سے ایک قسم کی حیرانی جھانک رہی تھی۔ انہوں نے ہر چیز کو غور سے دیکھا جیسے وہ اپنے ماں باپ کو اور مجھے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ انہوں نے ہم لوگوں کی طرح دیکھا اور کچھ بولیں نہیں۔ سوتیلے باپ پورے کمرے میں ٹہلتے رہے، سانس روک کر سیٹی

بجاتے رہے، گلا صاف کرتے رہے اور کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے انگوٹھوں کو نچاتے رہے۔

''خدا کی پناہ، تو کتا بڑا ہو گیا!'' ماں نے میرے گالوں کو گرم ہتھیلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔ وہ ڈھیلا ڈھالا اور بے ڈھنگا سا بھورا لباس پہنے ہوئے تھیں جو پیٹ پر پھولا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

''ہلو!'' سوتیلے باپ نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا حال چال ہیں؟''

اس نے ناک سکیڑ کر ہوا میں کچھ سونگھا اور بولا:

''یہاں تو سیلن ہے!''

دونوں بہت ہی تھکے ہمارے اور میلے کچیلے سے نظر آ رہے تھے جیسے وہ پورے وقت دوڑتے رہے ہیں اور اب ان کے دل میں لیٹ کر آرام کرنے کے سوا اور کوئی خواہش نہ ہو۔

ہماری چائے کا دور کچھ سنسان سا رہا۔ پورے وقت نانا ابا برستے پانی کو کھڑکیوں کے شیشوں پر دوڑتے ہوئے دیکھتے رہے۔ انہوں نے پوچھا:

''پھر۔ تو سب کچھ آگ میں جل کر رہ گیا، ایں؟''

''سب کچھ'' سوتیلے باپ نے بڑے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہم بڑی مشکل سے بال بال بچ گئے۔''

''ہوں، ہاں آگ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔''

ماں نے نانی کے کان میں کچھ کہا۔ نانی کی آنکھیں مچ گئیں جیسے تیز روشنی نے یکا یک آنکھوں میں چکا چوند مچا دی ہو۔ فضا اور بھی اداس اور سنسان سی ہو گئی۔

یکا یک نانا نے کچھ جلانے کے سے انداز میں بلند اور پرسکون آواز میں کہا:

''ایوگینی واسیلیوچ، میں نے افواہیں سنی ہیں کہ آگ واگ کچھ نہیں لگی اور تم سب کچھ تاش کی بازی پر ہار بیٹھے۔''

قبرستان کا سا سناٹا چھا گیا۔ صرف کھڑکیوں کے شیشوں پر بارش کی پٹر پٹر اور سماوار کی سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔

''ابا!'' نانا گرجے۔ ''اچھا آگے؟ کہا نہیں تھا میں نے کہ تیس برس کی عورت کا بیس برس کے چھوکرے سے بیاہ کرنا پاگل پن ہے؟ لو اب دیکھ لو تماشا۔ ہے نا بڑھیا نمونہ؟ ایں؟ کہو بیٹی۔ کیسا لگا یہ تماشا،

ایں؟''

پھر تو چاروں نے چیخنا چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ سوتیلے باپ کی چنگھاڑ سب سے تیز تھی۔ میں گلیارے میں چلا گیا اور لکڑی کے کندوں کے ڈھیر پر سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ نہیں یہ میری ماں نہیں۔ میری ماں تو بالکل دوسری تھی، بالکل کوئی اور۔ میں نے کمرے ہی میں یہ محسوس کر لیا تھا لیکن اب یہاں باہر گلیارے میں بیٹے بیٹے آنکھوں میں ماں کی پچھلی تصویر پھر گئی۔

پھر اس کے بعد۔ ہاں کچھ یاد نہیں آتا کیا ہوا، کیسے ہوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں سورموہ کے ایک نئے مکان میں رہنے لگا جس کی دیواریں لکڑی کے کندوں کی تھیں۔ دیواروں پر کاغذ منڈھا ہوا نہیں تھا۔ کندوں کے درمیان دڑاڑیں سن سے بھر دی گئی تھیں اور اب یہاں ان گنت تل چٹوں کا بسیرا تھا۔ ماں اور سوتیلا باپ دونوں ان دو کمروں میں رہتے تھے جن کا رخ سڑک کی طرف تھا۔ میں اور نانی اماں باورچی خانے میں رہتے تھے جس میں ایک کھڑکی تھی اور یہ کھڑکی پڑوس کی چھت پر کھلتی تھی۔ آسمان کے پس منظر میں سیاہ کارخانے کے چمنی کے نقوش نظر آتے تھے۔ کارخانہ پیچ وخم کھاتا ہوا گاڑھا گاڑھا دھواں اگلتا رہتا جس کو جاڑے کی ہوا پورے ضلع پر بکھیر دیتی۔ دھویں کی چپچپاہٹ بھری بو ہمارے کمروں میں بسی ہوئی تھی۔ صبح تڑکے کارخانے کی سیٹی بھیڑیوں کی چیخ کی طرح سنائی دیتی:

''اوں اوں! اوں اوں!''

جب بنچ پر کھڑے ہو کر کھڑکیوں کے اوپر والے شیشوں سے باہر دیکھتا تو کارخانے کے روشن پھاٹک دکھائی دیتے جو بڈھے پوپلے فقیر کی طرح منہ کھولے چھوٹے چھوٹے لوگوں کو نگلتا ہوا معلوم ہوتا۔ دوپہر کو ایک اور بھونپو بجتا۔ پھاٹک کے کالے ہونٹ کھل جاتے اور بہت بڑا سا گہرا گڈھا سا نظر آتا جو ان ہی چھوٹے چھوٹے لوگوں کو اگل دیتا۔ اب وہ لوگ کالے چشموں کی طرح سڑکوں پر بہتے ہوئے معلوم ہوتے اور سفید ہوا کے کھردرے ہاتھ ان کو دھکیلتے ہوئے گھروں کی طرف لے جاتے۔ آسمان شاید ہی کبھی دکھائی دیتا۔ ضلع کی چھتوں کے اوپر ایک اور چھت لٹکتی نظر آتی۔ تھکتی ہوئی، بھوری بھوری۔ اوپر کے بے جان اور مٹیالے منظر سے تصور کی دھار کند ہو جاتی اور آنکھوں میں اندھیرا سا چھا جاتا۔

شام کے وقت کارخانے کے اوپر بجھی بجھی سرخ روشنی کا شامیانہ سا تن جاتا۔ اس روشنی سے چمنیوں کے کنارے چمک اٹھتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ چمنیاں زمیں سے نہیں اٹھی ہیں بلکہ اوپر بادلوں سے

نیچے گر رہی ہیں۔ سانس سے شعلے لپک رہے ہیں، کراہ رہے ہیں... ہر دن اس منظر کا تماشا دیکھنا ناقابل برداشت تھا۔ میرے دل میں ٹیس سی اٹھتی رہتی۔ نانی گھر کے جنجال میں پھنسی رہتیں۔ صبح سے شام تک کھانا پکاتی رہتیں، فرش صاف کرتی رہتیں، لکڑی کاٹتی رہتیں، پانی بھرتی رہتیں۔ جب شام آتی تو وہ تھکن سے نڈھال ہو کر کراہتیں اور ٹھنڈی سانس لیتیں۔ کبھی کبھی جب وہ کھانا پکا چکتیں تو چھوٹی سی روئی دار بنڈی پہن لیتیں، اسکرٹ چڑھاتیں اور شہر کی طرف نکل جاتیں۔

''چلیں جا کر دیکھیں بڑے میاں کے حال چال کیا ہیں...''

''مجھے بھی لے چلو!''

''پالے میں اکڑ کے رہ جائے گا! ذرا دیکھ تو سہی کیسی ہوا چل رہی ہے!''

وہ برف پوش میدانوں اور کھیتوں میں کھوئے ہوئے راستوں پر سات ورسٹ کا فاصلہ طے کر کے شہر جاتیں۔ میری ماں کے پیر بھاری تھے اس لئے جسم زرد ہو گیا تھا، سوج گیا تھا۔ وہ لمبی بنی ہوئی جھالر والی چیتھڑے چیتھڑے بھوری شال اوڑھے سمٹی سمٹائی بیٹھی رہتیں۔ مجھے اس شال سے نفرت تھی جوان کے لحیم شحیم خوبصورت جسم کو چھپا لیتی تھی۔ اس کے پھٹے پرانے کناروں سے مجھے چڑ تھی۔ اس لئے جھالر کو نوچ نوچ کر پھینکتا رہتا تھا۔ مجھے اس گھر سے، کارخانے سے، پورے ضلع سے نفرت تھی۔ ماں فلیٹ کے پھٹے پرانے جوتوں میں پھرا کرتیں، اس طرح کھانستیں کہ ان کا بڑا پیٹ پرانے جوتوں میں پھرا کرتیں، اس طرح کھانستیں کہ ان کا بڑا پیٹ لرز اٹھتا۔ ان کی سرمئی نیلی آنکھیں سخت اور کھولتے ہوئے غصے کی آگ سے چمکتی رہتیں یا پھر ان کی آنکھیں ننگی دیواروں پر جکڑ رکھا ہو۔ کبھی کبھی گھنٹہ گھنٹہ بھر کھڑکی سے سڑک کو گھورتی رہتیں۔ سڑک جبڑا سا معلوم ہوتی تھی۔ بڑھاپے نے دانت چھین لئے تھے یا ان کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ بعض دانت جڑ سے اکھڑ گئے تھے اور ان کی جگہ بے ہنگم اور ضرورت سے زیادہ بڑے دانت جڑ دئے گئے تھے۔

''ہم یہاں کیوں رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اف یہ مت پوچھو!'' ماں نے جواب دیا۔

ان دنوں ماں مجھ سے بہت کم بات کرتیں۔ ان کی تمام تر باتیں احکام اور گذاشوں تک محدود تھیں۔

''ذرا وہ چیز لے آنا۔ یہ لے لینا، ذرا بھاگ کر دوکان جائیو...''

وہ مجھے کبھی کبھار ہی باہر جا کر کھیلنے دیتیں کیونکہ میں خوب پٹ پٹا کر گھر لوٹا کرتا۔لڑائی میری اکلوتی خوشی تھی۔لڑائی کے گرداب میں تو میں اپنی فطرت کے پورے جوش اور تلاطم کے ساتھ کود پڑتا۔ماں اس کی سزا دیتیں۔لیکن یہ سزا آگ پر تیل کے چھڑکاؤ کا کام کرتی اور میں اگلی لڑائی میں اور بھی وحشت کے ساتھ کود پڑتا۔ماں اور بھی زیادہ سزا دیتیں۔ایک بار میں نے دھمکی دی کہ اگر تم مارو گی تو میں تمہارے ہاتھ میں دانت گاڑ دوں گا اور باہر کھیتوں میں جا کر پالے سے ٹھٹھر جاؤں گا۔انہوں نے مجھے حیرانی سے دھکیل دیا اور ٹہلنے لگیں۔

''جانور کہیں کا!''انہوں نے نڈھال ہو کر ہانپتے ہوئے کہا۔

جذبات اور احساسات کی وہ زندہ اور لرزاں دھنک جس کا نام محبت ہے آہستہ آہستہ میرے دل میں دھندلی پڑنے لگی اور اس کی جگہ غصے کے نیلے شعلوں نے لے لی جو ہر شخص کی طرف، ہر چیز کی طرف لپکتے تھے۔اس دھنک کی جگہ دھواں اگلتی ہوئی بے چینی نے،اس احساس نے لے لی کہ میں اس بوجھل اور حماقتوں سے پر دنیا میں اکیلا ہوں۔

میرا سوتیلا باپ بڑا ترش رو تھا۔میری ماں سے کبھی کبھار ہی بات کرتا اور مجھ سے بڑی سختی برتتا تھا۔ وہ ہمیشہ سیٹی بجاتا اور کھانستا رہتا تھا یا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹیڑھے میڑھے دانتوں میں خلال کرتا رہتا تھا۔وہ میری ماں سے زیادہ جھگڑے کرنے کرنے لگا، وہ میری ماں کو بڑی سرد مہری سے غیروں کی طرح پکارتا۔اس سے میرے دل میں آگ لگ جاتی۔جب ان کا جھگڑا ہوتا تو وہ باورچی خانے کا دروازہ بند کر دیتا،ظاہر ہے وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی باتیں سنوں۔لیکن میں ضد میں اس کی کھردری کھرجدار آواز سن کر ہی دم لیتا۔

ایک بار وہ پیر پٹکتے ہوئے چلایا:

''بڑھیا گائے،اسی تیرے مٹکے کی وجہ سے میں کسی کو گھر پر نہیں بلا سکتا۔''

مارے حیرت اور غصے کے میں تندور کے اوپر والے تختے سے اچھل پڑا اور میرا سر چھت سے اتنے زور سے ٹکرایا کہ دانت سے زبان کٹ گئی۔

سنیچر کو مزدور میرے سوتیلے باپ کے پاس کھانے کے کوپن بیچنے آتے۔ان کوپنوں سے کارخانے کے اسٹور میں سامان خریدا جا سکتا تھا۔مزدوروں کو یہ کوپن اجرت کی جگہ ملتے تھے۔میرا سوتیلا باپ آدھی

قیمت میں یہ کوپن خرید لیتا۔ وہ مزدوروں سے باورچی خانے میں ملتا۔ وہ میز کے پیچھے بڑی شان سے بیٹھتا اور ہر کوپن پر منہ بناتا اور بڑبڑاتا:

''ڈیڑھ روبل۔''

''ایوگینی واسیلیوچ، یسوع مسیح کی خاطر...''

''ڈیڑھ روبل...''

یہ گڈمڈ اور تاریک زندگی زیادہ دنوں قائم نہیں رہی۔ ماں کے بچہ ہونے سے مجھے نانا کے یہاں رہنے کے لئے پہنچا دیا گیا۔ اب نانا کو ناوینو بستی کے پیسچانایا کوچے میں، نپولیانا گرجا گھر کے قبرستان کے اوپر ایک دومنزلہ مکان میں رہتے تھے۔ نانا کے چھوٹے سے کمرے میں ایک بڑا سا روسی تندور تھا اور دو کھڑکیاں جو صحن میں کھلتی تھیں۔

''خوب!'' مجھے دیکھتے ہی وہ کچھ چچیاتی ہوئی آواز میں ہنسے۔'' کہتے ہیں سب سے اچھی دوست ماں ہوتی ہے۔ لیکن تیرے معاملے میں قصہ ہی کچھ اور ہے۔ تیرا دوست ہے وہی بڈھا خناس نانا! تھو... و...و، کیا لوگ ہیں!''

ابھی میں گھر سے واجبی واجبی جان پہچان پیدا کر سکا تھا کہ ایک دن ماں اور نانی دونوں نئے بچے کے ساتھ آئیں۔ میرے سوتیلے باپ کی نوکری مزدوروں کو دھوکا دینے کے جرم میں جاتی رہی۔ لیکن اس نے فوراً دوستوں سے داد فریاد کیا اور اس ریلوے اسٹیشن میں ٹکٹ بابو کا کام مل گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ کافی عرصے بعد مجھے ماں کے ساتھ ایک پتھر کے مکان کے تہہ خانے میں زندگی بسر کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ماں نے فوراً اسکول میں داخل کرا دیا اور پہلے ہی دن مجھے اسکول سے نفرت ہوگئی۔

میں اسکول آیا تو کچھ یہ شان تھی۔ ماں کے جوتے پیروں میں، جسم پر نانی کے بلاؤز سے تراشا ہوا کوٹ، اور لمبی زرد قمیص اور لمبی پتلون۔ فوراً یاروں کو مذاق اور طبع آزمائی کا موقع ہاتھ آ گیا۔ میرا نام پڑ گیا ''اینٹ کا اکا''۔ میں نے جلد ہی لڑکوں کو سیدھا اور رام کر لیا۔ لیکن پادری اور استاد کو مجھ سے چڑ ہوگئی۔

استاد گنجا تھا اور اس کے چہرہ پیلا تھا۔ اسے نکسیر پھوٹنے کی بیماری تھی۔ وہ کلاس میں آتا تو ناک میں روئی کے پھائے ٹھسے ہوتے۔ وہ میز پر بیٹھتا، ناک سے بھنبھنائی ہوئی آواز میں ہم سے سوال کرتا اور بعض

لفظ پوری طرح ادا کئے بغیر ناک سے پھائے نکالتا اور سر ہلا ہلا کر ان کا جائزہ لیتا۔ اس کا چہرہ بالکل تھپکا ہوا، تانبے کا بنا ہوا، کڑوا کسیلا معلوم ہوتا تھا۔ لگتا تھا اس کی جھریوں سے کچھ عجیب قسم کی ہریالی جھلکتی تھی۔ اس کے خط وخال میں سب سے گھناؤنی چیز اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں۔ اس کے ناک نقشے کے اس معجون میں آنکھیں فالتو چیز معلوم ہوتی تھیں۔ اور لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر چپکی جا رہی ہیں۔ میرا جی چاہتا کہ میں ہاتھ سے نوچ کر ان آنکھوں کو اپنے چہرے سے الگ کر دوں۔

شروع کے چند دن تو میں سامنے کی بنچ پر بیٹھا بالکل استاد کی ناک تلے۔ لیکن یہ ناقابل برداشت تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کو میرے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ وہ مستقل ناک سے بولتا رہتا:

''پیسکوف... دوسری قمیص پہنو! پیسکوف ہلنا ڈولنا بند کرو! پیسکوف دیکھنا تمہارے جوتوں نے پھر فرش پر پورا تالاب بنا دیا!''

میں اس کا بدلہ لیتا اور ایک سے ایک بڑھ کے شرارتیں کرتا۔ ایک دن میں پالے کا مارا آدھا تربوز اٹھا لایا۔ میں نے اسے نکالا اور اندھیرے گلیارے میں دروازے پر ایک ڈور سے لٹکا دیا۔ جب دروازہ کھلتا تو تربوز ہوا میں بلند ہو جاتا۔ جب استاد نے دروازہ بند کیا تو تربوز بالکل ٹوپی کی طرح گرا اور اس کی کھوپڑی پر فٹ ہو گیا۔ رات کا چوکیدار ایک شکایت نامے کے ساتھ مجھے لے کر گھر گیا۔ مجھے اس شرارت کا مزا چکھایا گیا۔

ایک بار میں نے استاد کی ڈسک کی دراز میں نسوار چھڑک دی۔ استاد پر چھینکوں کا کچھ ایسا دورہ پڑا کہ اسے کلاس سے باہر جانا پڑا۔ اس نے اپنے داماد کو (جو افسر تھا) اپنی جگہ پڑھانے کو بھیجا۔ افسر نے ہمیں ''زار زندہ باد!'' اور ''آزادی، ہائے آزادی'' گانے پر بار بار مجبور کیا۔ اگر کوئی بے سرا ہو جاتا تو وہ ایک رولر سے لڑکے کے سر کو کھٹکھٹاتا۔ اس طرح کھٹا کھٹ کی آواز پیدا ہوتی اور بڑا مزا آتا۔ لیکن اس سے تکلیف نہ ہوتی۔

دینیات کا استاد نوجوان اور خوش رو پادری تھا اور اس کے بال پھولے پھولے سے تھے۔ اس کو میں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا کیونکہ میرے پاس ''تاریخ مقدس'' نہیں تھی۔ وہ مجھ سے اس لئے بھی خفا تھا کہ مین اس کے لب و لہجے کے نقل کیا کرتا تھا۔

کلاس میں آتے ہی کہتا:

''پیشکوف کتاب لائے یا نہیں؟ ہاں۔ کتاب؟''

''نہیں لایا۔ ہاں۔''

''ہاں۔ کیا مطلب؟''

''نہیں۔''

''جاؤ گھر جاؤ۔ ہاں۔ گھر۔ میں تمہیں نہیں پڑھاؤں گا۔ ہاں۔ ہرگز نہیں پڑھاؤں گا۔''

بھلا گھر جانے میں مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں اسکول کے ختم ہونے تک ضلع کی میلی کچیلی گلیوں میں مارا پھرتا، چاروں طرف شور و ہنگامے میں کھوئی ہوئی زندگی کا لطف اٹھاتا چلتا۔

پادری کا چہرہ بڑا ہی تیکھا، بالکل یسوع مسیح جیسا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نسوانیت اور محبت چھلکتی تھی۔ اس کے ہاتھ چھوٹے تھے۔ لگتا تھا کہ اس کے ہاتھ ہر چیز کے چھوتے نہیں بلکہ چومتے ہیں۔ چاہے یہ چیز کتاب ہو یا رولر یا قلم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہر چیز سے محبت کرتا ہے اور ہر چیز کو جاندار سمجھتا ہے جس کو بے احتیاطی سے چھونے سے صدمہ پہنچ سکتا ہو۔ وہ بچوں پر جان نہیں دیتا تھا مگر پھر بھی بچے اس کے دیوانے تھے۔

مجھے امتحان میں اچھے نمبر ملے۔ مگر اس کے باوجود مجھے اطلاع ملی کہ برے چال چلن کی وجہ سے اسکول سے چلتا کر دیا جائے گا۔ اب میری سٹی گم ہوئی۔ ظاہر ہے جان کی خیر نہ تھی۔ ماں کی جھلاہٹ روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ اور اب اکثر مجھ پر ہاتھ صاف کیا کرتی تھیں۔

لیکن میں اس سانحے سے بچ گیا۔ ناگہاں بشپ کریسانف☆ ہمارے اسکول پر نازل ہوا۔ جہاں تک یاد آتا ہے وہ کبڑا تھا۔

جب یہ ٹھگنے سے قد کا آدمی سیاہ قبا لہراتا ہوا کلاس میں داخل

☆ تین جلدوں پر مشتمل مشہور تصنیف ''دنیائے قدیم کے مذہب'' اور اخباری مضمون ''شادی اور عورتیں'' کا مصنف۔ یہ مضمون میں نے جوانی میں پڑھا تو مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ یہ مضمون میں نے جوانی میں پڑھا تو مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ غالباً میں نے عنوان ٹھیک نہیں لکھا۔ یہ مضمون ایک مذہبی رسالے میں پچھلی صدی کی آٹھویں دھائی میں شائع ہوا تھا۔

ہوااور ڈسک کے پاس بیٹھا تو پورے کمرے کی فضا میں بڑی گرمی اور جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ یہ فضا بالکل انجانی اوران دیکھی تھی۔

''اچھا، آؤ بچو بات چیت کریں ایک ذرا'' اس نے بڑی بڑی آستینوں سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔

فہرست کے آخر میں میرا نام تھا۔اس لئے ڈسک کی طرف جانے والوں میں آخر میں میری باری آئی۔

''کیا عمر ہے تمہاری؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔''سچ؟ اف اس عمر میں اتنے لمبے تڑنگے! لگتا ہے باہر بارش میں خوب بھیگے ہو!''

اس نے لمبے لمبے ناخنوں والا پتلا دبلا ہاتھ میز پر رکھا اور دوسرا ہاتھ چھدری چھدری داڑھی پر پھیرا اور مجھے بڑی محبت سے دیکھا۔

''اچھا۔تاریخ مقدس سے کوئی پرانی کہانی سناؤ۔''

جب میں نے کہا کہ میرے پاس کتاب نہیں ہے اس لئے تاریخ مقدس کی کہانی نہیں پڑھ سکتا تو انہوں نے اپنی اونچی ٹوپی ٹھیک کی اور بولے:

''یہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟ جانتے ہو تمہیں یہ سب جاننا چاہئے۔اچھا ہوسکتا ہے تمہیں بغیر کتاب کے ہی کچھ یاد ہو۔کہانیاں سنی ہیں کہیں کیا تم مناجات کو جانتے ہو؟ خوب! اور دعائیں؟ اچھا دیکھا تم نے! شاید تمہیں کسی ولی کی سوانح حیات بھی یاد ہو؟ شعر میں؟ لو تم تو میاں بڑے علامہ نکلے!''

ہمارا پادری اندر آیا، سرخ اور بھاپ اگلتا ہوا۔ بشپ اسکول کے پادری پر صلیب کا نشان بنا چکا تو اس نے میرے بارے میں کہنا شروع کیا۔

''ایک منٹ!'' بشپ نے اشارے سے اس کو روکتے ہوئے کہا۔ پھر وہ میری طرف مڑا۔''اچھا ولی اللہ الیکسئی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''کیوں بیٹے، ہے نا شاندار نظم؟'' میں رکا تو بشپ بولا کیونکہ میں ایک مصرعہ بھول گیا تھا۔

''شاید تمہیں کچھ اور بھی معلوم ہو۔حضرت داؤد کے بارے میں؟ بہت خوب۔سن کے بڑی خوشی ہوئی!''

میں نے دیکھا کہ وہ واقعی لطف اٹھا رہا ہے، سچ مچ اسے شاعری کا چاؤ تھا۔ وہ دیر تک سنتا رہا۔ پھر بولا:

''کیا تم نے مناجات سے پڑھنا سیکھا؟ کس نے پڑھایا ہے تم کو؟ تمہارے اچھے نانا نے؟ تمہارے برے نانا نے! خیر یہ تم یونہی کہہ رہے ہو! کہتے ہیں تم کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی شرارت سوجھتی رہتی ہے۔''

میں سرخ ہو گیا۔ لیکن میں نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا۔ استاد اور پادری نے خاصی تفصیل سے اس حقیقت کی تصدیق کی۔ بشپ نے آنکھیں جھکائے جھکائے ساری باتیں سنیں۔

''سنتے ہو تم کیا کہتے ہیں یہ لوگ تمہارے بارے میں؟'' آخر کار اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ادھر آؤ!''

اس نے ایک ہاتھ میرے سر پر رکھا جس سے سرو کی بو آ رہی تھی:

''تم اتنی شرارت کیوں کرتے ہو؟''

''اسکول میں جی اکتاتا ہے۔''

اسکول میں جی اکتاتا ہے؟ بیٹے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی غلطی ہے۔ اگر اسکول میں تمہارا جی نہ لگتا تو تم برے طالبعلم ہوتے۔ مگر تمہارے نمبروں سے معلوم ہوتا ہے ایسا نہیں ہے۔ ضرور کوئی اور بات ہو گئی۔''

اس نے قبا سے ایک چھوٹی سی کتاب نکالی اور اس میں کچھ لکھا:

''پیشکوف، الیکسئی۔ ہوں۔ بیٹے بھلا اسی میں ہے کہ تم شرارت چھوڑ دو۔ تھوڑی بہت شرارت تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن لوگ حد سے زیادہ تو نہیں جھیل سکتے نا! کیوں بچو کیا کہتے ہو؟''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ!'' چہکتی ہوئی آوازوں کا کورس سنائی دیا۔

''اور تمہارا کیا خیال ہے اپنے بارے میں تم تو بہت کم شرارت کرتے ہو نا؟ ایں؟''

''اوہ، نہیں! ہم بھی خوب کرتے ہیں!'' لڑکوں نے ہنس کر کہا۔

بشپ نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور کرسی پر اڑ گیا اور اتنے حیرت کے لہجے میں بولا کہ استاد اور پادری کو بھی ہنسی آ گئی:

''ذرا سوچو، تمہاری عمر میں تو میں بھی ڈٹ کے شرارت کرتا تھا۔ آخر ہم شرارت کیوں کرتے ہیں، ایں؟''

لڑکے ہنسنے لگے اور بشپ نے ان سے سوال کرنا شروع کئے۔ وہ بڑی چالاکی سے لڑکوں کو ان کی باتوں کے جال میں پھنسا دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فضا زیادہ گرم ہوتی چلی گئی۔ آخر وہ اٹھا اور بولا:

''تم سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا شریرو، مگر کیا کروں، جانا ہی پڑے گا۔''

اس نے بازو اٹھایا اور آستین جھٹک کر اوپر چڑھاتے ہوئے کلاس کے اوپر صلیب کا نشان بنانے لگا۔

''خدا کرے تمہیں مقدس باپ، اس کا بیٹا، اس کی پاک روشنی سیدھے راستے پر لگائے۔ خدا حافظ!''

''خدا حافظ، حضور پاک! جلدی آنا!'' لڑکے چلائے۔

''میں آؤں گا، ضرور آؤں گا'' اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے لئے کتابیں لاؤں گا۔''

پھر وہ استاد کی طرف مڑا:

''اب ان لوگوں کو گھر جانے دو!''

باہر گلیارے میں اس نے مجھے روکا اور ہلکی آواز میں بولا:

''وعدہ کرو اب تم اتنی زیادہ شرارت نہیں کرو گے، کرتے ہو وعدہ، ایں؟ ظاہر ہے، میں خوب جانتا ہوں تم شرارت کیوں کرتے ہو۔ اچھا خدا حافظ!''

میرے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ ایک عجیب جذبہ دل میں طوفان کی طرح اٹھ رہا تھا۔ اس لئے جب استاد نے مجھے کلاس کے بعد روکا اور کہنا شروع کیا کہ ''اب مہینے کی طرح رہنا کلاس میں سمجھے؟'' تو میں نے اس کی بات شوق سے سنی۔

پادری کوٹ پہن رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا:

''اب سے تم میری کلاس میں پڑھنا۔ ہاں ضرور۔ لیکن نچلے بیٹھنا چپ چاپ!''

اسکول میں تو حالت کچھ سدھر گئی مگر گھر میں ایک بری بات ہوگئی۔ میں اپنی ماں کا ایک روبل پار کر

لیا۔اس جرم کا فیصلہ میں نے پہلے سے نہیں کر رکھا تھا۔

ایک بار شام کو ماں مجھے بچے کے ساتھ اکیلا گھر چھوڑ گئی۔ کچھ کرنے دھرنے کو تھا نہیں اس لئے میں نے اپنے سوتیلے باپ کی ایک کتاب اٹھالی۔ ''ایک طبیب کی یادداشت'' جس کا مصنف دوماس ایلڈر تھا۔اس کے ورقوں میں مجھے ایک روبل اور دس روبل کا ایک ایک نوٹ نظر آیا۔ کتاب میرے لئے بہت مشکل تھی۔ میں نے کتاب جو بند کی تو دماغ میں ایک خیال کوند گیا کہ میں ایک روبل میں ''تاریخ مقدس'' بھی خرید سکتا ہوں اور ''رابن سن کروسو'' بھی۔ کچھ ہی دنوں پہلے مجھے اس قسم کی کتاب کی اطلاع ملی تھی۔ ایک دن وقفے میں میں لڑکوں کو جادو اور دیو پریوں کی کہانیاں سنا رہا تھا۔ یکا یک ایک لڑکے نے منہ بنا کر کہا:

''دیو پریوں کی کہانیوں میں کیا رکھا ہے۔ ہاں البتہ ''رابن سن کروسو'' چیز ہے۔ سچی کہانی!''

کچھ اور لڑکوں نے بھی ''رابن سن کروسو'' پڑھی تھی۔ ان سبنے کتاب کی تعریف کی۔ میرے دل کو صدمہ پہنچا کہ لوانہوں نے تو میری نانی کے قصوں پر چوٹ کر دی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کہیں نہ کہیں سے ''رابن سن کروسو'' حاصل کر کے پڑھوں گا۔ پھر کہوں گا ان سے ''ہونہہ! یونہی سی کتاب ہے!''

اگلے دن میں ''تاریخ مقدس'' آندرسن کی ''جادو کی کہانیاں'' کی دو جلدیں، ایک سیر سفید روٹی اور آدھ سیر ساسیج لئے اسکول پہنچا۔ ولادیمیر گرجا کے پاس ہی نکڑ پر ایک چھوٹی سی اندھیری دوکان میں مجھے ''رابن کروسو'' کی ایک جلد مل گئی۔ چھوٹی سی کتاب تھی، ادھڑی ہوئی زرد جلد والی کتاب۔ سرورق پر ایک دڑھیل کی تصویر تھی جس کے سر پر سمور کی ٹوپی تھی اور شانوں پر شیر کی کھال۔ اس میں کوئی کشش نہ محسوس ہوئی۔ لیکن ''جادو کی کہانیوں'' کی پھٹی پرانی جلد تک دل میں کھب کے رہ جاتی تھی۔

لمبے وقفے میں میں نے لڑکوں میں بانٹ کر روٹی ساسیج کھائے۔ پرھ ''بلبل'' پڑھنا شروع کیا۔ کیا لاجواب قصہ تھا۔ پہلے ہی لفظ سے لڑکوں کے دلوں پر جادو چل گیا۔

''چین میں سبھی چینی ہیں۔ یہاں تک کہ شہنشاہ بھی چینی ہے۔'' مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس ایک جملے کے سادہ مزاح اور مسکراتی ہوئی موسیقی نے میرے دل میں کیسی گدگدی سی کر دی تھی۔ یہی نہیں، اس میں کوئی اور بات بھی تھی۔

اسکول میں ''بلبل'' ختم کرنے کا وقت نہیں مل سکا۔ جب میں گھر لوٹا تو ماں نے انڈے تلتے ہوئے

بری درشت آواز میں پوچھا:

کیا تو نہ ایک روبل لیا ہے؟''

''ہاں۔ یہ رہیں کتابیں...''

ماں نے مجھے پوری کڑاھی رسید کر دی اور ہمیشہ ہمیشہ کو ''جادو کی کہانیاں'' چھپا دیں۔ یہ سزا پٹائی سے بھی زیادہ تکلیف دہ سزا تھی۔

میں کئی دن تک اسکول نہ جا سکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرے سوتیلے باپ نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو میری کارستانی کا حال بتا دیا تھا اور لوگوں نے اپنے بچوں کو بتا دیا۔ بچوں نے یہ کہانی اسکول پہنچا دی۔ اس لئے جب میں اسکول گیا تو میرا خیر مقدم نئے خطاب سے کیا گیا۔ چور! یہ خطاب بہت چھوٹا اور صاف تھا۔ مگر غلط! میں نے یہ چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ میں نے روپیہ لیا تھا۔ لیکن جب میں نے اس کی صفائی دینے کی کوشش کی تو کسی نے مجھ پر یقین نہیں کیا۔ اس لئے میں نے گھر آ کر ماں کے سامنے صاف صاف اعلان کر دیا کہ اب میں اسکول نہیں جاؤں گا۔

ماں کے پھر بچہ ہونے والا تھا۔ وہ کھڑکی پر بیٹھی میرے بھائی ساشا کو دودھ پلا رہی تھیں۔ انہوں نے بجھا ہوا زرد چہرہ میری طرف پھیرا اور مجھے وحشی اور زخمی آنکھوں سے دیکھنے لگیں۔ ان کا منہ مچھلی کے منہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔

''تو جھوٹ بک رہا ہے'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں، کوئی بھی تیرے روبل لینے کا قصہ نہیں سن سکتا۔''

''جاؤ، پوچھ دیکھو۔''

''تو نے خود ہی کہا ہو گا ان سے۔ سچ سچ بتا۔ کیا تو نے نہیں بتایا؟ مگر دیکھ خدا کے لئے جھوٹ نہ بول۔ اچھا کل میں خود جاؤں گی اسکول۔ معلوم ہو جائے گا کس نے کہا ہے!''

میں نے طالبعلم کا نام بتا دیا۔ ماں کا منہ اتر گیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں باورچی خانے میں گیا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا جو لکڑی کے پرانے بکسوں سے تندور کے پیچھے بنایا گیا تھا۔ میں دوسرے کمرے سیماں کی سسکیوں کی آواز سنتا رہا۔

''یا الٰہی، یا الٰہی...''

گرم اور چکٹ چیتھڑوں کی بو سے میرا دم گھٹنے لگا اور میں باہر صحن میں نکل گیا۔

''کہاں جا رہا ہے؟'' ماں نے پکارا۔ ''یہاں آ میرے پاس۔''

ہم فرش پر بیٹھ گئے۔ ساشا ماں کے زانو پر بیٹھا ماں کے بلاؤز کے بٹن کو نوچتا اور بٹنوں کی طرف جھک جھک کر کہتا رہا:

''بٹن...'' جس کا مطلب تھا بٹن۔

میں ماں سے لپٹ گیا اور ماں نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔

''ہم بہت غریب ہیں'' ماں نے کہا۔ ''ایک ایک کوپک...ایک ایک کوپک...''

انہوں نے اپنے گرم ہاتھوں سے مجھے بھینچا اور لگا جیسے وہ اپنی بات پوری کرنے کی سکت نہیں رکھتیں۔

''اف، کیسا درندہ ہے، درندہ!'' وہ یکا یک چیخ پڑیں اور وہی لفظ دوہرائے جو میں نے ان کے منہ سے ایک بار پہلے بھی سنا تھا۔

''دلندہ دلندہ'' ساشا نے نقل اتاری۔

وہ عجیب و غریب بچہ تھا۔ بڑا بے ہنگم سا۔ یہ بڑا تو سر تھا اس کا، آنکھیں نیلی نیلی بڑی شاندار۔ وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں جلد بولنا شروع کر دیا۔ رونا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ خاموش، اپنی مسرتوں میں کھویا رہتا۔ وہ اتنا کمزور تھا کہ رینگنا بھی اس کے لئے دوبھر تھا۔ لیکن مجھے دیکھ کر وہ ہمیشہ کھل اٹھتا۔ وہ چھوٹے چھوٹے بازو میری طرف بڑھا دیتا اور ننھی ننھی نرم نرم انگلیوں سے میرے کانوں کو چھوتا۔ نہ جانے کیوں اس کی انگلیوں سے بنفشے کی خوشبو آتی رہتی تھی۔ وہ بالکل اچانک مر گیا۔ نہ بیمار پڑا، نہ اور کچھ ہوا۔ بس یونہی چل بسا۔ صبح کے وقت بدستور وہ خاموش مسرت میں کھویا ہوا تھا۔ شام کے وقت ابھی گرجا گھر کے گھنٹوں کی آواز گونج ہی رہی تھی۔ کہ اس کی لاش میز پر ڈالی جا چکی تھی۔ یہ دوسرے بچے نکولائی کی پیدائش کے فوراً بعد کا قصہ ہے۔

ماں نے جو وعدہ کیا تھا کہ اسکول میں سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک کر دیں گی سو وہ اپنا وعدہ پورا کر کے رہیں اب پھر میں نارمل طریقے سے اسکول جاتا اور پڑھتا۔ لیکن کچھ ایسا ہوا کہ مجھے پھر نانا کے ہاں رہنے کے لئے جانا پڑا۔ اس کی وجہ سنئے۔

''ایوگینی، ایوگینی، مت جاؤ، میں تمہاری منت کرتی ہوں!''

'' بکواس'' میرے سوتیلے باپ نے جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں تم اس عورت کے پاس جاتے ہو!''

''اچھا، جاتا ہوں تو جاتا ہوں، پھر؟''

چند منٹ تو دونوں خاموش رہے۔ پھر ماں نے بے تحاشا کھانستے ہوئے کہا:

''تم کیسے نکمے اور ذلیل درندے ہو!''

میں نے طمانچے کی آواز سنی۔ میں بھاگتا ہوا کمرے میں گھسا۔ میری ماں دوزانو بیٹھی ایک کرسی پر اڑی ہوئی تھیں اور میرا سوتیلا باپ ٹھاٹ دار سوٹ میں ملبوس لمبی ٹانگ سے میرے ماں کے سینے پر ٹھوکریں لگا رہا تھا۔ میں نے روٹی کاٹنے کی چاندی کے دستے والی چھری اٹھائی (میرے باپ کی یہی ایک چیز میری ماں کے پاس رہ گئی تھی) اور پوری طاقت سے سوتیلے باپ کے پہلو پر وار کیا۔

خوش قسمتی سے میری ماں نے جلدی سے ماکسیموف کو دھکیل دیا۔ چھری اس کے کوٹ کو چیرتی اور جلد کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ وہ کراہ اٹھا اور پہلو پکڑے ہوئے کمرے سے نکل بھاگا۔ ماں نے چیخ کر مجھے دبوچ لیا اور فرش پر پٹک دیا۔ سوتیلا باپ صحن سے لوٹا تو اس نے مجھے ماں سے چھڑایا۔

اسی دن جب رات بھیگ چلی اور میرا سوتیلا باپ ان سب باتوں کے باوجود چلا ہی گیا تو ماں میرے پاس آئیں۔ میں تندور کے پیچھے لیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے بڑی نرمی اور مامتا سے مجھے گلے لگایا اور پیار کیا:

''معاف کر دے میرے لال۔ میں نے تجھے دکھ دیا۔ پر بتا تجھے اس کی ہمت کیسے ہوئی؟ چھری؟''

میں ایک ایک لفظ خوب تول تول کر بول رہا تھا۔ میں نے کہا میں سوتیلے باپ کو مار ڈالوں گا اور اس کے بعد اپنی جان بھی لے لوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں واقعی یہ کر بیٹھتا۔ کم از کم میں اس کی کوشش تو ضرور کرتا۔ اب بھی میں پتلون کے پائینچے سے جھانکتے ہوئے پیر کو ہوا میں پرواز کرتے ہوئے اور ایک عورت کے سینے پر برستے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

بعض مرتبہ جب میں اس بہیمانہ روسی زندگی کا تصور کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کیا روسی زندگی کا یہ وحشی پہلو اس قابل ہے کہ اس پر روشنی ڈالی جائے۔ لیکن جب غور کرتا ہوں تو دل کہتا ہے کہ یقیناً اس زندگی

کو بے نقاب کرنا چاہئے کیونکہ یہ وہ زہریلی اور سخت جان سچائی ہے جس کا قلع قمع آج تک نہیں ہوا ہے۔ یہ وہ سچائی ہے جس کی جڑ کو جاننا چاہئے تا کہ اسے جڑ سے اکھاڑا جا سکے۔ ان ذلتوں کی جڑیں تک اپنی دکھی اور شرمناک زندگی کی زمین سے نوچ لینا چاہئے۔ یہ جڑیں تو انسان کی روح اور یاد سے بھی نوچ کر پھینک دینا چاہئے۔

اس گھناؤنی تصویر کو پیش کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے، زیادہ معقول وجہ۔ مانا کہ یہ حقیقتیں بڑی گھناؤنی اور بیزار کن ہیں، یہ حقیقیں ہماری روح کو کچلتی ہیں، بہت سی حسین روحوں کو دباتی اور بگاڑتی ہیں۔ لیکن روسی انسان کے دل میں پھر بھی اتنی تاب وتواں ہے کہ وہ ان بھیانک اور گھناؤنی حقیقتوں پر قابو پالیتا ہے اور آخر میں وہ ان پر پوری طرح قابو پا کر رہے گا۔

ہماری زندگی حیرت انگیز ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ درندگی اور وحشت سے بھری ہوئی ہے بلکہ اس لئے کہ اس درندگی اور وحشت کی تہہ میں تخلیقی قوتوں کا چشمہ چمک رہا ہے۔ نیکی کی موج بڑھ رہی ہے جو وعدہ کر رہی ہے کہ ہمارے لوگ آخر بیدار ہوں گے اور ان کی زندگی حسن اور درخشاں انسانیت کی دولت سے مالا مال ہوگی۔

13

میں پھر ایک بار نانا کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔

''اچھا بدمعاش سن'' انہوں نے گھبراہٹ میں میز پر تال دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اب تجھے نہیں کھلاؤں گا۔ اب تو جان اور تیری نانی جانے!''

''اچھا اچھا میں انتظام کرلوں گی'' نانی نے کہا۔ ''گویا یہ بہت بڑا کام تھا!''

''اچھا تو پھر جو جی چاہے کرو'' نانا چیخے اور پھر بڑے اطمینان سے مجھے سمجھایا ''ہم اب بالکل الگ الگ رہتے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے مالک ہیں!''

نانی کھڑکی کے پاس بیٹھی لیس بنا رہی تھیں۔ ان کی تیلی تکیے کے اوپر بڑے مزے میں کھٹ کھٹ بول رہی تھی جو پیتل کے پنوں سے بھرا ہوا تھا اور موسم بہار کی دھوپ میں سونے کے تار کی طرح چمک رہا تھا۔ نانی خود بھی پیتل سے ڈھالی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور ذرا بھی نہیں بدلی تھیں۔ لیکن نانا زیادہ دبلے ہو

گئے تھے اور جھریاں بڑھ گئی تھیں۔ان کے بال اور بھی اڑ گئے تھے،حرکات وسکنات میں رکھ رکھاؤ اور شان وشوکت کی جگہ بے قراری اور گھبراہٹ نے لے لی تھی۔ان کی سبز آنکھیں ہر چیز کو شبہے کی نظر سے دیکھتی تھیں۔نانی نے ہنس کر اس جائداد کے بٹوارے کا قصہ سنایا جو ان کے اور نانا کے درمیان ہوا تھا۔نانا نے سارا برتن باسن،پلیٹیں نانی کو دے دی اور بولے:

''یہ سب تمہارا ہے۔اب مجھ سے اور کچھ نہ مانگنا، ہاں!'' پھر انہوں نے نانی کے تمام پرانے کپڑے اور چیزیں لے لیں جن میں لومڑی کی کھال کی کیپ بھی تھی۔سب لے جا کر سات سو روبل میں بیچ دیا اور روپیہ سود پر اپنے دینی بیٹے کو قرض دے دیا جو یہودی تھا اور پھل کا بیوپار کرتا تھا۔لالچ نے ان کو مریض بنا دیا تھا۔وہ بے حد چھچھورے وہ گئے تھے۔پرانے جان پہنچان کے لوگوں کے ہاں جانے لگے۔ مال دار گروں اور کاریگروں کے ہاں جن کے ساتھ پہلے وہ کام کر چکے تھے۔وہ لوگوں کے ہاں جاتے اور پیسے کے لئے ان کے آگے ہاتھ پھیلاتے اور دکھڑا روتے کہ ان کے بیٹوں نے انہیں برباد کر دیا۔لوگ ان کے گزرے دنوں کی لاج رکھتے ہوئے جی کھول کر ان کے کام آئے۔نانا گھر آتے اور ایک بڑا سا نوٹ نانی کی ناک کے آگے نچاتے اور اسکول کے لڑکے کی طرح چہکتے:

''کھوسٹ بڑھیا دیکھتی ہے؟ تو کوشش کر دیکھ اس کا دسواں حصہ بھی تجھے مل جائے تو میرے چہرے پر ناک نہیں!''

نانا نے یہ روپیہ ایک دوسرے جان پہنچان والے کو سود پر دے دیا۔یہ شخص بڑا لمبا تڑنگا،گنجا تھا جس کا نام پڑ گیا تھا ''چابک''۔اس کی ایک بہن بھی تھی، بڑی موٹی، سرخ سرخ گالوں اور کالی کالی آنکھوں والی۔اسے نانا روپیہ بھی دیتے تھے۔وہ دوکاندار تھی،میٹھی اور لسلسی جیسے راب!

گھر کی ایک ایک چیز بٹی ہوئی تھی۔آج نانی اپنے پیسے سے کھانے پینے کی چیزیں خریدتیں تو کل نانا روٹی اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں خرید لاتے۔جب نانا کی باری ہوتی تو کھانا اور بھی برا ہوتا۔نانی اچھا گوشت خریدتیں مگر نانا انتڑیاں اور پھیپھڑے اٹھا لاتے۔دونوں کے پاس چائے اور شکر کا اپنا اپنا بھنڈار تھا۔مگر کیتلی ایک ہی تھی۔اس لئے ایک ہی کیتلی میں چائے کھولتی تھی۔نانا ڈر کر ہانک لگاتے:

''ٹھہرنا۔ذرا دیکھوں تو سہی، کتنی چائے ڈال دی تو نے؟'' وہ چائے کی پتیاں ہتھیلی پر پھیلاتے اور بڑی احتیاط سے ایک ایک پتی تک گنتے۔

''تمہاری پتیاں بڑی باریک ہیں۔ میری پتیاں موٹی ہیں۔ میری پتیوں سے زیادہ اچھی چائے بنتی ہے، اس لئے تم ذرا زیادہ پتیاں ڈالو۔''

وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے کہ نانی کی اور ان کی چائے ایک ہی رنگ کی ہے یا نہیں۔ وہ اس کا خیال رکھتے کہ نانی کہیں ایک آدھ پیالی زیادہ تو چائے نہیں چڑھا گئیں۔

چائے کی آخری پیالی نکالتے ہوئے نانی پوچھتیں:

''آخری پیالی، ایں؟''

''ہاں، ہم آخری پیالی تو پی ہی سکتے ہیں!'' نانا کیتلی میں جھانک کر دیکھتے ہوئے کہتے۔

یسوع مسیح کے چراغ کا تیل تک دونوں باری باری سے لاتے تھے۔ اور یہ سارا تماشا تھا پچاس برس ایک ساتھ خون پسینہ ایک کرنے کے بعد۔

نانا کی ان چالوں اور تماشوں میں مجھے مزا بھی آتا اور بیزاری بھی ہوتی، نانی کو یہ باتیں صرف دلچسپ معلوم ہوتیں۔

''ارے بھلا دے یہ سب!'' وہ مجھ سے کہتیں۔ ''اس میں رکھا کیا ہے؟ بوڑھا آدمی ٹھہرا سٹھیا گیا ہے! سوچ تو سہی۔ کتنی عمر ہونے کو آئی۔ اسی برس کم ہوتے ہیں کیا! سٹھیا گیا ہے تو بلا سے۔ کسی کا دل تو نہیں دکھاتا نا! رہی میں، سو ہمیشہ اپنی روٹی روزی کماتی رہوں گی، جیسے تیسے، اپنے لئے اور تیرے لئے!''

میں نے بھی پیسہ کمانا شروع کر دیا۔ اتوار کے دن صبح نڑکے ہی میں تھیلا اٹھاتا سڑکوں اور احاطوں سے گائے کی پرانی ہڈیاں، چیتھڑے، کیلیں اور کاغذ بٹورتا چلتا۔ کباڑیہ ہمیں چیتھڑے، کاغذ یا دھات کے ایک پوڈ کے بیس کوپک دیتا اور ہڈیوں کے ایک پود کے آٹھ دس کوپک۔

میں اسکول کے بعد ہفتے کو بھی کباڑ جمع کرتا اور ہر سنیچر کو میں کوئی تیس سے لے کر پچاس کوپک تک جمع کر لیتا (قسمت کا ستارہ چمکتا تو اس سے زیادہ بھی کھرے ہو جاتے)۔ نانی میرا پیسہ لیتیں اور جلدی سے اپنے اسکرٹ میں چھپا لیتیں اور آنکھیں جھکائے مجھے خوب شاباشی دیتیں:

''میرے لال، میرے کبوتر و بوتر، شکریہ تجھ پر سو جان سے صدقے! ہم اب بھوکے نہیں رہ سکتے۔ کیوں؟ ذرا دیکھ تو سہی!''

ایک دن میں دیکھتا کیا ہوں کہ وہ میرے پانچ کوپک کے سکے کو گھور رہی ہیں اور چپکے چپکے رو رہی

ہیں۔آنسو کا ایک بڑا سا موتی ان کی اسفنجی ناک کی نوک پر چمک رہا تھا۔

لیکن میں نے دیکھا کہ کباڑ جمع کر کے بیچنے میں اتنا فائدہ نہ تھا۔اوکا دریا کے کنارے یا جزیرہ ''پیسکی'' (''ریت'') سے تختہ چرا کر بیچنے میں زیادہ فائدہ تھا۔''ریت'' ایک جزیرہ تھا جہاں سال کے سال میلہ لگتا تھا اور دھات کا کاروبار ہوتا تھا۔وہاں میلے کے لئے وقتی طور پر لکڑی کے تختوں کا دوکانیں گرا دی جاتی تھیں۔جب میلہ ختم ہو جاتا تھا تو یہ دوکانیں کھڑی کی جاتی تھیں اور تختوں کا انبار لگا دیا جاتا تھا جو موسم بہار میں دریا میں سیلاب کے آنے تک یونہی پڑا رہتا تھا۔مکان والے شہری ہمیں ایک ایک اچھے تختے کے دس دس کوپک دیتے۔اور ہم دن بھر میں دو دو تین تین تختے چرا لیتے۔لیکن یہ مہم ان دنوں کی جاتی جب بارش ہوتی رہتی یا دھند چھائی رہتی۔ایسے دنوں میں پہرے دار گھر سے نہ نکلتے۔

لڑکوں کی ایک ٹولی تھی۔میں بھی اس میں شریک تھا۔سانکا ویاخیر (کبوتر) دس برس کا تھا موردووی بھکارن کا بیٹا۔بڑا ہی ملنسار لڑکا تھا، نیک دل اور خاموش۔پھر لاوارث کوستروما تھا، بالکل مریل اور بے چین۔اف کتنی بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں تھیں اس کی۔بعد میں پتہ چلا کہ وہ لڑکوں کے سدھار گھر میں پھانسی لگا کر لٹک گیا۔وہ دو کبوتر چرانے کے جرم میں سدھار گھر بھیج دیا گیا تھا۔تاتاری خابی تھا، بارہ سال کا رستم۔اس میں فولادی قوت اور نیکی اور گھلاوٹ یکجا ہو گئی تھیں۔چپٹی ناک والا یازتھا، گورکن اور اور قبرستان کے چوکیدار کا آٹھ سالہ لڑکا، بالکل مچھلی کی طرح بے زبان اور ہمیشہ ''کالی بیماری'' کا شکار۔پھر ایک بیوہ کا بیٹا گریشکا چور کا تھا، بڑا ہی ایمان دار اور معقول آدمی، گھونسے بازی میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔ہم سب ایک ہی کوچے میں رہتے تھے۔

ہمارے محلے میں چوری کو جرم نہیں سمجھتے تھے۔عام طور پر حقیر قسم کے کام کاج کرنے والے نیم فاقہ کش لوگوں کے لئے پیٹ پالنے کا خاص ذریعہ تھا یہ۔ڈیڑھ مہینے کے سالانہ میلے پر گزر بسر ممکن نہ تھا۔بہت سے اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ بھی ''بہتے دریا میں ہاتھ دھو لیتے''۔یعنی وہ بہتے ہوئے تختے اور کندے نکال لیتے اور سامان لانے لے جانے کے لئے لٹھوں کے بیڑے بنا لیتے۔لیکن زیادہ تر وہ چوری سے اپنا کام چلاتے۔والگا اور اوکا کے کنارے وہ ''بندوں کی طرح'' مال اچکتے، بیڑوں اور کشتیوں سے سامان چراتے، دریا کے کنارے جو کچھ بھی ہاتھ لگ جاتا پار کر دیتے۔اتوار کے دن بڑے بوڑھے اپنے اپنے مال غنیمت کی ڈینگ مارتے اور بچے سنتے اور سیکھتے۔

موسم بہار میں، میلے کی تیاریوں اور گہما گہمی کے زمانے میں، کاریگر اور دوسرے مزدور دن بھر کام کاج کے بعد پی پلا کر مست ہو جاتے اور سڑکیں ان سے لبالب بھر جاتیں۔ اس وقت ضلع کے چھوکرے جیب کترنے کا کاروبار شروع کر دیتے۔ یہ ایک ایسا دھندا تھا جو بالکل جائز سمجھا جاتا تھا اور چھوکرے بڑی ڈھٹائی سے بڑوں کو اپنا گواہ بنا کر اپنا دھندا کرتے تھے۔

وہ بڑھیوں کے ہتھوڑے اڑا لیتے، مستریوں کے اوزار پر ہاتھ صاف کر دیتے، گاڑی بانوں کے اسکرو غائب کر دیتے۔ ہماری ٹولی ان چیزوں پر ہاتھ نہیں ڈالتی تھی۔

''میں چوری نہیں کروں گا۔ میری ماں جانے نہیں دیتی'' ایک دن چورکا نے اعلان کیا۔

''اور میرا تو جی ہولتا ہے چوری کے خیال سے'' خابی نے کہا۔

کوسترو ما چوروں سے بہت کٹتا تھا اور جو لفظ ''چور'' کچھ عجیب انداز سے ادا کرتا تھا۔ اگر وہ چھوکروں کو کسی شرابی کا مال اڑاتے دیکھتا تو پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتا، دور تک دوڑاتا اور خوب مرمت کرتا۔ بڑی بڑی آنکھوں والا یہ بگڑے دل ہمیشہ بڑوں کا پوز دینے کی کوشش کرتا۔ وہ قلیوں کی طرح بڑا جھومتا جھامتا چلتا اور آواز میں کھرج اور بھاری پن پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ کبوتر کا تو خیر ایمان تھا کہ چوری گناہ ہے۔

لیکن ''ریت'' سے تختے اور کھمبے پار کرنے کا شمار چوری میں نہ ہوتا تھا۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس کار خیر میں ڈر نہ لگتا۔ ہم نے ایک خاص طریقہ ایجاد کر لیا تھا جس کی وجہ سے کام بہت آسان ہو گیا تھا۔ شام کے وقت یا جب دھند چھائی ہوتی تو دن کے وقت بھی، کبوتر اور یاز ''ریت'' کی طرف جاتے ہوئے برف پر نکل کھڑے ہوتے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ جاتے، بلکہ پوری کوشش کرتے کہ چوکیدار ان کو دیکھ لیں۔ اتنے میں ہم چاروں دوسری طرف سے چھپتے چھپاتے بڑھتے۔ چوکیدار یاز اور کبوتر پر نظر رکھنے کی کوشش کرتے، ہم مقررہ جگہ پر پہنچتے تو اپنے لئے تختے چنتے۔ پھر ہمارے اگلے دستے والے لڑکے چوکیداروں کا منہ چڑاتے اور بھاگتے۔ دوسری طرف ہم بھی واپسی کا سفر شروع کر دیتے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک رسی اور کانٹا ہوتا جس میں تختے کو پھنسا کر ہم برف پر گھسیٹتے ہوئے لاتے۔ چوکیداروں کی نظر شاید ہی ہم پر پڑتی۔ اگر ان کی نظر پڑتی بھی تو وہ ہمیں پکڑ نہ پاتے۔ تختوں کو بیچ کر ہم مال غنیمت کے برابر برابر چھ حصے کرتے۔ عام طور پر پانچ چھ کوپک فی کس کا حصہ بنتا۔

اتنے پیسے میں ہم ایک دن تو خوب پیٹ بھر کے کھا سکتے تھے۔لیکن کبوترا اگر واد کا نہ لاتا تو اس کی ماں خوب پٹائی کرتی۔کوستروما ایک ایک کو پک جوڑ رکھتا۔اسے کبوتروں کے شکار کا خواب جو پورا کرنا تھا۔چورکا کی ماں بیمار تھی۔اس لئے وہ اپنی ماں کی ضرورت کی چیزیں خریدلاتا۔خابی بھی پیسے بچاتا تھا تاکہ پھر شہر واپس جاسکتے جہاں سے اس کا چچا نیژنی نووگورود لے آیا تھا اور آنے کے بعد فوراً ہی ڈوب مرا تھا۔خابی شہر کا نام بھول چکا تھا۔اس کو بس اتنا یاد تھا کہ اس کا شہر دریائے والگا کے قریب کاما ندی کے کنارے آباد ہے۔

نہ جانے کیوں ہمیں اس شہر کا خیال بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ہم ترچھی نظر والے تاتاری کو چھیڑا کرتے:

ایک ہے خوبصورت شہر،
مگر نہ جانے کدھر
ادھر یا ادھر
یا کہیں آسمان پر!

شروع میں تو خابی ہم پر بہت خفا ہوتا۔لیکن ایک بار کبوتر نے کچھ اس طرح چمکارتے ہوئے کہا جس سے اس کے نام کا حق ادا ہوتا تھا:

''اماں یار چھوڑ بھی، چار یار کہیں آپس میں دل میلا کرتے ہیں؟!''

تاتاری شرما گیا۔اس نے ڈانٹ پی لی اور اس کے بعد وہ بھی کاما کے کنارے بسے ہوئے شہر کا گیت سب کے سر میں سر ملا کر گانے لگا۔

لیکن پھر بھی ہم کباڑ جمع کرنے پر چوری کو ترجیح دیتے رہے۔ بہار آئی تو یہ کام اور بھی مزیدار ہو گیا۔برف پگھل گئی اور میلے کے خالی میدان میں پتھروں کے راستوں کو نہلانے کے لئے بادل گھر گھر کر آنے لگے۔میلے کے نالوں میں ہمیشہ کیلیں اور دھات کے ٹکڑے وغیرہ آسانی سے مل جاتے۔اکثر ہمیں تانبے اور چاندی کے سکے بھی مل جاتے۔مگر چوکیداروں کے ڈنڈوں سے بچنے کے لئے اور ان سے اپنے تھیلوں کو بچانے کے لئے ہمیں چوکیداروں کو دو دو کوپک دینے پڑتے اور ان کے جوتوں پر پالش کرنی پڑتی۔عام طور پر پیسہ بنانا آسان نہ تھا۔لیکن ہم اس دھندے کے طفیل بہترین دوست بن گئے۔کبھی کبھی ہمارا

جھگڑا بھی ہوتا۔لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ ہماری آپس میں کبھی سر پھٹول یا دھینگا مشتی بھی ہوئی ہو۔

کبوتر بیچ بچاؤ کرا دیتا تھا۔وہ ہمیشہ نہ جانے وہ بول کہاں سے ڈھونڈ نکالتا جن کو سنتے ہی ہمارا غصہ کافور ہو جاتا۔اس کی باتیں بڑی سیدھی سادی ہوتیں۔لیکن یہ باتیں سن کر ہم حیران رہ جاتے اور شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔جب وہ یہ باتیں کہتا تو وہ خود بھی اپنی باتوں پر حیران رہ جاتا۔

''آخر تم ایسی حرکت کیوں کرو؟'' وہ پوچھتا اور ہر ایک پر یہ بات روشن ہو جاتی کہ واقعی یہ بالکل بے معنی اور نامعقول بات ہے۔

وہ اپنی ماں کے بارے میں کہتا ''یہ میری موردووی...'' اور ہمیں اس کی بات عجیب نہ معلوم ہوتی۔

''رات یہ موردووی گھر لوٹی تو بالکل نشے میں ٹر...'' وہ ہنستا اور اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں سونا چمک جاتا۔''دروازے پر ڈھیر ہوگئی اور پڑی پڑی گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے لگی۔بھیگی مرغی!''

''کون سا گیت؟'' چور کا سنجیدگی سے پوچھتا۔

کبوتر جھٹ گھٹنوں پر تھاپ مارتا اور اونچی باریک آواز میں ماں کا گیت گانے لگتا:

سنو قدموں کی چاپ،

وہ رہا اپنا گڈریا،

اپنا ڈنڈا کھٹکھٹاتا ہوا

اور ہم بھاگے سڑک پر، ایک دو تین!

اپنا گڈریا بورکا،

ہاں یہ شام کی روشنی، یہ بورکا بجا رہا ہے بانسری

گاؤں کے لوگ سن رہے بانسر کی تان دل کے کان سے۔

اسے اس قسم کے بہت سے چلتے ہوئے گیت یاد تھے اور وہ یہ گیت بہت لہک کر گاتا تھا۔

''ہاں'' وہ اپنی بات کہتا رہتا۔''لو وہ مزے میں وہیں دروازے پر سو گئی، ٹھنڈی ہوا گھر میں آتی رہی، مارے سردی کے اپن تو بالکل قلفی ملائی برف بن گئے...اب جو کھینچا تو ماں کسی طرح ٹس سے مس نہ ہو۔آج صبح میں نے کہا ''آخر تم اتنا زیادہ کیوں پیتی ہو؟'' ''سب ٹھیک ہے'' یہ ہے جواب۔''کچھ دن اور۔آنکھ بند ہونے والی ہے، پھر تو جنجال سے چھوٹ جائیگا!''

''ہاں یہ تو سچ ہے۔اب وہ چند دن کی مہمان ہے۔شراب نے اس کو جلا کر رکھ دیا ہے'' چورکا اس کی تصدیق کرتا۔

''تیرا دل تو دکھے گا نا؟'' میں نے پوچھا۔

''بے شک'' کبوتر حیرانی کے ساتھ جواب دیتا۔''ماں مجھے کتنا چاہتی ہے!''

ہم خوب جانتے تھے کہ وہ موردووی عورت اپنے بیٹے کبوتر کی خوب مرمت کرتی ہے۔پھر بھی ہمارا خیال تھا کہ اس کی ماں بڑے اچھے دل کی عورت ہے۔کبھی کبھی جب ہمیں کم مال غنیمت ملتا تو چورکا کہتا:

''آؤ ہم ایک ایک کو پک نکال دیں، کبوتر کی ماں کی واد کا کے لئے، نہیں تو مفت میں اس کی کھال ادھیڑی جائے گی!''

صرف چورکا اور میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔کبوتر ہم پر رشک کرتا تھا۔

''جب میری موردووی چل بسیگی'' وہ اپنے چوھے جیسے نوکدار کان نوچتے ہوئے کوکتا''تو میں بھی اسکول میں پڑھوں گا۔میں استاد کے قدموں پر سر رکھ دوں گا اور کہوں گا۔مجھے اسکول میں لے لو۔جب اسکول کی پڑھائی ختم کر لوں گا تو بڑے پادری کا مالی بن جاؤں گا، کون جانے خود زار کا باغبان بن جاؤں!''

اس موسم بہار میں کبوتر کی ماں واد کی بوتل اور ایک بڈھے کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کر گئی۔بڈھا ایک نئے گرجا گھر کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کرتا تھا۔ہوا یہ کہ کندوں کا ایک ڈھیر دھڑام سے آرہا ان کے سروں پر۔عورت کو اسپتال پہنچا دیا گیا اور چورکا نے کبوتر سے کہا:

''چل تو میرے ساتھ رہ۔ماں تجھے پڑھنا سکھا دے گیا!''

چند دن بعد کبوتر چلتے چلتے سڑک پر ایک دوکان کے سامنے یکا یک رک گیا۔

''بطاسی کی دوکان'' اس نے بڑے غور سے سر اٹھا کر پڑھا۔

''بساطی! ابے الو بساطی!'' چورکا نے اس کی اصلاح کی۔

''میں جانتا ہوں مگر یہ حفر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔کم بخت۔''

''حفر نہیں حرف!''

''حرف بالکل اچھلنے اور ناچنے لگتے ہیں...کوئی پڑھتا ہے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔''

ہمارا محلّہ ریت سے بھرا ہوا تھا۔ اس لئے وہاں ہریالی بہت کم تھی۔ احاطے میں کہیں کہیں مرجھاتے ہوئے بید کے درخت، جھاڑ جھنکاڑ، رس بھریوں کی مڑی اور الجھی ہوئی جھاڑیاں یا چہار دیواری کے پیچھے چھپی ہوئی سوکھی گھاس دکھائی دیتی تھی۔ اگر ہم میں سے کوئی گھاس پر بیٹھ جاتا تو کبوتر فوراً ہماری جان کو آجاتا:

''آخر گھاس کو روندنے میں تم لوگوں کو کیا مزا آتا ہے؟ کیا تم ریت پر نہیں بیٹھ سکتے، ایں؟ تمہارے لئے تو ایک ہی بات ہوئی!''

جب وہ ساتھ ہوتا تو ہم اس کے ڈر کے مارے دریائے اوکا کے کنارے ایک جنگلی پھول کو بھی ہاتھ نہ لگاتے، نہ کسی جھاڑ جھنکاڑ سے کوئی ڈنڈا کاٹتے۔

''شیطانو، تم لوگ چیزیں کیوں لگاڑتے رہتے ہو؟'' وہ حیرانی سے شانے ہلاتے اور ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہتا۔

سنیچر کو جو کھیل کود کا پروگرام ہوتا اس کے لئے ہم پورے ہفتے چھال کے پرانے سینڈل ڈھونڈتے رہتے۔ سنیچر کی شام کو جب تاتاری قلی سائبیریائی بندرگاہ کو چھوڑ کر جانے لگتے تو ہم کسی نکڑ پر چھپ جاتے اور ان پر سینڈل برساتے۔ شروع میں تو وہ بہت بھڑکے۔ وہ گالیاں بکتے اور ہمیں رگیدتے۔ لیکن پھر وہ خود بھی کھل کھیلے۔ آنے والی جنگ کے خیال سے وہ بھی چھال کی پرانے سینڈلوں سے لیس ہو کر آتے۔ کئی بار تو وہ ہمارے اسلحہ خانے سے ہتھیار چرا لے گئے۔ وہ ٹوہ میں رہتے تھے کہ ہم نے اپنے ہتھیار کہاں چھپائے ہیں۔ مگر ہم نے کہا اس کی سہی نہیں۔

''یہ تو کھیل نہ ہوا!'' ہم نے شکایت کی۔

وہ چرائے ہوئے مال کو دو حصوں میں بانٹتے اور پھر دونوں طرف سے چاندماری ہوتی۔ عام طور پر یہ ہوتا کہ وہ کسی کھلی جگہ اپنا مورچہ جماتے اور ہم ان کے چاروں طرف چیختے اور ناچتے اور اپنے بم ان پر پھینکتے۔ وہ چیختے چنگھاڑتے اور جب ہم میں کسی پر سینڈل برستے اور چوٹ کھانے والا اپنی ناک ریت میں گھسیڑتا تو حملہ آور خوب زور زور سے قہقہے لگاتے۔

بعض مرتبہ تو اندھیرا چھا جاتا مگر کھیل چالو رہتا۔ چھوٹے چھوٹے کاروباری کسی نکڑ سے ہمارا تماشا دیکھتے اور شرافت کی دھائی دے دے کر ڈانٹتے ڈپٹتے۔ مگر سینڈل غبار آلود پرندوں کی طرح ہوا میں پرواز

کرتے رہتے۔ کبھی کبھی ہماری فوج کے کسی سپاہی سے زناٹے دار سینڈل ٹکراتا۔ مگر طاقت آزمائی کے جوش میں درد اور چوٹ کی تکلیف کا احساس بھی نہ ہوتا۔

تاتاری بھی ہماری طرح جوش میں آجاتے۔ جب جنگ ختم ہوجاتی تو ہم کبھی کبھی ان کے ساتھ گھر جاتے۔ وہاں ہماری خاطر تواضع گھوڑے کے گوشت سے ہوتی۔ گوشت کے ساتھ عجیب وغریب قسم کی ترکاری بھی ملتی۔ اس کے بعد چائے اور کیک کا دور چلتا۔ ہم ان دیوہیکل لوگوں پر جان دیتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑا دیو معلوم ہوتا تھا۔ ان کی طبیعتوں میں کوئی چیز بڑی سادہ تھی، بچوں کے بھولپن والی بات! ان کی ایک ادا سب سے زیادہ میرے دل کو بھاتی تھی۔ کسی بات پر وہ اپنا دل میلا نہ کرتے۔ سب کے سب دل کے بڑے نیک تھے اور ایک دوسرے کو آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔

سارے تاتاری خوب قہقہے لگاتے، ہنسنے پر آتے تو کوئی طاقت ان کی ہنسی کو روک نہ پاتی۔ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے۔ ان میں سے ایک کا سیموف کا اجڈ اور اکھڑ دیہاتی تھا۔ اس کی ناک شہید ہوچکی تھی مگر طاقت میں دیو تھا۔ ایک دن تو اس نے اکیلے گرجے کے لئے ستائس پوڈ بھاری گھنٹہ جہاز سے اٹھایا اور دریا کے کنارے تک لے آیا۔ وہ ہنستے ہنستے بھونکنے لگتا اور مستقل چیختا رہتا:

''اواواو! اواواو! بول ایک چڑیا ہے۔ بول کیا سنا۔ ایک چڑیا پکڑی! سنہری چڑیا!''

ایک دن اس نے کبوتر کو اپنی ہتھیلی رپ بٹھایا اور ہوا میں اٹھالیا۔

''جاؤ بیٹا آسمان پر، جاؤ!'' اس نے کہا۔

جس دن پانی برستا پر، جاؤ!'' اس نے کہا۔

جس دن پانی برستا ہم قبرستان کے پاس چھوٹے سے گھر میں اکٹھے ہوتے جہاں یاز اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے باپ کی کمر دوہری ہوگئی تھی۔ وہ بڑا میلا کچیلا نظر آتا۔ پہ لمبے لمبے تو اس کے بازو تھے۔ اس کے سر اور چہرے پر چکٹ بال انکڑوں کی طرح نظر آتے۔ اس کا سر گردن کی جھری دار کھال پر شلجم کی طرح ٹکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑی سرشاری کے عالم میں آنکھیں میچ لیتا اور جلدی جلدی بڑبڑاتا:

''یا پروردگار اپنی پناہ میں رکھ اور بے خواب راتوں سے بچا! اووو!''

ہم تھوڑی سی چائے، شکر، روٹی اور یاز کے باپ کے لئے ذرا سی واڈکا بھی خریدتے۔

''ابے گنوار، سماوار تو کھول!'' چور کا حکم دیتا۔

گنوار ہنستا اور حکم کی تعمیل کرتا۔ جب تک جب تک پانی کھولتا ہم اپنے معاملات پر بات چیت کرتے اور وہ ہمیں صلاح دیتا:

''ذرا چوکس رہیو۔ دیکھنا پرسوں تروسوف کے ہاں فاتحہ اور کھانا ہے۔ وہاں بہت سی ہڈیاں ہوں گی!''

''ارے تروسوف کی باورچن آپ ہی ہڈیاں سنگارتی ہے!'' چور کا کہتا جسے پورے عالم غیب کا علم غیب کا علم تھا۔

''اب جلد ہی موسم اچھا ہوگا۔ ہم جنگل جا سکیں گے!'' کبوتر کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہتا۔

یاز کبھی کبھار ہی زبان کھولتا۔ وہ بڑی اداس اور بے جان آنکھوں سے ہمیں گھورتا اور کوڑے کے ڈھیر سے اکٹھے کئے ہوئے کھلونے دکھاتا۔ لکڑی کا سپاہی، ٹانگوں سے محروم گھوڑا، بٹن اور پیتل کے ٹکڑے۔

اس کا باپ میز پر بھانت بھانت کی پیالیاں سجاتا اور سماوار اندر لاتا۔ کوستروما چائے نکالتا۔ بڈھا اپنی واد کا انڈیلتا گلے میں اور تندور پر چڑھ جاتا۔ وہاں سے الو جیسی آنکھوں سے ہمیں گھورتا اور بڑبڑاتا:

''تم سب پر خدا کی مار۔ تم انسان ہو، ایں؟ تھو! چوٹٹوں کا گروہ۔ یا پروردگار اپنی پناہ میں رکھ اور ہمیں بے خواب راتوں سے بچا!''

''مگر ہم چور کب ہیں!'' کبوتر کہتا۔

''چور نہیں تو ننھے منے چور تو ہو ہی تم۔''

جب یاز کا باپ اپنی جھک سے ہماری ناک میں دم کر دیتا تو چور کا گرجتا:

''ابے او بڈھے گنوار، بند کر زبان!''

جب بڈھا محلے کے تمام بیماروں کے نام انگلیوں پر گنواتا اور اندازہ لگاتا کہ ان میں سے کون پہلے اللہ کو پیارا ہوگا تو اس کی باتوں سے مجھے، کبوتر اور چور کا کو بڑی وحشت ہوتی۔ بڈھا اس خیال سے ہونٹ چاٹتا نظر آتا۔ اسے ذرا بھی رحم نہ آتا۔ جب وہ دیکھتا کہ ہم اس کی باتوں سے بیزار ہیں تو وہ جان بوجھ کر چڑاتا:

''اخاہ! ارے تم ڈر رہے ہو، شیطانو! ایک بہت بڑا تونڈہ بہت جلد اس دنیا سے کوچ کرنے والا

ہے۔مگر اسے سڑتے دیر تھوڑی لگیگی!''

ہم اس کو مگر وہ قابو میں کب آنے والا تھا۔

''تمہاری باری بھی جلد ہی آئے گی! کوڑے کے ڈھیر پر جینے والے کیا کھا کر زیادہ جییں گے!''

''اچھا اچھا، ہم مر جائیں گے اور آسمان والے ہمیں فرشتہ بنا دیں گے!'' کبوتر کہتا۔

''تم؟ فرشتے؟'' یاز کا باپ حیران ہوتا اور اس کے منہ سے قہقہے پھٹ پڑتے۔ پھر وہ مردوں کی بھیانک کہانیاں سنا سنا کر ہمیں ستاتا رہتا۔

لیکن بعض مرتبہ دبی دبی سی بھنبھناتی ہوئی آواز میں عجیب عجیب باتیں کہنے لگتا:

''سنو، یارو، پرسوں کی بات ہے۔ ایک عورت قبر میں سلا دی گئی۔ ان کی کہانی بھی عجیب ہے۔ میں نے سب معلوم کر لیا۔ بتاؤ کیا سمجھے؟...''

وہ اکثر عورتوں کا ذکر بھی چھیڑ دیتا۔ ہمیشہ بڑی گھناؤنی باتیں کرتا عورتوں کے بارے میں۔ مگر اس کی کہانیوں میں ایک فریاد، ایک سوال ضرور پوشیدہ رہتا تھا۔ جیسے ہم سے التجا کر رہا ہو۔ لوگو سوچنے میں میرا ساتھ دو، ہاتھ بٹاؤ۔ ہم بڑے غور سے سنتے۔ وہ رک رک کر بولتا۔ اکثر سوال کرنے کو رک جاتا۔ لیکن وہ جو کچھ کہتا اس میں سے کچھ حصہ تو پھانس کی طرح ہمارے حافظے میں چبھ کر رہ جاتا:

''کس نے لگائی آگ؟'' اس عورت سے پوچھا گیا۔ ''میں نے'' اس نے جواب دیا۔ ''کیسے بیوقوف؟ تم اس رات ہسپتال میں تھیں۔'' وہ دہراتی ہے ''کہہ جو رہی ہوں میں لگائی آگ!'' بتاؤ آخر اس نے ایسی بات کیوں کہی؟ اے پروردگار ہمیں بے خواب راتوں سے بچا!''

وہ قریب قریب ان تمام لوگوں کی زندگی کی کہانی جانتا تھا جن کی قبریں اس نے قبرستان میں کھودی تھیں۔ جب وہ بولتا تو ایسا جیسے اس نے ہم پر تمام اردگرد مکانوں کے در کھول دئے ہیں اور ہم سب ان مکانوں میں گھس گئے ہیں اور مکینوں کی زندگی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اس پورے تماشے میں کسی مقدس اور اہم بات کا احساس رہتا۔ ہمیں لگتا کہ وہ صبح ہونے تک اسی طرح باتیں کر سکتا ہے۔ لیکن جیسے ہی کھڑکی سے اندھیرا جھانکتا چور کا میز سے اٹھتا اور کہتا:

''میں گھر چلا۔ ماں گھبرا رہی ہوں گی۔ اور کون چلتا ہے میرے ساتھ؟''

ہم سب اس کے ساتھ ہی چلے جاتے۔ یاز چہار دیواری تک ہمارے ساتھ آتا، پھاٹک کا تالا لگاتا

اور خدا حافظ کہتے ہوئے اپنا سانولا ہڈیالا چہرہ سلاخوں پر رکھ دیتا۔ اور دبی دبی آواز میں کہتا:

''خدا حافظ!''

ہم بھی چلاتے ''خدا حافظ!'' اسے قبرستان میں چھوڑتے ہوئے ہمارے دل میں کچھ عجیب سا احساس جاگتا۔ ایک بار شام کو ستر و مامڑا اور بولا:

''دیکھنا ایک دن جو ہماری آنکھ کھلی گی تو معلوم ہوگا وہ تو چل بسا۔''

چور کا اکثر دعوی کرتا کہ یاز کا حال تو ہم سے بھی زیادہ پتلا ہے مگر کبوتر ہمیشہ اختلاف کرتا:

''ہمارا حال تو بالکل پتلا نہیں...'' اور میں اس سے اتفاق کرتا۔ مجھے سڑکوں اور کوچوں کی آزاد زندگی میں بہت مزا آتا تھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں سے محبت تھی۔ ہماری یاری نے میرے دل میں ایک نیا احساس جگایا۔ میرا جی چاہتا کہ ان کے کام آؤں، ان کو فائدہ پہنچاؤں۔

پھر اسکول میں مجھے مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لڑکے مجھے آوازہ اور کباڑیا کہہ کر پکارنے لگے۔ ایک بار جو جھگڑا ہوا تو لڑکوں نے استاد سے شکایت کر دی کہ میرے جسم سے کوڑے کی اتنی تیز بو آتی ہے کہ میرے پاس بیٹھنا ناممکن ہے۔ مجھے یاد ہے اس بات سے کیسا دھچکا لگا تھا میرے دل کو اور اس کے بعد دوبارہ اسکول میں قدم رکھنا میرے لئے کتنا مشکل تھا۔ یہ شکایت محض من گھڑت اور ذلیل جھوٹ تھی۔ میں ہر صبح خوب اچھی طرح منہ ہاتھ دھوتا تھا اور کبھی بھی ان کپڑوں میں اسکول نہیں جاتا جن میں کوڑے کے ڈھیر چھانتا تھا۔

آخر میں نے دوسری جماعت کا امتحان پاس کر لیا۔ اچھے کام کے انعام میں مجھے انجیل کی ایک جلد کریلوف کے قصوں کی ایک جلد اور ایک کتاب ملی جس پر جلد نہ تھی۔ اس کا نام تھا ''فاتا مرگانا''۔ اس کے ساتھ مجھے تعریفی پروانہ بھی ملا۔ جب میں یہ سارے تحفے گھر لایا تو نانا بہت خوش ہوئے اور ان پر بڑا رعب پڑا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہمیں کتابوں کی حفاظت کرنی چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ اس خیال سے میں کتابیں اپنے صندوق میں بند کر دوں گا۔ کئی دن نانی بیمار رہیں۔ ان کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ نانا کراہتے اور غراتے:

''تم لوگ مجھے تباہ کر کے رہو گے۔ تم لوگ مجھے کھائے جا رہے ہو۔''

اس لئے میں نے کتابیں اٹھائیں اور پچپن کوپک میں کتابوں کی دوکان پر بیچ آیا۔ میں پیسے نانی کو

دے دئے۔تعریفی پروانے پر اوٹ پٹانگ لکھ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا اور اس کے بعد نانا کے حوالے کر دیا۔ انہیں میری کارستانی کا پتہ نہیں چلا اور انہوں نے اسے حفاظت سے رکھ دیا۔

جب اسکول ختم ہوتا تو میں گلی کوچوں کی زندگی کی طرح لوٹ جاتا۔ بہار جو آئی تو اس زندگی کا جادو اور بھی زوروں سے دل پر چل گیا۔ اب ہم پہلے سے زیادہ پیسے بناتے۔ اتوار کو ہمارا پورا قافلہ کھیتوں، میدانوں اور جنگلوں کی طرف نکل جاتا۔ جب ہم رات بھیگتے لوٹتے تو ہمارے بدن میں میٹھا میٹھا درد تیرتا رہتا اور ہم ایک دوسرے سے اور قریب ہو جاتے۔

مگر یہ زندگی زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکی۔ میرے سوتیلے باپ کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا اور وہ پھر کہیں چلا گیا۔ ماں اور میرے چھوٹے بھائی کو نانا کا آسرا لینا پڑا۔ نانی ایک مالدار سوداگر کے گھر رہنے چلی گئی تھیں۔ وہ سوداگر کے لئے ''یسوع مسیح کے تابوت، کے ایک غلاف پر کڑھائی جڑائی کا کام کر رہی تھیں۔ اس لئے مجھے بچے کی کھلائی کا فرض انجام دینا پڑا۔

میری خاموش اور بجھی ہوئی ماں کو شاید ہی کبھی قدم اٹھانے کی سکت ہوتی۔ میرے بھائی کے ٹخنوں میں ناسور ہو گئے تھے۔ وہ اتنا نڈھال ہو گیا تھا کہ اس میں رونے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ اسے بھوک لگتی تو بڑے دردناک انداز سے کراہتا۔ جب وہ بھوکا نہ ہوتا تو اونگھتا رہتا، ٹھنڈی سانس لیتا رہتا اور بلی کی طرح خرخرایا کرتا۔

''اسے اچھی غذا چاہئے۔ مگر میں تم سب کے لئے کہاں سے لاؤں کھانا؟'' ایک دن نانا نے بچے کو غور سے دیکھ دا کھ کر کہا۔

ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''مگر کون سا اسے منوں کھانا چاہئے!''

''اسے اتنا سا...اسے اتنا سا...ملا کر کتنا سارا ہو جاتا ہے۔ ایں؟''

نانا نے بیزاری سے ہاتھ جھٹک کر جواب دیا اور میری طرف مڑے۔

''نکولائی کو باہر دھوپ میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ دھوپ میں، ریت پر...''

میں ایک بورا بھر کر صاف اور سوکھی ریت لایا اور اسے کھڑکی کے نیچے دھوپ والی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر میں نے اپنے بھائی کو گردن تک ریت سے ڈھک دیا۔ نانا کا یہی حکم تھا۔ بھائی ریت میں دفن بیٹھا رہتا اور

پلکیں جھپکاتے ہوئے مجھے حیران کن آنکھوں سے دیکھتا۔معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نیلی پتلیوں کے سوا کچھ نہیں جو نیلگوں ہالے سے گھری ہوئی تھیں۔

مجھے اپنے بھائی سے بڑی محبت ہوگئی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے دل کی ساری باتیں سمجھتا ہے۔ میں گھنٹوں اس کے پہلو میں کھڑکی کے سائے میں بیٹھا رہتا۔کھڑکی سے نانا کی چیختی ہوئی آواز مستقل آتی رہتی:

''مرنا کون سا تیر مارنا ہوا۔اصل چیز تو یہ ہے کہ انسان کو جینے کا ڈھنگ آئے۔اب...''

عام طور پر اس کے بعد ماں پر کھانسی کا دورہ پڑتا جو دیر تک قابو میں نہ آتا۔

نکولائی اپنے بازوریت سے چھڑا لیتا اور پیلے سر کو ہلاتے ہوئے میری طرف بڑھا دیتا۔اس کے بال بڑے باریک اور روپہلے سے تھے۔اس کا چہرہ بڑے بوڑھوں جیسا تھا جس سے بڑی ہوشیاری ٹپکتی تھی۔

اگر بلی یا کوئی چوزہ پاس آتا تو نکولائی اس کو بڑے غور سے دیکھتا اور بڑی مدہم سے مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف مڑتا۔اس مسکراہٹ سے میرا دل دھک سے ہو جاتا۔کہیں میرا بھائی یہ تو نہیں بھانپ گیا کہ مین اس کے پاس بیٹھا بیٹھا کتنی کوفت اور اکتاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔کیا وہ جانتا ہے کہ میرا دل اسے چھوڑ کر بھاگ جانے اور گلی کوچوں میں اپنے یاروں سے ملنے کو مچل رہا ہے؟

احاطہ چھوٹا سا تھا اور ہر قسم کے کوڑے کباڑ سے بھرا ہوا۔ڈربوں وغیرہ کا سلسلہ جو پھاٹک سے شروع ہوتا تھا احاطے کے پچھواڑے میں حمام تک پھیلتا چلا گیا تھا۔چھتوں پر تختوں، کندوں، سیلی لکڑیوں اور کشتیوں کے ٹوٹے پھوٹے تختوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ یہ وہ مال غنیمت تھا جو بہار کے سیلاب میں دریائے اوکا سے نکالا گیا تھا۔پورا احاطہ دریا کا پانی پی کر پھولی ہوئی لکڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔جب گرم دھوپ چمکتی تو لکڑیوں کی بدبو سے سر پھٹنے لگتا۔

پڑوس ہی میں ایک چھوٹا سا مذبح تھا۔قریب قریب ہر صبح بچھڑوں کی ڈکار اور بھیڑوں کی ممیاہٹ سنائی دیتی۔خون کی تیز بو ہوا میں اس طرح بس جاتی کہ مجھے لگتا جیسے گرد آلود ہوا میں سرخ جال تھرتھرا رہا ہے۔

جب سینگوں کے بیچ کلہاڑی کے وار سے جانور ٹھنڈا کر دیا جاتا اور اس کی چیخ مٹ جاتی تو نکولائی

کے تیور پر بل پڑ جاتے اور اس کے ہونٹ مڑ جاتے جیسے وہ جانوروں کی آواز کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن اس کے منہ سے ''فو فو'' کے سوا اور کوئی آواز نہ نکلتی۔

دوپہر کے وقت نانا کا سر کھڑکی سے جھانکتا اور پکار سنائی دیتی:

''کھانا!''

وہ بچے کو گھٹنوں پر بٹھاتے، روٹی اور آلو خود چباتے پھر اس کا نوالہ بنا کر بچے کے چھوٹے سے منہ میں ٹھونستے۔ اس کا منہ اور نکیلی ٹھوڑی لت پت ہو جاتی۔ جب تھوڑا سا کھانا اس کے گلے سے اتر جاتا تو نانا اس کی قمیص اٹھاتے اور اس کا پھولا ہوا پیٹ دبا کر دیکھتے اور کہتے:

''جانے کافی ہوگا یا نہیں؟ کیوں تھوڑا سا اور؟''

''دیکھتے نہیں۔ وہ روٹی کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے!'' میری ماں اندھیرے کونے سے پڑی پڑی کہتیں۔

''بچہ خود کہہ نہیں سکتا کہ اس کا پیٹ بھر گیا ہے!''

لیکن وہ ایک نوالہ اور اس کے منہ میں ڈال دیتے۔ کھانے کا یہ طریقہ دیکھ کر میں زمین میں ڈال دیتے۔ کھانے کا یہ طریقہ دیکھ کر میں زمین میں گڑ جاتا۔ کوئی چیز میرے گلے میں چبھتی ہوئی گلا گھونٹتی ہوئی معلوم ہوتی۔

''اچھا'' آخر نانا کہتے۔ ''اب اسے ماں کے پاس لے جاؤ۔''

جب میں نکولائی کو بازوؤں میں لیتا تو وہ منمنا تا اور میز کی طرف ہاتھ بڑھاتا۔ ماں اتنی دبلی ہو گئی تھیں کہ بالکل چیڑ کا درخت معلوم ہوتیں جس کے پتے جھڑ گئے ہوں۔ وہ اٹھتیں اور میری طرف لمبے لمبے ہڈیاں باز و بڑھاتیں۔

وہ کبھی کبھار ہی کچھ بولتی تھیں۔ جو دو چار باتیں وہ بولتیں تو وہ بھی ان کے متلاطم سینے میں چیختی ہوئی معلوم ہوتیں۔ دن بھر وہ کونے میں چپ چاپ پڑی گھلتی رہتیں۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ مر رہی ہیں۔ میرے نانا نے یہ بات اور بھی صاف کر دی تھی۔ وہ بار بار پوری ہٹ دھرمی سے موت کا ذکر چھیڑ دیتے خاص طور پر شام کو جب ہوا بدبو اور سڑاند سے بوجھل ہو جاتی۔

نانا کا بستر کونے میں قریب قریب یسوع مسیح کی شبیہوں کے سائے میں تھا۔ ان کا سرہانا کھڑکی کی

طرف تھا۔سونے سے پہلے وہ بڑبڑاتے رہتے:

''خیر۔موت کی گھڑی آ گئی۔واہ ہم اپنے خالق کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں گے!ہم کہیں گے کیا؟ گویا میں زندگی بھر پلنگ ہی تو توڑتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کیا ہے۔اور دیکھ لو اس کا انجام!''

میں تندور اور کھڑکی کے درمیان فرش پر سوتا تھا۔ یہ جگہ میرے لئے بہت تنگ تھی اور مجھے ٹانگیں تندور کے نیچے پھیلانا پڑتی تھیں جہاں تل چٹے میرے پنجوں کو چاٹا کرتے۔لیکن یہاں لیٹے لیٹے جو کچھ میں دیکھتا اس سے دل کو کچھ تسکین ہو جاتی۔تکدر آمیز تسکین! کھانا پکانے کی کوشش میں نانا ہمیشہ کریدنی کے لمبے ڈنڈے سے کھڑکی کا شیشہ توڑتے رہتے۔تندور سے کھانے کے برتن تو وہ اسی ڈنڈے سے کھینچتے تھے نا۔ یہ بات بڑی عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی کہ نانا اتنے کائیاں ہیں مگر انہیں دوسرا سرا کاٹنے کی بات کیوں نہ سوجھی۔

ایک دن جب کوئی چیز تندور سے ابلنے لگی تو انہوں نے ڈنڈے کو اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ تندور میں رکھی ہوئی ہانڈی الٹ گئی اور کھڑکی کے دو شیشے بھی شہید ہو گئے۔ یہ اتنی بڑی پپتا تھی کہ بڑے میاں فرش پر ڈھیر ہو گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

''اے پروردگار،اے پروردگار'' وہ چلائے۔

جب وہ گھر سے باہر گئے تو میں نے چھری اٹھائی اور ڈنڈوں کا سرا کاٹ کر پھینک دیا۔

''لعنت ہو، پھٹکار ہو!'' نانا گھر لوٹے تو میری کارستانی دیکھ کر چیخے۔''آرے سے کاٹنا چاہئے تھا ابے سنا؟ آرے سے کاٹنا چاہئے تھا!لکڑی سے بیلن بنا لیتے،ان کو بیچ دیتے!خدا کی لعنت ہو،کیسا خاندان پایا ہے میں نے!''

''تو ہاتھ نہ لگایا کرے چیزوں کو تو اچھا ہو' جب نانا دوڑتے ہوئے زینے کی طرف گئے تو میری ماں نے کہا۔

ماں اگست میں اتوار کو دوپہر کے وقت چل بسیں۔میرا سوتیلا باپ اپنی سیاحی سے حال ہی میں لوٹا تھا۔ پھر اسے کام مل گیا تھا۔نانی اور نکولائی اس کے چھوٹے سے صاف ستھرے گھر میں آ بسے تھے۔ یہ گھر آسٹیشن سے ملا ہوا تھا۔اگلے دو تین ہفتے میں وہ لوگ میری ماں کو لے جانے والے تھے۔

جس دن ماں مریں انہوں نے صبح کو مجھ سے بڑی مدہم مگر صاف آواز میں کہا:

''جاؤ، ایوگینی واسیلیو چ سے کہو میں ان سے ملنا چاہتی ہوں!''

وہ دیوار کے سہارے بیٹھ گئیں۔

''جلدی، بھاگ کر جا...'' وہ پھر تکیے پر دھیر ہو گئیں۔ مجھے لگا جیسے وہ مسکرا رہی ہیں اور ان کی آنکھوں میں ایک نیا نور جھلملا رہا ہے۔ سوتیلا باپ گرجا گھر میں تھا۔ نانی نے مجھے یہودن کے ہاں نسوار لینے کو بھیجا۔ یہودن کے ہاں نسوار تیار نہ تھی۔ وہ تمباکو کوٹ کر نسوار بناتی رہی اور میں انتظار کرتا رہا۔

جب آخر کار میں نانا کے گھر لوٹا تو میں نے دیکھا کہ ماں میز کے کنارے صاف ستھرے بنفشئی لباس میں بیٹھی ہیں۔ ان کے بال میں بڑی احتیاط سے کنگھا کیا گیا تھا۔ ان کے چہرے سے وہی پہلے والا غرور ٹپک رہا تھا اور تیور چڑھے ہوئے تھے۔

''یہاں آ'' انہوں نے بپھری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہاں مارا پھر رہا تھا تو، ایں؟''

ابھی میں نے جواب بھی نہیں دیا تھا کہ انہوں نے میرے بال دبوچ لئے مڑنے والا لمبا چاقو میز سے اٹھایا اور دستے سے مجھے مارنا شروع کیا۔ آخر چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

''اٹھا چاقو! لا مجھے دے!''

میں نے چاقو اٹھایا اور میز پر رکھ دیا۔ ماں نے مجھے دھکا دیا اور میں تندور کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہاں سے میں ان کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

وہ کرسی سے اٹھیں اور آہستہ آہستہ کونے کی طرف چلیں، بستر پر لیٹیں اور منہ سے پسینہ پونچھنے لگیں۔ ان کا ہاتھ بے جان بے جان سا حرکت کر رہا تھا۔ ان کا ہاتھ دو بار بڑے نڈھال انداز سے تکیے پر گرا اور رومال انکی انگلیوں میں پھڑ پھڑاتا رہا۔

''پانی۔''

میں نے بالٹی سے ڈونگا بھر پانی نکالا۔ انہوں نے مشکل سے سر اٹھاتے ہوئے ایک گھونٹ پانی پیا، ٹھنڈے ہاتھ سے مجھے دور ہٹایا اور ٹھنڈی سانس لی۔ انہوں نے کونے میں رکھی ہوئی مقدس شبیہوں پر نگاہ ڈالی۔ پھر میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا جیسے مسکرا رہی ہوں۔ اور پھر ان کی لمبی لمبی پلکیں دھیرے دھیرے

ان کی آنکھوں پر گر گئیں۔ان کی کہنیاں پہلوؤں میں چھپی ہوئی تھیں۔ان کے ہاتھ سینے پر پھسلتے ہوئے گلے کی طرف بڑھے۔ان کے چہرے پر ایک سایہ چھایا پھر دور ہو گیا۔ان کی زرد جلد تن سی گئی اور ناک اور تیکھی ہو گئی۔ان کا منہ حیرانی سے کھلا لیکن سانس نہ آئی۔

کئی صدیاں گزر گئیں اور میں ہاتھ میں پانی کا ڈونگا لئے وہیں کھڑا رہا۔میں نے ماں کے چہرے کو سخت اور نیلا پڑے دیکھا۔

نانا اندر آئے۔

''ماں مر گئیں'' میں نے کہا۔

''کیوں واہی تباہی بک رہا ہے؟'' انہوں نے بستر پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

پھر وہ تندور کی طرف گئے اور ڈنڈے سے سموسے الٹنے اور پھیرنے لگے۔ڈنڈے اور توے کی ٹکر سے بڑی بھیانک جھنکار پیدا ہوئی۔میں ان کو دیکھتا رہا، اس احساس کے ساتھ دیکھتا رہا کہ ماں مر چکی ہیں۔اور میں اس وقت کا انتظار کرتا رہا جب انہیں بھی اس کا یقین آئے گا۔

سوتیلے باپ نے اندر قدم رکھا۔وہ کینوس کے کوٹ اور سفید ٹوپی میں تھا۔اس نے خاموشی سے کرسی لی اور اسے گھسیٹتے ہوئے ماں کے پلنگ کے پاس گیا۔یکا یک اس نے کرسی پٹک دی اور پیتل کے باجے کی طرح چیخا:

''مر گئی! ادیکھو!''

نانا کی آنکھیں نکل پڑیں اور ڈنڈے سمیت لڑکھڑاتے ہوئے ماں کے بستر پر جھک گئے۔

جب میری ماں کی قبر میں سوکھی ہوئی ریت بھری جا چکی تو نانی دوسری قبروں کے درمیان اندھے کی طرح بھٹکنے لگیں۔وہ ایک صلیب سے ٹکرا گئیں اور ان کا چہرہ زخمی ہو گیا۔یاز کا باپ ان کو اپنے گھر لے گیا۔نانی زخم دھو رہی تھیں اور یاز کا باپ میرے کانوں میں ڈھارس بندھائے کی باتیں کہہ رہا تھا۔

''پروردگار ہمیں بے خواب راتوں سے بچا! کیا ہوا ہے تجھے؟ ایسی باتوں کو دل میں نہیں رکھتے۔کیوں نانی؟ غریب ہوں یا امیر۔سب ہی ایک دن خاک میں ملتے ہیں۔کیوں نانی؟''

اس نے کھڑکی سے کچھ دیکھا اور یکا یک گھر سے باہر بھاگا۔لوٹا تو اس کے چہرہ دمک رہا تھا اور کبوتر اس سے چپکا ہوا تھا۔

''دیکھو' بڈھے نے ایک ٹوٹی ہوئی مہمیز دکھاتے ہوئے کہا۔''دیکھنا کیسی چیز ملی ہے! میں اور کبوتر تجھے تحفے میں دے رہے ہیں یہ۔ دیکھتے ہو کیا بڑھیا پہینہ ہے! ایں؟ یقین مانو یہ کسی کزاک کے جوتے سے ٹوٹ گرا ہوگا۔ میں کبوتر سے خریدنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا دو کوپک لے لو...''

''جھوٹ کیوں بک رہے ہو؟'' کبوتر بڑبڑایا اور یاز کا باپ میرے سامنے پھدکتا اور آنکھ مارتا رہا۔

''کبوتر بھی کیا بلا ہے، ایں؟ اس کے آگے کسی کی دال نہیں گلتی! خیر۔ میں نہیں۔ کبوتر دے رہا ہے یہ تحفہ تجھے...وہ...''

جب نانی منہ دھو چکیں تو آنہوں نے اپنے نیلے اور سوجے ہوئے چہرے پر رومال باندھا اور مجھ سے گھر چلنے کو کہا۔ میں نے انکار کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ وہاں کفن دفن کے بعد رسم کے مطابق شراب کا دور چلے گا اور شاید چیخم دھاڑ اور جھگڑے ہوں گے۔ ابھی ہم گرجا گھر ہی میں تھے کہ میں نے میخائل ماموں کو یاکوف سے کہتے سنا تھا:

''کیوں آج ڈٹ کر پلانی ہوگی نا، ایں؟''

کبوتر میرا جی خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ٹھوڑی پر مہمیز چڑھالی اور زبان سے اس کو چھونے کی کوشش کی۔ یاز کا باپ ضرورت سے زیادہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا اور چیخ رہا تھا:

''ذرا دیکھنا۔ کیا تماشا رچا رہا ہے لونڈا! ہاں ذرا دیکھنا!'' لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس سے میں بہل نہ سکا تو وہ گمبھیر ہو گیا۔''بس، بس! ہمت سے کام لو! ہر جاندار کو موت کا مزا چکھنا پڑتا ہے۔ چڑیاں بھی مرتی ہیں۔ سنو! اگر کہو تو میں تمہاری ماں کی قبر کے چاروں طرف گھاس لگا دوں۔ کیوں کیا کہتے ہو؟ چلو میدان میں چلیں اور گھاس جمع کریں۔ تم، میں اور کبوتر...اور میرا یاز بھی۔ مٹی سمیت گھاس اکھاڑیں گے اور قبر کے چاروں طرف بڑی خوبصورتی سے لگائیں گے۔ کوئی دوسری قبر اس کے مقابلے کی نہیں ہوگی!''

یہ بات میرے دل کو لگ گئی اور ہم میدان کی طرف چل دئے۔

میری ماں کے کفن دفن کے چند دن بعد میرے نانا نے مجھ سے کہا:

''ہاں الیکسئی، تو میرے گلے میں پڑا ہوا تمغہ تو ہے نہیں جو لئے لئے پھروں! اب تیرے لئے یہاں جگہ نہیں۔ تجھے تو کب کا دنیا میں قدم نکالنا چاہئے تھا...''

سو میں نے دنیا میں قدم نکالا اور زندگی کی شاہراہ پر چل پڑا۔

اس کتاب کو مارکسسٹس انٹرنیٹ آرکائیو کے لیے ابن حسن نے ترتیب دیا۔

کمپوزنگ: رضیہ سلطانہ

نظرثانی ترجمہ: ابن حسن

اپنی آرا اور تجاویز کے لیے درج ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

hasan@marxists.org